

بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
اگست 2012
سالگرہ نمبر

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں، غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)----- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا--- 6000 روپے

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

مستقل سلسلے

اگست 2012
جلد 26 شمارہ 12
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام ۲۰/بی ۶ پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رضیہ جمیل

پہلی بات

شعاع کا اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر لیے حاضر ہیں۔

27 واں سالگرہ نمبر۔

آپ کی پُرخلوص رفاقتوں اور محبتوں کے ساتھ ایک اور سال اختتام پذیر ہوا۔ شعاع ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔

ربِّ کریم کی مہربانی، اس کی عنایتیں اور نوازشیں ہیں کہ شعاع نے یہ طویل مسافت بڑی کامیابی سے طے کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے کا عمل جاری رہا اور آج اس کا شمار بہنوں کے پسندیدہ ترین پرچوں میں ہوتا ہے۔ شعاع کو بہترین مصنفین کا تعاون حاصل رہا۔ اس کے ذریعے بہت سے نئے نام بھی سامنے آئے۔ آج شعاع میں لکھنے والی مصنفین کا ایک بڑا حلقہ ہے۔ ہم اپنی مصنفین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ بلاشبہ شعاع کو اس مقام پر پہنچانے میں ان کا بھی بڑا حصہ ہے۔

محمود ریاض صاحب جنہوں نے شعاع کا اجراء کیا، آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔

محمود بابر فیصل، محمود خاور اور ہماری بہت سی مصنفین جو ہم سے بچھڑ گئی ہیں۔ ان کی یادیں ہمارے اور قارئین کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور آنے والے دور میں بھی جب تک ان کی تحریریں پڑھی جاتی رہیں گی، اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں، ان کو جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ ان کی خطاؤں سے درگزر کرے۔ آمین۔

اور

ہماری قارئین جو قدم قدم ہمارے ساتھ رہیں، ہماری حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔ شعاع کے سلسلے ان کی ذہانت اور صلاحیتوں کے شاہد ہیں۔ ہم قارئین کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس دعا کے ساتھ کہ یہ محبتیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- صوفیہ بشیر کا ہنستا مسکراتا مکمل ناول۔ اُداس چاند،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ جنت کے پتے،
- شہزادی عباس خلجی کا مکمل ناول۔ رنگ، خواب اور ریشم،
- فائزہ افتخار اور نازیہ جمال کے ناولٹ،
- نعیمہ ناز، مصباح خادم اور ابیہا مسکان سعید کے افسانے،
- عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے ناول،
- لمحے جب تصویر ہوتے ہیں۔ قارئین سے سروے،
- عمیر لغاری اور صدف لغاری کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- خط آپ کے اور دیگر سلسلے شامل ہیں۔

سالگرہ نمبر آپ کو کیسا لگا؛ ہمیں ضرور بتایئے گا۔ آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔



الٰہی سلسلہ ایسا زمیں تا آسماں کر دے
پڑھوں جب حمد تو ہر اک سخن اس کا اذاں کر دے

یہ کب خواہش ہے دل سے دور تو بے تابیاں کر دے
بس اپنی یاد میں گم کر کے مجھ کو بے نشاں کر دے

زبانِ حمد میں دل کھول کر تجھ سے کروں باتیں
مرے الفاظ و معنی کو عطا حسنِ بیاں کر دے

میں سوچوں بھی بجز تیرے کسی کے ذکر کا جس دم
مرے معبود تو مجھ کو اسی پل بے زباں کر دے

دلِ عابد کی ہر دھڑکن عبادت ہی کرے تری
خدایا تو مری اس آرزو کو جاوداں کر دے

عابد شاہ جہاں پوری



کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا
اس کی دولت ہے فقط نقشِ کفِ پا تیرا

لوگ کہتے ہیں کہ سایہ ترے پیکر کا نہ تھا
میں تو کہتا ہوں جہاں بھر پہ ہے سایہ تیرا

اب بھی ظلمات فروشوں کو گلہ ہے تجھ سے
رات باقی تھی کہ سورج نکل آیا تیرا

پورے قد سے جو کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

احمد ندیم قاسمی

پیارے نبی کی پیاری باتیں

ادارہ

صلوٰۃ تسبیح

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہا کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے عباس رضی اللہ عنہا! کیا میں تمہیں ایسی عبادت کے بارے میں بتاؤں کہ جس پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہارے اگلے اور پچھلے' نئے اور پرانے قصداً" اور سہواً" چھوٹے اور بڑے' چھپے اور ظاہر تمام گناہوں کو بخش دے گا۔ تم روزانہ چار رکعت نماز تسبیح پڑھا کرو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو جمعہ میں ایک بار (سات دنوں میں ایک بار) یہ بھی نہ کر سکتے ہو تو مہینے میں ایک دفعہ پڑھ لیا کرو۔ اگر یہ بھی نہ کر سکو تو سال میں ایک مرتبہ پڑھ لیا کرو اور اگر ایسا بھی نہ کر سکو تو پھر ساری عمر میں کم از کم ایک دفعہ یہ نماز پڑھ لو تو اللہ تعالیٰ تمہارے تمام گناہ معاف کردے گا۔"

آج کل کی بے پناہ مصروفیات میں نماز تسبیح کا روزانہ پڑھنا یقیناً "مشکل کام ہے حتیٰ کہ مہینے میں بھی ایک دفعہ اس کا اہتمام کرنے کا موقع شاید چند ہی خوش نصیب لوگوں کو ملتا ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تسبیح کی اتنی فضیلت بیان فرمائی ہے کہ اگر اسے سال میں ایک دفعہ بھی ادا کیا جائے تو اس کے بے پناہ اجر و ثواب سے مستفید ہوا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس بابرکت نماز کی ادائیگی کے لیے رمضان المبارک سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ہو سکتا۔ ذرا سی توجہ اور کوشش سے رمضان المبارک میں نماز جمعۃ المبارک سے قبل یا اس کے بعد چار رکعت نماز تسبیح با آسانی ادا کی جا سکتی ہے۔ اس طرح ماہ رمضان المبارک میں کم از کم چار دفعہ اس بابرکت اور بے پناہ اجر و ثواب کی حامل نماز کا اہتمام ممکن ہے۔

آپ چار رکعت نفل اس طرح ادا کریں کہ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد اور کوئی دوسری سورت پڑھیں۔ اس کے بعد قیام کی ہی حالت میں کلمہ تمجید پندرہ (15) بار پڑھیں "سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہٰ الا اللہ واللہ اکبر"۔

پھر رکوع میں جائیں۔ رکوع کی تسبیحات پڑھیں پھر ان ہی کلمات کو دس بار دہرائیں۔

پھر رکوع سے اٹھ جائیں اور سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد دس بار یہی کلمات پڑھیں۔

پھر سجدے میں جائیں (سجدے کی تسبیحات اور دعائیں) پڑھنے کے بعد یہی کلمات دس بار پڑھیں۔ پھر سجدہ سے سر اٹھا کر جلسہ میں اور (جلسے کی دعائیں پڑھنے کے بعد) یہی کلمات دس بار پڑھیں۔ پھر دوسرے سجدے میں چلے جائیں اور دس بار یہی کلمات دہرائیں (پہلے سجدے کی طرح) پھر سجدہ سے سر اٹھائیں اور جلسہ استراحت میں کچھ اور پڑھے بغیر دس بار اس تسبیح کو دہرائیں۔ یوں ایک رکعت میں 75 تسبیحات ہو جائیں گی اسی طرح چار رکعت پڑھی جائیں گی۔ تشہد میں تسبیحات التحیات سے پہلے پڑھیں۔

اعتکاف

اعتکاف کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ انسان چند دنوں کے لیے دنیا کی مشغولیات اور مصروفیات سے قطع تعلق کر کے مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار

کرتے ہوئے اس کا رنگ اپنے اوپر چڑھا لے۔

رمضان المبارک کے آخری دس دنوں میں مسجد میں معتکف ہونا مسنون عمل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری زندگی باقاعدگی سے اعتکاف میں بیٹھنے کا اہتمام فرماتے رہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ "جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ آتا تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کمر کس لیتے' راتوں کو جاگتے' اپنے گھر والوں کو جگاتے اور اتنی محنت کرتے جتنی کسی اور عشرے میں نہ کرتے۔" (بخاری و مسلم)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کے آخری عشرے کا اعتکاف فرماتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو وفات دی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات بھی اعتکاف کرتی رہیں۔" (بخاری و مسلم)

اعتکاف تزکیہ نفس اور تقویٰ اختیار کرنے کا بہترین نسخہ ہے۔ سال کے 365 دن انسان دنیا کے مسائل اور دیگر مصروفیات میں ڈوبا رہتا ہے۔ اگر ان 365 دنوں میں صرف دس دن اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور اپنے سال بھر کے گناہوں اور خطاؤں کی بخشش کے لیے وقف کر دیے جائیں تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں۔ اعتکاف کے دس دنوں کے لیے الگ سے ایک خصوصی ٹائم ٹیبل ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ جس میں چند گھنٹے آرام کے سوا زیادہ تر وقت تلاوت' مطالعہ قرآن پاک' مطالعہ حدیث' مطالعہ کتب' حفظ اور ذکر و اذکار اور دیگر عبادت الٰہی میں گزارا جا سکتا ہے۔

شب قدر

رمضان المبارک وہ مہینہ ہے جس میں ایک رات ایسی ہے جسے ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ "ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔" القدر ۹۷: ۱-۳ یہ مبارک رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ اس رات کی فضیلت کو پانے کے لیے رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں بھرپور عبادت پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہا فرماتے ہیں۔ ایک سال رمضان المبارک آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم لوگوں پر ایک مہینہ آیا ہے جس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ جو شخص اس رات سے محروم رہ گیا' وہ سارے کے سارے خیر سے محروم رہ گیا۔ اس رات کی خیر و برکت سے محروم وہی رہتا ہے جو واقعی محروم ہے۔" ابن ماجہ۔

چونکہ آخری عشرہ شروع ہونے تک روزہ داروں کی کافی تربیت ہو چکی ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت کو سونے سے کندن بنانے کے لیے رمضان المبارک کے آخری عشرے اور بالخصوص طاق راتوں میں لیلۃ القدر تلاش کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس حکم کا مقصد روزہ داروں کو زیادہ سے زیادہ عبادت الٰہی اور ذکر الٰہی کی ترغیب دینا ہے۔ چونکہ رمضان المبارک اپنی بھرپور رفعتوں کے ساتھ اختتام کی جانب بڑھ رہا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے قیام اللیل اور اعتکاف کے ذریعے تربیت دینا چاہتا ہے۔ انسان کی تعلیم و تربیت کے لیے آسان سے مشکل کا اصول ایک کارگر نسخہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں پر یک لخت کوئی بوجھ ڈالنے کے بجائے ان کی تعلیم و تربیت ماہ رمضان المبارک میں اسی اصول یعنی آسان سے مشکل کے تحت کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے دو عشروں کی نسبت آخری عشرے میں زیادہ ریاضت اور عبادت کی تاکید فرمائی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ و سلم سے دریافت کیا کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ شب قدر کون سی ہے تو میں اس میں کیا پڑھوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"تم یہ دعا پڑھو۔ اے اللہ! بے شک تو بہت معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے کو پسند کرتا ہے پس تو مجھے معاف فرمادے۔"

انسان سال کی ۳۶۵ راتیں سو کر گزارتا ہے۔ اگر ان ۳۶۵ راتوں میں ایک رات اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی خاطر عبادت میں جاگ کر گزاری جائے تو اس کے اجر و ثواب کا وعدہ ہزار راتوں کے برابر کیا گیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اس سے بھی بڑھ کر اجر و ثواب دیتا ہے۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

نماز' روزہ اور حج کا تعلق زیادہ تر بدن سے ہے۔ لیکن زکوٰۃ اور صدقات کا براہ راست تعلق مال و دولت سے ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے۔

"اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو آپ صلی اللہ علیہ و سلم انہیں ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنا دیجیے جو کہ اس روز واقع ہو گی کہ ان کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھر ان سے ان لوگوں کی پیشانیوں کو اور ان کی کروٹوں اور پشتوں کو داغ دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا یہ ہے وہ مال جس کو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا۔ سو اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو۔" التوبہ ۹: ۳۴-۳۵

اسی طرح ایک اور آیت میں اللہ تعال فرماتا ہے۔

"تم ہر گز نیکی حاصل نہ کر سکو گے جب تک وہ مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرو جو تمہیں بہت عزیز ہے۔" ال عمران ۳: ۹۲

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ "حضور صلی اللہ علیہ و سلم سارے انسانوں میں سب سے زیادہ فیاض اور سخی تھے لیکن جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ و سلم کی سخاوت اور فیاضی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ آپ صلی اللہ علیہ و سلم فیاضی میں بارش لانے والی ہوا کی مانند ہو جایا کرتے تھے۔" بخاری

راہ خدا میں صدقہ و خیرات سے جہاں مال کی پاکیزگی کا فریضہ ادا ہوتا ہے وہاں اس سے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور نعمتیں بارش کی مانند خرچ کرنے والوں پر برستی ہیں بلکہ اس سے معاشرے میں موجود طبقاتی تقسیم اور عدم مساوات کی خلیج کو بھی پاٹنے کا موقع ملتا ہے۔ غریبوں اور ناداروں کی مشکلات میں کمی لانے اور ان کی مالی اعانت کے لیے اللہ تعالیٰ نے معاشرے کے صاحب ثروت اور مال دار افراد پر ان کے مال و دولت کی پاکیزگی کی خاطر سال میں ایک دفعہ زکوٰۃ کی ادائیگی کو فرض قرار دیا ہے۔

زکوٰۃ کے لغوی معنی پاکیزگی کے ہیں۔ جبکہ شریعت کی رو سے زکوٰۃ مال کے اس حصے کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں بتائے ہوئے طریقے یعنی نصاب کے مطابق معاشرے کے صاحب ثروت افراد معاشرے کے غریب' نادار' مساکین اور ضرورت مند افراد میں تقسیم کرتے ہیں۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے ماہ رمضان المبارک بہترین مہینہ ہے۔ ایک تو یہ ماہ مبارک میں کسی بھی فرض اور نفل عبادت کا اجر اللہ تعالیٰ کئی گنا بڑھا کر دیتا ہے اور دوم چونکہ معاشرے کے صاحب ثروت اور مال دار افراد تو اپنی مال داری اور ثروت کی وجہ سے افطاری میں انواع و اقسام کی نعمتوں سے مستفید ہوتے ہیں لیکن معاشرے کے غریب اور مفلوک الحال افراد جو روزے کی شدت کے باوجود اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے دن بھر محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان کو کھانے پینے اور پہننے کی وہ سہولیات نصیب نہیں ہوتیں جو کسی بھی انسان کا بنیادی حق ہیں۔ اس لیے اگر اس ماہ مبارک میں مال

دار اور صاحب ثروت افراد معاشرے کے محروم افراد کے دکھوں کا احساس کرتے ہوئے اپنی زکوٰۃ اور صدقات پوری ایمانداری کے ساتھ ادا کریں تو اس سے معاشرے میں غریب اور بے سہارا افراد کے دکھوں اور غربت کو بانٹنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

رمضان المبارک میں خرچ کرنے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ و سلم ارشاد فرماتے ہیں۔

"جو شخص اس مہینے میں کسی روزہ دار کو افطار کرائے تو اس کے لیے گناہوں سے مغفرت اور دوزخ کی آگ سے رہائی ہے۔ اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا روزہ دار کو اور اس سے روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی واقع نہیں ہو گی۔

صحابہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ و سلم ہم میں سے سب کے پاس اتنا سامان تو نہیں ہوتا کہ روزہ دار کو افطار کرائیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس کو بھی عطا کرتا ہے جو ایک گھونٹ دودھ' ایک کھجور یا پانی کے ایک گھونٹ سے کسی روزہ دار کو افطار کرائے گا۔" بیہقی

اس حدیث شریف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کوئی صاحب حیثیت نہیں ہے اور اس کے پاس کسی کو دینے کے لیے یا کسی کو افطار کرانے کے لیے کچھ زیادہ نہیں ہے تو ایک گھونٹ پانی یا ایک گھونٹ دودھ اور یا ایک کھجور سے بھی کسی مسلمان بھائی کو افطاری کرا کے گناہوں کی مغفرت اور جہنم کی آگ سے بچنے کا اہتمام کر سکتا ہے۔

اسلام صدقات و خیرات کی بھی بھرپور حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک میں ایک ایک دانہ اور ایک ایک پیسہ صدقہ و خیرات کرنے پر کم از کم سات سو گنا اجر کا وعدہ فرمایا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ جس کو وہ چاہیں گے اس سے بھی زیادہ عطا کریں گے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے علاوہ اس ماہ مبارک میں کوشش کرنی چاہیے کہ روزانہ کچھ نہ کچھ مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا جاتا رہے جس سے مال و دولت میں برکت پیدا ہو گی۔ اس عمل سے جہاں صدقہ و خیرات کرنے والوں میں شکر گزاری اور ایثار و قربانی کا جذبہ فروغ پائے گا وہاں اس عمل سے غریب اور بے کس انسانوں کی امداد کی راہ بھی ہموار ہو گی۔

تقویٰ کے حصول کے لیے جہاں بدنی عبادت کی بہت زیادہ تاکید بیان کی گئی ہے وہاں مالی عبادت یعنی صدقہ و خیرات اور زکوٰۃ کی بروقت مستحقین کو ادائیگی بھی لازمی شرط ہے۔ اسلام حب مال اور دولت کو سینت سینت کر جمع کرنے کی ویسے بھی مخالفت کرتا ہے اس لیے اس مبارک مہینے کے توسط سے زیادہ سے زیادہ مال و دولت اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا خصوصی اہتمام کرنا اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا باعث بن سکتا ہے۔ زکوٰۃ تقسیم کرتے وقت اس بات کا خصوصی خیال رکھنا چاہیے کہ اس میں کسی غریب اور مستحق زکوٰۃ کی عزت نفس مجروح نہ ہو بلکہ انتہائی عاجزی اور خاموشی سے کسی کو بتائے بغیر مستحق لوگوں کی مدد کرنی چاہیے۔ حضور صلی اللہ علیہ و سلم کا ارشاد ہے۔

"صدقہ و خیرات اس طرح کرنا چاہیے کہ اگر یہ

دائیں ہاتھ سے دیا جائے تو بائیں ہاتھ تک کو اس کی خبر نہ ہو۔"

یعنی بڑی رازداری اور خاموشی سے بغیر کوئی احسان جتائے اپنے ضرورت مند مسلمان بھائی کی مدد کرنی چاہیے۔ اسلام میں احسان جتانے کو برا فعل قرار دیا گیا ہے۔

فطرانہ

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے۔ "صدقہ فطر کو اس لیے واجب کیا گیا ہے تاکہ روزوں میں روزہ دار سے جو فضول اور بے حیائی کی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں ان کا کفارہ بنے۔ مساکین و غریبوں کے لیے کھانے پینے کا انتظام ہو جائے۔ جو اسے نماز عید الفطر سے پہلے ادا کرے تو فطرانہ قبول ہوتا ہے۔ اور جو اسے نماز عید کے بعد ادا کرے تو یہ بھی دوسرے صدقات کی طرح کا ایک صدقہ ہوگا۔" ابوداؤد۔

جیسا کہ اس حدیث مبارک میں فطرانے کا بنیادی مقصد روزے کی حالت میں سرزد ہونے والی خطاؤں کا کفارہ ادا کرنا ہے یعنی اگر رمضان المبارک میں روزہ دار سے بھول چوک اور بشری کمزوریوں کے باعث ایسی خطائیں سرزد ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے روزے کی قبولیت اور اس کے اجر و ثواب میں کمی کا امکان ہو تو اس کمی کے ازالے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر یا فطرانے کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔

فطرانہ کی ادائیگی میں غیر ضروری تاخیر سے اجتناب کیجیے۔ کوشش ہونی چاہیے کہ فطرانہ عید الفطر سے قبل ادا کر دیا جائے بلکہ عید الفطر سے بھی اگر دو چار دن پہلے اپنے حصے کا فطرانہ مستحق افراد میں تقسیم کر دیا جائے تو اس طرح معاشرے کے ضرورت مند اور مستحق افراد کو بھی عید الفطر کی خوشیوں میں شریک ہونے کا موقع مل سکے گا۔ مستحقین کو فطرانے کی بروقت ادائیگی سے مستحقین بھی اپنے بال بچوں کے لیے کھانے پینے کی اشیاء کپڑے اور بعض دیگر ضروریات زندگی کی خریداری عید سے قبل ہی کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ جتنا فطرانہ ایک شخص پر واجب ہے اس کی عدم ادائیگی یا ادائیگی میں ٹال مٹول اور تساہل تو سخت گناہ ہے۔ لہٰذا عدم ادائیگی کا تو تصور ہی محال ہے البتہ اگر کسی کی استطاعت ہو تو واجب لادا فطرانے سے زائد مال بھی معاشرے کے غریب اور مستحق افراد میں تقسیم کر سکتا ہے۔ واجب فطرانے سے زائد صدقہ و خیرات کی ادائیگی سے مال و دولت میں برکت پیدا ہوگی اور اس اخلاص سے اللہ تعالیٰ کی رضا بھی حاصل ہوگی۔

اسلامی اخوت و محبت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ جو انسان عید الفطر کے موقع پر اپنے اہل و عیال اور دیگر عزیز رشتہ داروں کی خوشی کی خاطر خوراک، لباس اور دیگر ضروریات زندگی کے ڈھیر لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتا اسے چاہیے کہ اپنے معاشرے کے محروم اور غریب و نادار افراد کو بھی اپنی خوشیوں میں یاد رکھے۔ فطرانے کے واجب ہونے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ معاشرے کے صاحب ثروت افراد کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ جہاں وہ عید الفطر کی خوشیاں اپنے لیے سمیٹنے میں مصروف ہوں وہاں اپنے اردگرد رہائش پذیر ایسے مسلمانوں کو بھی یاد رکھیں جو اپنی غربت اور لاچاری کی وجہ سے اپنے آپ اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ نے بیواؤں، یتامی، غرباء اور مساکین کی معاشی مجبوریوں کا ازالہ کر کے اسلامی معاشرے کو معاشی عدم مساوات کے بھنور میں گرنے سے بچانے کے لیے زکوٰۃ، صدقات اور فطرانے جیسے احکامات نازل کر کے دین اسلام کو رہتی دنیا تک پوری انسانیت کے لیے معاشی لحاظ سے ایک بہترین نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔



بندھن

عُمیر لغاری ہمراہ صدف عُمیر

شاہین رشید

شوبز کی دنیا بہت پرکشش ہے۔ کسی گھر کا کوئی فرد اس فیلڈ میں آجائے تو پھر گھر کے دیگر افراد کا بھی دل چاہتا ہے کہ وہ بھی اسی فیلڈ میں آجائیں اور ایسا ہوتا بھی ہے۔ آج کل آپ کو زیادہ تر وہی لوگ نظر آرہے ہوں گے، جن کے اہل خانہ اس فیلڈ سے وابستہ ہیں۔ میرے خیال سے نام گنوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیگر لوگوں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہوں گی، لیکن اگر اس فیلڈ سے میاں، بیوی وابستہ ہوں تو شاید پھر گھر میں زیادہ سکون ہوتا ہوگا۔ کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھتے ہیں، چنانچہ لڑائی جھگڑے بھی کم ہوتے ہوں گے۔ لیکن جس جوڑے کا انٹرویو آپ پڑھ رہے ہیں وہ ہمیشہ سے ہی ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ عمیر لغاری اس فیلڈ سے وابستہ ہوئے تو صدف عمیر نے گھر اور بچے سنبھالے۔

اور جب بچے سمجھ دار ہو گئے تو صدف نے بھی اس فیلڈ میں آنے کا ارادہ کیا۔ اب وہ بھی عمیر کی طرح اس فیلڈ میں کامیابیاں حاصل کر رہی ہیں۔

صدف عمیر کا تعلق افغانستان سے ہے۔ لیکن چونکہ پاکستان میں پیدائش ہوئی۔ اس لیے یہ پاکستانی کہلاتی ہیں، صدف 3 اگست کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہیں۔ تعلیمی قابلیت گریجویشن ہے۔

عمیر لغاری کا تعلق ڈیرہ غازی خان سے ہے اور یہ سرائیکی بلوچ کہلاتے ہیں۔ ان کی فیملی بہاولپور میں قیام پذیر ہے۔ عمیر 1980ء میں کراچی آئے اور تب سے یہیں مقیم ہیں۔ عمیر لغاری 26 نومبر کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کی ایک بڑی بہن اور ایک چھوٹا بھائی ہے۔ عمیر لغاری نے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز ڈگری حاصل کی ہے۔

صدف عمیر

"کیسی ہو.... کچھ عرصہ قبل ایک نجی چینل میں تمہاری اور تمہارے شوہر کی شادی دیکھی.... خیریت تو تھی؟"

(ہنستے ہوئے)۔ "آپا! آپ کو معلوم تو ہے کہ مارننگ شو میں شادیاں چلتی رہتی ہیں.... تو بس ہماری بھی ہو گئی۔"

"تجدید نکاح ہوا؟"

"نہیں! صرف "تجدید وفا" سے ہی کام چل گیا تھا۔" (قہقہہ)

"اب تو تم بھی اس فیلڈ کا حصہ بن گئی ہو۔ ڈرامہ سیریل "خدا اور محبت" میں تمہاری پرفارمنس بہت اچھی تھی اور اب تمہیں "خوشبو کا گھر" میں بھی دیکھ رہے ہیں۔ اچھا کام کر رہی ہو۔"

"بہت شکریہ.... میں جب اس فیلڈ میں نہیں تھی تو اس کی بہت سی برائیاں سنا کرتی تھی تو کبھی کبھی اس بات سے خوف زدہ ہو جایا کرتی تھی کہ عمیر اس فیلڈ میں ہیں۔ کہیں کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ مگر اب ایسا کوئی خوف نہیں ہے۔ کیونکہ سچی بات ہے کہ مجھے کوئی ایسی بڑی برائی نظر نہیں آئی.... چھوٹی موٹی برائیاں تو ہر جگہ ہوتی ہیں۔"



"گویا میاں صاحب پہ اعتماد نہیں تھا؟"

"ارے نہیں! ایسی بات نہیں... اعتماد تو سو فیصد تھا۔ لیکن اس فیلڈ کے بارے میں باتیں بہت سنی ہوئی تھیں۔ خیر! اب تو میں بھی ان کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوں۔ اس لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ ایک دنیا اس فیلڈ میں کام کر رہی ہے۔ سب خراب نہیں ہوتے۔"

"کچھ بندھن کی بات ہوجائے۔ عمیر سے کیسے ملاپ ہوا؟"

"میری دوست کی سالگرہ کی تقریب تھی۔ میں اپنی دوست کے گھر اپنے والدین کے ساتھ گئی تھی۔ وہاں عمیر بھی آئے ہوئے تھے۔ جس طرح دیگر مہمان آئے ہوئے تھے۔ اس وقت میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ یہ مجھے بہت گہری نظروں سے بار بار دیکھے جارہے تھے۔ میں جھینپ کے ادھر ادھر ہوجاتی۔ تھوڑی دیر بعد دیکھتی تو یہ پھر میرے آس پاس ہی نظر آجاتے... تب میں نے اپنی امی سے شکایت کی۔"

"پھر... پھر کیا ہوا؟"

"پھر ہوا یہ کہ انہوں نے کہیں سے میرا نمبر لے لیا اور سچ بتاؤں! یہ بات آج تک راز ہے کہ انہوں نے میرا نمبر کہاں سے لیا تھا۔"

"شاید اس لیے کہ مزید دوسرا نمبر لینے میں آسانی ہو؟"

(قہقہہ...) "نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ اب تو اتنے سال ہوگئے ہیں شادی کو... اب سب کچھ سیٹ ہے اور ان شاء اللہ ہمیشہ سیٹ رہے گا۔"

"ان شاء اللہ... میں تو مذاق کر رہی تھی... خیر! پھر کیا ہوا؟"

"پھر ہوا یہ کہ انہوں نے میرا نمبر حاصل کیا اور مجھے فون کرنے شروع کردیے اور اس دن کا بھی ذکر کیا جب انہوں نے مجھے دیکھا تھا۔ جب تواتر کے ساتھ ان کی کالیں آنے لگیں تو پھر میں نے گھر والوں سے ذکر کیا کہ اس لڑکے کا دماغ خراب ہوگیا ہے، روز مجھے فون کرتا ہے اور پھر ایسے مواقع پر گھر والوں کی جو ہدایات ہوتی ہیں کہ بات مت کرو۔ فون مت اٹینڈ کرو وغیرہ وغیرہ مجھے بھی سننے کو ملیں مگر یہ اتنے فون کرتے تھے کہ کبھی کبھی اٹھانا ہی پڑتا تھا۔"

"کچھ انسیت بھی ہوگئی ہوگی؟"

"ارے نہیں... ایک دن جب انہوں نے مجھے پروپوز کیا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ اگر آپ سنجیدہ ہیں تو پھر میرے والد سے آکر مل لیں۔ آپ یقین کریں گی کہ اگلے پندرہ منٹ میں یہ ہمارے گھر کے

اندر تھے۔"

"تمہاری تو ہوائیاں اڑ گئی ہوں گی؟"

"بالکل جی... یہ آئے اور ڈائریکٹ میرے ابا سے کہا کہ میں آپ کی بیٹی کو پسند کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں... ابا حیران پریشان، مگر پھر بڑے تحمل سے بولے۔ "بیٹا! یہ کوئی مناسب طریقہ نہیں ہے۔ آپ اپنے والدین کو لے کر آئیے۔" پھر چند دن کے بعد ان کے امی ابو باقاعدہ رشتہ لے کر آئے... اور تھوڑی سی جانچ پڑتال کے بعد رشتہ قبول کرلیا گیا... اور یوں ہماری شادی ہوگئی۔"

"شادی کے بعد اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ شادی کے بعد کچھ مسائل ہوئے یا سب کچھ اچھا اچھا ہوگیا؟"

"الحمد للہ سب کچھ اچھا اچھا ہوگیا۔ میرے سسرال والے بہت اچھے ہیں۔ آج تک بہت محبت کرتے ہیں۔ جب ہماری بات پکی ہوگئی تھی تو ان کے گھر آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ اس طرح سسرال کے ماحول کا بھی اندازہ ہوگیا تھا۔"

"جوائنٹ فیملی ضروری ہے؟"

"جی! بہت ضروری ہے۔ شروع کے سالوں میں تو ضرور ہی جوائنٹ فیملی میں رہنا چاہیے۔ اس طرح پیار محبت بڑھتا ہے اور ویسے بھی رشتے داریاں ضرور ہونی چاہئیں۔ جیسے چچا، ماموں، تایا، پھوپھیاں وغیرہ۔ بچوں کو ان رشتوں سے پیار ملتا ہے اور ان کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔"

"بچوں کو پھوپھی اور چچا تو مل گئے، ماموں نہیں ملے؟"

(ہنستے ہوئے)۔ "جی... میں اکلوتی ہوں نا اس لیے... میں ہی بچوں کی ماموں بھی ہوں اور خالہ بھی... ویسے میرے بچوں کو ان رشتوں کا احساس ہے۔ کیونکہ میرے کزن، میرے بھائی اور میری کزن میری بہنیں ہیں۔"

"گڈ... شادی سے پہلے سسرال میں آنا جانا بھی تھا۔ عمیر سے بھی بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ پھر رخصتی کے وقت اور نکاح کے وقت رونا تو نہیں آیا ہوگا؟"

"جی جی... مجھے کوئی ٹینشن نہیں تھی کہ پتا نہیں سسرال کیسا ہوگا...؟ پتا نہیں ان کا ماحول کیسا ہوگا... تھوڑی ٹینشن تھی تو بس میکا چھوڑنے کی تھی کہ جن کے ساتھ اتنے سال گزارے، انہیں چھوڑنے کا غم تھا... تو رخصتی کے وقت دل بہت رویا۔ آنکھوں سے بھی آنسو آئے۔ یہ ایک قدرتی فیلنگز ہوتی ہیں۔"

"عمیر کے بارے میں کچھ بتاؤ؟"

"عمیر میں بہت سی اچھائیاں ہیں۔ مگر ایک سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ انہیں اہم موقعوں کی تاریخیں یاد نہیں رہتیں۔ انہیں یاد دلانی پڑتی ہیں۔ ویسے تھوڑے غصے کے بھی تیز ہیں۔ لیکن غصہ جلدی آتا ہے تو جلدی اتر بھی جاتا ہے۔ صفائی پسند بہت زیادہ ہیں۔ گھر کو گندا تو دیکھ ہی نہیں سکتے۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا؟"

"منہ دکھائی میں سونے کا بریسلیٹ ملا تھا جو کہ بہت خوب صورت تھا۔ ہم نے روایتی قسم کا ہنی مون بھی نہیں منایا تھا۔ ویسے ہم دونوں اتنے خوش تھے کہ ہماری شادی ہی ہمارے لیے ہنی مون تھی۔"

عمیر لغاری

"جی عمیر! کیسے ہیں... آج کل تو ماشاء اللہ آپ دونوں اسکرین پہ خوب نظر آرہے ہیں... بہت اچھے بھی لگ رہے ہیں۔"

"بہت شکریہ۔"

"اب سوچتے ہیں کہ بیگم کو بہت پہلے اس فیلڈ میں آجانا چاہیے تھا؟"

"نہیں... ایسا نہیں سوچتا... کیونکہ میرے خیال میں صحیح وقت یہی ہے۔ اگر یہ پہلے آجاتیں تو بچے اور گھر دونوں نظر انداز ہوتے اور یہ بات مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے کہ گھر نظر انداز ہو۔"

"ابھی بچے اتنے بڑے بھی نہیں ہوئے۔ شادی کو آٹھ سال ہی تو ہوئے ہیں۔"

"جی بالکل.... لیکن اب بچے اسکول جانے لگے ہیں اور صدف کا ٹائم اس طرح سیٹ ہوتا ہے کہ گھر کی دیکھ بھال بھی ہو جائے اور ان کا شوق بھی پورا ہو جائے۔ صدف خود بھی اس بات کو سمجھتی ہے کہ فیلڈ زیادہ ضروری ہے یا گھر۔ اس لیے وہ اپنے شوق کے لیے ایک آدھ ہی پروجیکٹ لیتی ہے۔"

"آپ نے ایک محفل میں صدف کو دیکھا اور بقول صدف کے کہ بہانے بہانے سے دیکھا.... کیا بات بہت اچھی لگی تھی پہلی بار میں؟"

"دراصل میں پہلی بار میں مجھے صدف کی آنکھوں نے بہت متاثر کیا تھا اور اس وجہ سے میں ان کی طرف راغب ہوا تھا۔"

"خوبیاں' خامیاں تو بعد میں نظر آئی ہوں گی؟"

"دراصل میں شادی سے پہلے کی لڑکی اور شادی کے بعد کی لڑکی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ نکاح کے بعد لڑکی' بیوی بن جاتی ہے اور بیوی کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ بیویاں کیسی ہوتی ہیں۔" (قہقہہ۔)

"شادی کو زیادہ عرصہ ہو جائے تو محبت میں کمی آجاتی ہے یا اضافہ ہو جاتا ہے؟"

"میرے خیال میں تو اضافہ ہو جاتا ہے' اگر زندگی انڈر اسٹینڈنگ کے ساتھ گزر رہی ہو اور اللہ کا شکر ہے کہ ہماری زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔ اس لیے محبت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔"

"لڑائیاں ہوتی ہیں؟"

"دنیا کا کون سا ایسا رشتہ ہے کہ جس میں لڑائیاں نہیں ہوتیں اور میاں' بیوی کے درمیان لڑائیاں نہ ہوں یہ کبھی ممکن ہی نہیں ہے.... تو یہ کام ہم بھی کرتے ہیں' مگر ذرا آرام سے۔ سنگین نوعیت کی لڑائیاں نہیں ہوتیں۔ ہلکی پھلکی نوک جھونک ہو جاتی ہے۔"

"صدف کو زیادہ غصہ آتا ہے یا آپ کو؟"

"صدف ماشاءاللہ سے اگست کی پیدائش ہے اور اگست والوں کا غصہ سب کو معلوم ہے کہ بہت تیز ہوتا ہے تو غصہ مجھ میں بھی ہے اور صدف میں بھی.... جب تک جوائنٹ فیملی میں رہے' لڑائی کے بعد صلح گھر والے کرا دیتے تھے' مگر اب خود ہی صلح کرنی پڑتی ہے اور صلح میں پہل بھی میں ہی کرتا ہوں۔ ویسے صدف میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ یہ نہ صرف ایک اچھی بیوی' اچھی ماں' بلکہ اچھی بہو بھی ہے۔ میرے گھر والے تو صدف سے بہت خوش ہیں اور مجھے اپنی پسند پر ناز ہے۔"

"پیسہ بچاتے ہیں یا خرچ کی طرف رجحان ہے؟"

"مجھے تو پیسہ بچانے کی عادت نہیں ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ دل کھول کر خرچ کروں۔ مگر صدف نہیں کرنے دیتی.... ویسے میں سمجھتا ہوں کہ یہ اچھی عادت ہے۔ پیسے کی قدر اس وقت ہوتی ہے' جب وہ ہاتھ میں نہیں ہوتا اور آج کل تو جیسے حالات ہیں' ان میں بچت کرنا بہت ضروری ہے۔"

"کھانا گھر میں پکتا ہے یا بازار سے آتا ہے؟"

"ارے نہیں.... کھانا بازار سے کیوں آئے گا؟ کھانا گھر میں ہی پکتا ہے اور صدف ماشاءاللہ بہت اچھا کھانا پکاتی ہے.... ہاں! جب یہ بیاہ کر آئی تھی تو ظاہر ہے کہ اپنی پڑھائی کی وجہ سے اتنی ماہر نہیں تھی۔ مگر اب سب کچھ بہت اچھا پکا لیتی ہے۔"

"آپ کو صدف کی اداکاری کیسی لگتی ہے؟"

"اچھی.... اچھا پرفارم کر لیتی ہے اور آہستہ آہستہ اور بھی بہتر ہوتی جائے گی۔ نئے ہونے کے حساب سے تو بہت اچھا پرفارم کر رہی ہے۔"

"صدف کو آپ سے ایک شکایت ہے.... آپ کو بھی کوئی شکایت ہے اس سے؟"

"صدف کو جو شکایت ہے وہ بالکل درست ہے۔ پتا نہیں کیوں میں ہر اہم تاریخ بھول جاتا ہوں۔ ایسے میں اس کا غصہ حق بجانب ہے۔ اس معاملے میں بہت لاپروا ہوں اور مجھے صدف سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ میری بہت اچھی شریک سفر ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید



اسماء توحید

"کیسی ہیں اسماء؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"ریڈیو چھوڑا.... پرستار مس تو کرتے ہوں گے؟"

"جی بہت زیادہ.... لیکن چونکہ کچھ اور مصروفیات ہو گئی تھیں تو چھوڑنا پڑا اور کچھ پتا بھی نہیں کہ دوبارہ جوائن کر لو۔"

"آپ کے پرستاروں میں کن لوگوں کی تعداد زیادہ ہے؟"

"ہر طرح کے' ہر عمر کے لوگوں نے میرا پروگرام سنا۔ کیونکہ میں نے ہر عمر کے لوگوں کے لیے پروگرام پیش کیے۔ "صبح کا ہم سفر" ایک پروگرام تھا جو کہ اسکول کے بچے اور ٹین ایجرز بڑے شوق سے سنتے تھے۔ اسی طرح ایک پروگرام "سدا بہار" کے نام سے کرتی تھی۔ جس کو بڑی عمر کے لوگ بہت شوق سے سنتے تھے کیونکہ اس میں پرانے گانے سنوایا کرتی تھی۔ میں ایک دن پروگرام نہیں کرتی تھی تو لوگ بے چین ہو جاتے تھے کہ اسماء کہاں چلی گئی۔"

"اچھی آوازوں کو کوئی نہ کوئی خطاب بھی ملتا ہے۔ آپ کو کوئی خطاب ملا؟"

"ہاں.... کیوں نہیں۔ میرے ایک سننے والے نے مجھے "رومانٹک وائس" کا خطاب دیا اور سچ تو یہ ہے کہ محبت کا عنصر میری زندگی میں ہمیشہ سے رہا ہے۔ خواہ یہ محبت میرے اللہ سے ہو' میرے ماں' باپ سے ہو یا میرے وطن سے ہو۔ مجھے اپنے ملک پاکستان سے بہت محبت ہے۔"

"سیاست اور کھیلوں سے لگاؤ ہے آپ کو؟"

"کھیلوں سے لگاؤ صرف دیکھنے کی حد تک ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں' میں ٹیبل ٹینس اور بیڈمنٹن کھیلا کرتی تھی۔ دیکھنے کی حد تک مجھے کرکٹ پسند ہے۔ خاص طور پر اس وقت بہت شوق سے دیکھتی ہوں جب پاکستان اور انڈیا کا میچ ہو رہا ہوتا ہے۔ اس وقت تو میں تمام کام چھوڑ دیتی ہوں۔"

"دیگر ٹیموں کے ساتھ مزا نہیں آتا کیا؟"

"آتا ہے.... مگر بال ٹو بال نہیں دیکھتی' بلکہ اس وقت دیکھتی ہوں جب پاکستان جیت رہا ہوتا ہے۔ اس معاملے میں' میں بہت جذباتی ہو جاتی ہوں.... اور جہاں تک سیاست کی بات ہے تو سچی بات ہے کہ مجھے سیاست سے کچھ خاص لگاؤ نہیں ہے۔"

"پھر بھی ملک کے لیے کچھ تو سوچتی ہوں گی؟"

"ہاں کیوں نہیں.... میرا بھی دل چاہتا ہے کہ ہمارا ملک ترقی کرے۔ ہم ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہوجائیں۔"

"سب سے زیادہ کام آپ نے ایف ایم 107 میں کیا۔ ایف ایم 101 چھوڑنے کی کیا وجہ تھی؟"

"جب میں ایف ایم 101 میں تھی تو دیگر چینلز کی طرح 107 ایف ایم بھی لاؤنچ ہو رہا تھا اور یہ بہت بڑا گروپ تھا اور سچ بات تو یہ ہے کہ ایف ایم 101 میں کچھ اندرونی سیاستیں تھیں اور جب مجھے ایف ایم 107 کی مینجمنٹ نے خود کال کرکے کہا کہ آپ ہمارے ہاں کام کریں تو پھر میں نے 101 کو چھوڑ دیا۔"

"کیا اپنی سی وی دی تھی یا وہ جانتے تھے آپ کو؟"

"ہوتا تو یہی ہے کہ لوگ اپنی سی وی دیتے ہیں، لیکن میں اس معاملے میں بہت لکی ہوں کہ مجھے کہیں اپنی سی وی نہیں دینی پڑی۔ بلکہ لوگوں نے مجھ سے خود رابطہ کیا۔ تو جب 107 سے آفر آئی تو میں اس طرف آگئی۔ کیونکہ ہر انسان آگے کی طرف جانے کا سوچتا ہے اور سوچنا بھی چاہیے.... جس دن ایف ایم 101 کا آخری شو کیا اس سے اگلے ہی دن میں نے ایف ایم 107 جوائن کرکے شو بھی کرلیا۔"

"اتنا کام کرتی ہیں اور بحیثیت انسان آپ کو بھی نجی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا.... تو سب کو کیسے فیس کرتی ہیں؟"

"سب کچھ فیس کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے.... آپ خود ورکنگ لیڈی ہیں اور آپ کو پتا ہوگا کہ لوگوں کا رویہ کیسا ہوتا ہے۔ خاص طور پر اگر کوئی جونیئر میل کا رویہ خراب ہو تو اس وقت بڑی عجیب سچویشن ہوجاتی ہے۔ اس صورت حال میں اپنے آپ کو بڑا ٹھنڈا رکھنا پڑتا ہے اور سب کچھ سہنا پڑتا ہے.... اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میرا لائیو شو ہوتا ہے اور کوئی وی آئی پی شخصیت آرہی ہوتی ہے تو ٹریفک بلاک ہوجاتا ہے۔ اس وقت بڑی کوفت ہوتی ہے۔ غصہ، جھنجلاہٹ ہوتی ہے کہ کس طرح اسٹوڈیو پہنچوں گی اور کس طرح پروگرام کروں گی۔ کبھی بارش ہوجائے تو پرابلم ہوجاتا ہے۔

عیدین پہ بھی ہماری ڈیوٹی ہوتی ہے اور ہمیں جانا پڑتا ہے۔ جب حالات اختیار سے باہر ہوجاتے ہیں اور کچھ سمجھ میں نہ آئے تو نہ صرف غصہ آتا ہے، بلکہ میں رونے بھی لگتی ہوں۔"

"رونا عورت کا ہتھیار ہے یا کمزوری؟"

"میں بہت مضبوط لڑکی ہوں اور لوگ کہتے بھی ہیں کہ آپ بہت مضبوط اور کامیاب ہیں اپنی لائف میں.... لیکن کیا کرے انسان، جہاں بے بسی ہو وہاں رونا تو آتا ہی ہے۔"

"یہ تو ہے.... اسماء! ان شاء اللہ آپ سے پھر بات ہوگی۔"

امبر ارشد

"امبر! کیسی ہو؟"

"الحمد اللہ بالکل ٹھیک ٹھاک۔"

"تم نے شوبز جوائن کیا، پھر گیپ دیا، اب پھر اس فیلڈ میں آگئی ہو.... اب گیپ دینے کا ارادہ تو نہیں؟"

"نہیں اب ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ گیپ اس لیے دیا کہ پڑھائی مکمل کرنی تھی، پھر شادی ہوگئی.... اب ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس لیے اب کوشش تو یہی ہوگی کہ گیپ نہ دوں۔"

"اپنی عمر سے بڑے کردار کیوں کرتی ہو؟"

"کیا کروں رول ہی ایسے ملتے ہیں.... شاید بڑی لگتی ہوں۔ (قہقہہ) لیکن کوئی بات نہیں۔ لوگ تو پسند کرتے ہیں۔"

"غصہ نہیں آتا جب ایسے رول ملتے ہیں؟"

"نہیں بالکل نہیں.... میں اپنی مرضی سے لیتی ہوں۔ مجھے پرفارمنس دکھائی دیتی ہے تو رول قبول کرتی ہوں۔ ہاں ویسے اگر آپ غصے کی بات کریں تو مجھ میں غصہ بہت ہے اور میں دعا کرتی ہوں کہ میرا غصہ ختم ہوجائے۔ کبھی کبھی خود ہی اپنے غصے سے پریشان ہوجاتی ہوں۔ مجھ میں صبر کی بھی بہت کمی ہے ہر کام کی جلدی ہوتی ہے۔"

"سیاست سے لگاؤ ہے؟"

"بالکل ہے.... اور سب کو ہونا چاہیے اور میں دیکھ رہی ہوں کہ ملک میں بہت اچھا چینج آرہا ہے اور میری دعا ہے کہ اب الیکشن ہوں تو نئی قیادت آئے۔"

"آپ ٹی وی سے وابستہ ہیں۔ اتنے ڈراموں میں کام کیا۔ کبھی مارننگ شو میں نظر نہیں آئیں؟"

"ایک آدھ میں تو گئی ہوں مگر زیادہ آنا مجھے خود بھی پسند نہیں ہے۔"

"ٹی وی میں کچھ زیادہ ہی گلیمر نہیں آتا جارہا.... تمہارا کیا خیال ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ.... ڈراموں میں تو چلو، ضرورت ہوتی ہے مگر آپ اپنے مارننگ شو دیکھیں۔ اتنا فیشن ہوتا ہے اور کوئی کام کی ایک بات بھی نہیں ہوتی۔ ایک زمانے میں مستنصر حسین تارڑ مارننگ شو کیا کرتے تھے۔ کتنا اچھا وہ بولتے تھے اور کتنے کام کی باتیں ہوتی تھیں۔ ہی ہی ہاہا، کپڑے، فیشن یہ سب کچھ ہمارے مانگ شو میں ہوتا ہے اور شادی بیاہ کے موضوعات پر جو مارننگ شو ہوتے ہیں، اس میں ہمارا کلچر نہیں دکھایا جاتا.... ڈانس، ہلا گلا، بغیر دوپٹے کے آنا، مکس گیدرنگ، یہ سب ہمارے کلچر کا حصہ نہیں ہے۔ مارننگ شوز ساری دنیا میں دیکھے جاتے ہیں۔ کم سے کم اس پروگرام کے ذریعے تو اپنی ثقافت کو پروموٹ کریں۔ آپ نجی محفل میں جو مرضی کریں، مگر ٹی وی اسکرین پہ آپ کو اپنی ثقافت کو ہی پروموٹ کرنا چاہیے۔"

"شوبز کیسا پروفیشن ہے؟"

"بہت اچھا بھی اور بہت برا بھی۔ برا اس لحاظ سے کہ منافقت بہت ہے اس فیلڈ میں.... اور اچھا میں اس لیے کہوں گی کہ اگر آپ اچھے ہیں تو سب کچھ اچھا ہے اور آپ برے ہیں تو سب کچھ برا ہے۔"

"تمہارے ڈراموں میں "خوشبو کا گھر" تو بہت ہی اچھا ہے۔ ابھی کتنی قسطیں باقی ہیں؟ اور "روگ" میں بھی اگرچہ تمہارا مختصر کردار تھا، مگر بہترین تھا۔"

"روگ سیریل کی بات بتاؤں کہ جب بابر جاوید نے مجھے یہ کردار دیا تو میں نے کہا کہ میں نے کبھی ایسا کردار نہیں کیا۔ میں نے بہت سافٹ قسم کے رول کیے ہی اور میرا چہرہ بھی ایسا ہے کہ نیگیٹو رول میں کوئی قبول نہیں کرے گا۔ انہوں نے کہا کہ تم دیکھو تو سہی کہ تمہارا کردار کتنا مقبول ہوتا ہے اور ایسا ہی ہوا یہ سیریل اتنا پاپولر ہوا کہ لوگ آج تک نہیں بھولے۔"

"اس رول کی مقبولیت کے بعد دل چاہا کہ نیگیٹو رول کروں؟"

"اب تو یہ صورت حال ہے کہ جو نیگیٹو رول کررہا ہوتا ہے لوگ اسی کو پسند کررہے ہوتے ہیں مگر میں یہ کہوں گی کہ کردار خواہ نیگیٹو ہو یا پوزیٹو وہ اتنا پاور فل ہو کہ لوگ اس کو پسند کریں اور "خوشبو کا گھر" تو پچھلے سال جون میں ختم ہوگیا تھا مگر لوگوں نے اس کو اتنا پسند کیا کہ اس کی قسطیں بڑھانی پڑیں اور آپ دیکھ ہی رہی ہوں گی کہ کہانی اب مزید جان دار ہوگئی ہے۔ تقریباً دو سو اقساط ہوجائیں گی۔"

"اور کون سے سیریلز انڈر پروڈکشن ہیں؟"





”کافی سارے ہیں.... کچھ ختم ہوگئے ہیں‘ کچھ کی ریکارڈنگز چل رہی ہیں.... کافی کام ہو رہا ہے۔“

نمرہ بچہ

”ہیلو نمرہ.... کیسی ہیں؟“

”شکر ہے اللہ کا.... سوری جی آپ کو کئی مرتبہ فون کرنا پڑا۔“

”کوئی مسئلہ نہیں.... آپ بتائیں کہ آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟ لگ رہا ہے کہ آپ بہت مصروف رہتی ہیں۔“

”ہاں! مصروفیات تو ہیں لیکن ساری مصروفیات شوبز کی نہیں ہیں۔ ان سے ہٹ کر بھی کچھ مصروفیات ہیں۔ آج کل ایک اسٹیج پلے کی تیاری ہے۔ ڈاکٹر انور سجاد کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ڈرامہ پی ٹی وی پہ آچکا ہے ”کوئل“ کے نام سے‘ بہت زمانہ پہلے۔ اس کا اسٹیج ورژن ہو رہا ہے تو اس کی تیاری ہے اور اس میں عظمیٰ گیلانی نے جو رول کیا تھا‘ وہ میں کر رہی ہوں تو بس آج کل اسی کی ریہرسل چل رہی ہیں۔“

”اور ٹی وی کے لیے بھی مصروفیات ہوں گی۔“

”جی بالکل.... ابھی کچھ دن ہی پہلے ٹیلی فلمز مکمل کروائی ہیں‘ کچھ کی ریکارڈنگز چل رہی ہیں.... اور ایک بڑا زبردست سیریل ہے جو کہ آمنہ مفتی نے لکھا ہے اور اس کا نام ”سبز پری‘ لال کبوتر“ ہے۔ اس کی ریکارڈنگز فروری میں شروع ہوئی ہیں‘ دیکھیں کہ کب مکمل ہوتی ہیں۔“

”بہت اچھی پرفارمر ہیں آپ۔ ڈرامہ سیریل ”دام“ آپ کا بہت اچھا تھا۔ پھر ”سانس“ میں ایک مختلف رول اور ”اک نظر میری طرف“ میں بھی بہت الگ سا رول ہے آپ کا۔“

”بس یہ آپ سب کی محبت ہے کہ میں اسکرین پہ ہوں.... ورنہ سچی بات یہ ہے کہ آج کل کی خواتین کی طرح میں تیز نہیں ہوں.... بہت سی باتیں تو میں نے اپنے بیٹے سے سیکھی ہیں۔“

”اچھا گڈ.... کیا نام ہے بیٹے کا اور کتنے بچے ہیں آپ کے؟“

”میرے بیٹے کا نام ”چانن“ ہے اور ایک ہی بیٹا ہے۔ اب بیٹی کی خواہش ہے۔ میرا بیٹا ماشاء اللہ تیرہ سال کا ہے۔“

”اتنی مصروفیات کے بعد جب فارغ وقت ملتا ہے تو انجوائے کرتی ہیں۔“

”ہاں جی‘ کیوں نہیں۔ مگر میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ فارغ رہنا مجھے پسند نہیں ہے۔ ذرا زیادہ فارغ ہو جاؤں تو ڈپریشن سا ہونے لگتا ہے کہ میں فارغ کیوں ہوں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کام سے ہی لگائے رکھے تو اچھا ہے۔“

”آپ فارغ وقت میں اچھے اچھے کھانے پکالیا کریں؟“

ہنستے ہوئے۔ ”یہ بھی آپ نے خوب مزے کی بات کی۔ اب آپ میری بات سن کر ضرور حیران بھی ہوں گی اور ہنسیں گی بھی.... میں کھانا پکانے سے بہت ڈرتی ہوں۔ مجھے باقاعدہ ڈر لگتا ہے کہ اگر میں کچن میں جاؤں گی تو مجھ سے کوئی کام ٹھیک طرح سے نہیں

ہو گا.... اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میری امی بہت اچھا کھانا پکاتی تھیں تو انہوں نے ہم بیٹیوں کو کچن میں آنے ہی نہیں دیا یہ کہہ کر کہ تم کچن گندا کرو گی اور یہ کہ تمہارے پڑھنے کے دن ہیں‘ تم سب اپنی پڑھائی پہ توجہ دو اور چونکہ میں گھر میں بڑی تھی تو سب سے زیادہ مجھ پر ہی زور ہوتا تھا پڑھائی کا۔ تو بس ایک خوف سا دل میں بیٹھ گیا کہ میں کچھ پکاؤں گی تو اچھا نہیں پکے گا۔“

”تو پھر کیا کک رکھا ہوا ہے؟“

”ایسا نہیں ہے کہ میں بالکل نہیں پکاتی۔ پکاتی ہوں مگر ڈر‘ ڈر کر۔ جب مجھے چار‘ پانچ لوگوں کی دعوت کرنی ہوتی ہے تو خود ہی پکاتی ہوں۔ لیکن مجھے یہ خوف رہتا ہے کہ شاید چیزیں اچھی نہیں پکیں گی اور جب دعوت کے اینڈ پہ کچھ کھانا بچ جائے تو مجھے یہی وہم ہوتا ہے کہ شاید انہیں کھانا پسند نہیں آیا ہو گا۔“

”آپ کے میاں صاحب کیا کرتے ہیں اور کیا نام ہے ان کا۔“

”میرے میاں صاحب کا نام محمد حنیف ہے اور وہ رائٹر بھی ہیں اور صحافی بھی ہیں اور بی بی سی میں کام کرتے ہیں۔“

”اب تک کیے گئے ڈراموں میں کون سے ڈرامے آپ کے پسندیدہ ہیں۔“

”ڈرامہ سیریل ”دام“ مجھے بہت پسند ہے۔ اس کا فیڈ بیک میری سوچ سے بھی زیادہ اچھا تھا اور مجھے خود بھی مزا آیا تھا اور ”اک نظر میری طرف“ بھی مجھے بہت پسند ہے۔ اس کے کردار کو رائٹر نے بہت تفصیل سے لکھا تھا اور جتنا اچھا یہ کردار تھا اتنا ہم کر نہیں پائے ہیں۔ مگر پھر بھی اسے لوگوں نے بہت پسند کیا اور اب جو نیا سیریل آئے گا ”سبز پری‘ لال کبوتر“ یہ بھی میرے یادگار ڈراموں میں سے ایک ہو گا اور آپ نے مجھے اس کا فیڈ بیک ضرور ہی دینا ہے۔“

”ان شاء اللہ ضرور اور پھر تفصیلی انٹرویو بھی کریں گے۔“

”ضرور.... ضرور....“

✡

ہم نے جلا کے خونِ دل و رشتۂ حیات
رخ پر ہوائے تند کے روشن کیے چراغ

زندگی کے بے شمار دنوں میں ایک دن ہمارے لیے بہت خاص ہوتا ہے۔ اس دن سے ہماری کوئی خوب صورت یادوابستہ ہوتی ہے۔ گزرتے سالوں میں جب جب یہ دن آتا ہے۔ ذہن کے افق پر یادوں کے چراغ سے جھلملاتے ہیں۔ سال میں ایک بار آنے والا یہ دن ملا جلا سا ایک احساس دل میں جگاتا ہے۔

کچھ کھونے کی چبھن' کچھ پانے کی طمانیت ، آنے والے وقت کے خواب' آرزو اور جستجو۔

ذاتی حوالے سے جنم دن ہر انسان کے لیے کچھ نہ کچھ اہمیت کا حامل ضرور ہوتا ہے۔

سالگرہ نمبر کا پہلا سوال ہم نے قارئین سے ان کی ذات کے حوالے سے کیا ہے۔

ایک تخلیق کار کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ وہ تخیل میں زندگی کی جو تصویر بناتے ہیں' اس میں دکھ سکھ' امید و یاس' غم اور خوشی کے سارے ہی رنگ شامل ہوتے ہیں۔ یہ سب رنگ جب الفاظ کے روپ میں ڈھلتے ہیں تو ان میں زندگی دھڑکنے لگتی ہے۔ لفظوں کے نئے نئے معنی سامنے آتے ہیں۔ عام سا کوئی واقعہ اپنے پس منظر سے اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ ایک عام نظر جو کچھ نہیں دیکھ سکتی' تخلیق کار اسے کھوج نکالتا ہے۔

یہ کہانی کار کا کمال ہوتا ہے کہ وہ کہانی لکھتے ہوئے بہت سی آفاقی سچائیاں اس طرح بیان کر جاتا ہے کہ وہ قاری کے دل میں جاگزیں ہو جاتی ہیں۔

ہماری مصنفین کی تحریریں بامقصد ہوتی ہیں' ان کی تحریریں ان کی فطری دانش' مثبت سوچ اور سلجھے ہوئے ذہن کی عکاس ہیں۔ سروے کا دوسرا سوال اسی حوالے سے ہے۔ سوالات یہ ہیں۔

(1) آپ سالگرہ کس طرح مناتی ہیں؟ عمر کا ایک سال رخصت ہونے پر آپ کے احساسات کیا ہوتے ہیں۔ سالگرہ پر ملنے والا کوئی تحفہ یا خوب صورت جملہ یا مبارک باد جو آپ کو اچھی لگی۔

(2) شعاع میں شائع ہونے والی تحریروں میں کچھ جملے اتنے حقیقت افروز اور خوب صورت ہوتے ہیں کہ دل کو چھو لیتے ہیں۔ ایسے دل میں گھر کرنے والے جملے انتخاب کر کے لکھیں۔

(3) شعاع کب سے پڑھنا شروع کیا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں کیا تبدیلی محسوس کی۔

آیئے دیکھتے ہیں' ہماری قارئین نے ان سوالوں کے کیا جوابات دیے ہیں۔

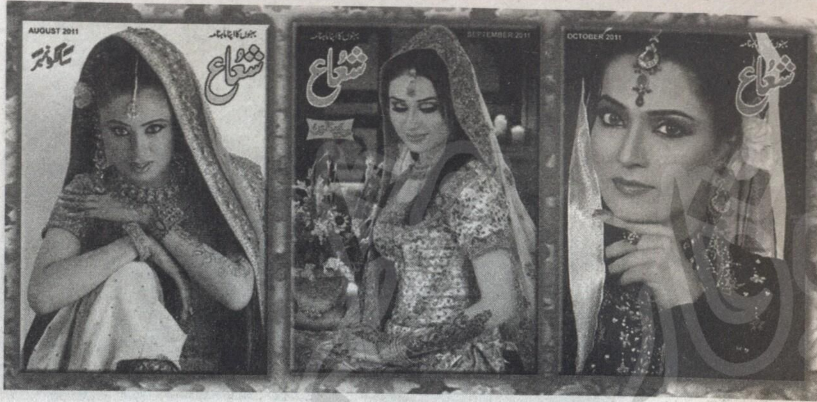
لمحے جب تصویر ہوتے ہیں

امت الصبور

شمع مسکان ..... جام پور

شعاع میں اور مجھ میں ایک چیز مشترک ہے کہ شعاع بھی اگست میں معرض وجود میں آیا اور میں بھی اگست میں ہی دنیا کی رونق بڑھانے جلوہ افروز ہوئی۔

ہمارے ہاں سالگرہ منانے کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن میں نے جب سے ہوش سنبھالا تو سادگی کے ساتھ اپنی پیدائش کے دن کو خوب مناتی ہوں۔ پہلے اسکول میں فرینڈز سرپرائز کے طور پر میری سالگرہ



سیلبریٹ کرتیں' کبھی میں گھر پر ہی کزنز' فرینڈز کو انوائیٹ کر کے تھوڑا بہت شغل کرتی تھی۔ اب تو خواب ہوئے وہ دن۔

1 پتا نہیں کیوں؟ مگر یہ دن جب بھی آتا ہے' اپنے سنگ بہت سی اداسی' بے چینی' اضطراب' پریشانی سمیٹ لاتا ہے۔

ابھی چند سال پہلے کی بات ہے کہ میری سالگرہ کے روز آپی' بھابھی وغیرہ سب نے مجھے وش کیا۔ گفٹ دیے' تو نغمہ باجی کہنے لگیں کہ شمع! آپ کاشی سے کیا لیں گی۔ (کاشی میرا ڈیڑھ سال کا بہت کیوٹ سا بھانجا تھا۔) میں نے کہا کہ کاشی بس تھوڑا سا مسکرا دے تو میرے لیے یہی کافی ہے۔ یقین کریں میرا اتنا کہنا تھا کہ اس نے اتنے خوب صورت انداز میں اسمائل پاس کی کہ اس گفٹ کی طرح مجھے نہ پہلے اور نہ بعد میں کوئی گفٹ نہ لگا۔

2 جی! شعاع میں ایک ناول شائع ہوا تھا کنیز نبوی کا۔ "گلیاں پریم نگر دیاں" اس کے چند جملے جو مجھے بے حد پسند ہیں۔

"محبت کو تقسیم نہ کرو' ضرب دو' تقسیم سے بٹتی ہے' ضرب سے بڑھ جاتی ہے' پتا ہے سرمد! تمہاری محبت میں' میں یوں ڈوبی ہوں کہ محبت کو تقسیم نہیں' ضرب دینا آگیا ہے۔ میری محبت بٹے گی نہیں' بڑھ کر دو سروں میں پہنچے گی۔"

"میں نے جانا عشق من کا سفر ہے۔ روح کا راستہ ہے۔ ازلوں سے بنا وہ راستہ جس پر انسان ہزار رکاوٹوں کے باوجود بھی چلتا رہتا ہے۔ لیکن اس قیمتی جذبے کو سنبھال کر رکھنا چاہیے' معبود حقیقی کے لیے۔ بندے کا عشق تو صرف خواری ہی دیتا ہے' رسوائی' بدنامی ذلت۔"

"ماروی کی سوچ۔

محبت کرنے والوں کے لیے ان کا محبوب ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ پیر بھی' مرشد بھی' درگاہ بھی' خانقاہ بھی' دم بھی' دعا بھی' مرض بھی' مسیحا بھی' ریاضت بھی' چلہ بھی' عطا بھی' دوا بھی' متاع بھی' سب کچھ وہ ہوتا ہے۔"

اور بہت ساری اسٹوریز کے بہت سے جملے اچھے لگے ہیں۔ اب اتنا ہی کافی ہے۔

3 شعاع اپنے نام کی طرح خوب صورت اور منفرد ہے۔ شعاع کا آغاز 7th کلاس سے ہوا۔ کبھی کبھی کے مطالعے کے اتنے گہرے اثرات مرتب ہوئے اور اب تو شعاع شریانوں میں لہو بن کر دوڑتا ہے۔

نوال افضل گھمن ..... گجرات

1 میں ہر سال جب سے ہوش سنبھالا ہے' اپنی سالگرہ 15 جنوری کو خصوصی تیاری' اہتمام اور شان دار طریقہ سے سیلبریٹ کرتی ہوں۔ اپنی خاص بیسٹ



فرینڈ عارفہ معین لاہور، ناہید مزمل ہزاروی، آزاد کشمیر کو خاص طور پر دعوت دیتی ہوں۔ سالگرہ پر تحفہ پیاری دوست ناہید مزمل کی طرف سے ملنے والا 2010ء کی 15 جنوری کو (گلاب کا گلدستہ) جس میں پورے 100 سرخ گلاب تھے۔ جو پورے دو ماہ میں نے بڑی کیئر کے ساتھ اپنے روم میں رکھے۔ 2011ء میں 15 جنوری کو وصول ہونے والا لیپ ٹاپ جو شریف برادران عزت ماب جناب چوہدری وزیر اعلیٰ پنجاب میاں محمد شہباز شریف صاحب سے وصول پایا۔ خوشی کا عالم لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی اور پھر جنوری 2012ء میں اپنی بڑی بہن بشریٰ گھمن کی طرف سے ملنے والا بلیک بیری فون... آہ جب گفٹ کھولا تو مائی گاڈ خوشی کی لہر میری ریڑھ کی ہڈی تک سرائیت کر گئی۔

احساسات۔ اک سال اپنی عمر رواں کم ہو جانے کا زیاں ضرور ہوتا ہے بس خوشی اور ملال کے ملے جلے سے تاثرات ہوتے ہیں۔ خوب صورت جملہ یا مبارک باد۔

14 جنوری کی رات ہر سال ناہید مزمل عزیز از جان دوست کا ٹھیک رات 12 بجے فون کر کے وش کرنا۔ اوئے میری برتھ ڈے گرل لو یو۔ ہیپی برتھ ڈے... ہمیشہ سے ہانٹ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ناہید مزمل کو سدا خوش رکھے۔ (آمین)

2 شعاع میں شائع ہونے والی تحریروں میں سے پسندیدہ جملے جو دل کو چھوتے ہیں، دل میں سما جاتے ہیں اور دماغ میں چوکڑی مار کر ڈھیٹ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ آہم ارے بابا کتنے ہی اقتباسات پسندیدہ ہیں۔ خیر موسٹ فیورٹ لکھ رہی ہوں۔

"اللہ سے انسان محبت کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اللہ بھی اس سے محبت کرے۔ مگر محبت کے لیے وہ کچھ دینے کو تیار نہیں۔ اللہ کے نام پر وہی چیز دوسروں کو دیتا ہے جسے وہ اچھی طرح استعمال کر چکا ہو۔ چاہے وہ لباس ہو یا جوتا، وہ خیرات کرنے والے کے دل سے اتری ہوئی چیز ہوتی ہے اور اس چیز کے بدلے وہ اللہ کے دل میں اترنا چاہتا ہے۔"

(عمیرہ احمد... شہزادت)

"جب کسی سے محبت کی جاتی ہے تو دل میں ایک قبرستان بھی بنایا جاتا ہے۔ اس میں اپنے محبوب کی تمام خامیاں دفن کر دی جاتی ہیں اور پھر ان کے کتبے نہیں لگائے جاتے۔"

(بیلی راجپوتاں کی ملکہ... نمرہ احمد)

"میں بہت اکیلی ہوں۔ میرے پاس ابھی کوئی نہیں، سوائے آپ کے میرے پاس بجانے کے لیے کوئی گھنٹی نہیں ہے۔ کھٹکھٹانے کے لیے کوئی دروازہ نہیں۔ ہلانے کے لیے کوئی زنجیر نہیں ہے۔ پہلی امید بھی



آپ ہیں اور آخری بھی آپ ہیں۔ اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو کوئی بھی میری مدد نہیں کرے گا۔ اگر آپ نے چھین لیا تو کوئی دے نہ سکے گا اور اگر آپ دے دیں تو کوئی روک نہ سکے گا۔"

(نمرہ احمد... جنت کے پتے)

"جس کے دل میں عشق مقیم ہو جائے اس دل میں ہمیشہ درد کا دھواں بھرا رہتا ہے۔ جو پوری جان کو سلگائے رکھتا ہے۔ وہ بھٹی اس کو جلا کر نیست و نابود نہیں کرتی، بلکہ اس کو پکا کر مضبوط کر دیتی ہے۔ پھر وہ ٹھنڈا میٹھا چشمہ بن جاتا ہے۔ جس سے ہر پیاسا اپنی پیاس بجھاتا ہے۔"

(آتش عشق... کنیز نبوی)

"کون کہتا ہے محبت ہجر ہے۔ نارسائی ہے۔ دکھ ہے اور آنسو ہے۔ غلط بالکل غلط، اس نے خود سے کہا تھا۔ محبت کرنے والوں کو ہمیشہ ہی پل صراط کا سفر طے نہیں کرنا پڑتا۔ کبھی کبھی سب کچھ من چاہا بھی تو ہو جایا کرتا ہے جیسے میرے ساتھ ہوا۔"

(نگہت سیما... یاروفا سے اقتباس)

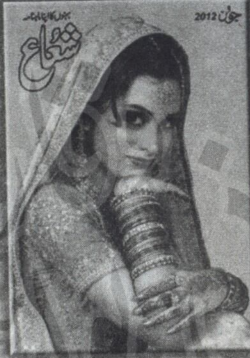
باقی بشریٰ سعید صاحبہ کا "سفال گر" مائی گاڈ عنیزہ جی کا "شب گزیدہ"، دل، من مسافر من، کا لفظ لفظ ازبر ہے۔ "شب آرزو کا عالم، رفعت سراج جی، وہ اک بات روگی سچے موتی جیسے لوگ، خواب پھر خواب ہیں۔ رخ چوہدری جی، محبت جی کے دیکھو دل کا دروازہ، کسے دا یار نہ وچھڑے، ساحلوں کے گیت، خواب لمحوں کی عید"، اور ہارٹ فیورٹ رخسانہ نگار عدنان جی... اگر مجھ سے محبت سے ہے۔ ٹوٹا ہوا تارا، میرے چارہ گر، اقرار کا موسم، کوزہ گر، کوئی دیپک ہو، زندگی اک روشنی کے سب ہی کردار...

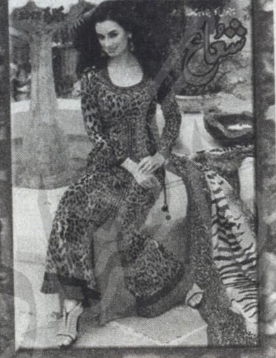
3 شعاع جون 2000ء سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ بہت اچھی طرح سے یاد ہے، کراچی سے ہی خریدا تھا۔ پٹیل پاڑہ کے علاقے سے۔ پھر آج تک رفاقت قائم ہے۔ تبدیلی تو فطری چیز ہے۔ بس ایک بات معذرت کے ساتھ کہوں گی کہ بارہ سال کی دوستی میں ایک ہلکا سا شکوہ تو کر سکتی ہوں نا، کہ خواتین اور شعاع، کرن وغیرہ ہمارے خالص اور پیور نسوانی ماہنامے ہیں۔ پلیز، پلیز رائٹرز سے التماس ہے کہ تمام ناولز اور کہانیوں میں گھریلو اور معاشرتی ماحول ہی رہنے دیں۔ برائے کرم ان ڈائجسٹوں کو جاسوسی، سسپنس اور عمران سیریز والے ٹچ اور ذائقے سے بچائیں... رب کریم شعاع سے جڑے ہوئے ہر انسان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

سلمیٰ مسرت... راولپنڈی

1980ء سے میں آپ کے تمام ڈائجسٹ کی ریگولر خاموش قاری ہوں۔ یہ وہ رسالہ ہے جس کے







پہلے شمارے سے آج تک میں نے کوئی شمارہ مس نہیں کیا۔ ایک ایک لفظ پڑھتی ہوں۔

اپنا تھوڑا سا تعارف کروادوں' کراچی کالج سے انٹر کیا۔ منورہ میں نیوی کے بنگلوں میں ساحل سمندر کے کنارے بارہ سال رہے۔ وہیں شعاع کا پہلا شمارہ جس پر نازیہ زوہیب کا ٹائٹل تھا۔ میں نے خریدا۔ اس وقت میں نہم کلاس کی طالبہ تھی۔

انٹر کے فوراً" بعد شادی ہوگئی اور میں مستقل طور پر راولپنڈی خیابان سرسید آگئی۔ یہاں ایک کمرے سے اپنا گھر بنانے کا آغاز کرکے زندگی شروع کی۔ آج الحمدللہ تین منزلہ اپنا گھر ہے۔

شعاع کے آغاز کے دو سال بعد 87ء اگست میں میری شادی ہوئی۔ شعاع سے ایک لمحے کے لیے بھی ساتھ نہ چھوٹا۔ بلکہ زندگی کے مختلف حادثات اور موڑ پر ان تحریروں نے میرا حوصلہ بڑھایا۔

بے شمار لڑکیوں کو ان سے متعارف کروایا اور الحمدللہ ان بچیوں کی ماؤں نے کہا کہ ہم تمہارا کردار دیکھ کر اپنی بچیوں کو اجازت دے دیتے ہیں کہ رسالے پڑھنا بری بات نہیں اور میں ان سے کہتی تھی۔

"سارے رسالے نہیں صرف اس ادارے کے رسالے بہترین تربیت کرتے ہیں۔" الحمدللہ ان رسالوں نے مجھے اللہ سے محبت کرنا سکھایا۔ اللہ کے کلام سے عشق کرنا سیکھا اور آج الحمدللہ میں الہدیٰ کی برانچ میں قرآن پاک کا ترجمہ تفسیر پڑھاتی ہوں۔

تین جلدیں تفسیر کی اپنے ہاتھ سے لکھ چکی ہوں۔

قرآن اللہ کا کلام میرا عشق' میرا مقصد حیات ہے۔

دس سال سے میں اس ادارے سے وابستہ ہوں۔ میرے رب نے مجھے بے تحاشا نوازا ہے۔ تین خوب صورت بیٹے' ایک بے حد پیاری بیٹی کی ماں ہوں۔

میرے والدین میرے پاس رہتے ہیں۔ اپنی ساس کی تین سال فالج کے دوران خدمت کی۔ اپنے گھر میں خوش' میرے والد ہی شروع سے مجھے آپ کے رسالے لاکر دیتے ہیں۔ گھر کا سارا کام خود کرتی ہوں۔

بچے بہترین اداروں میں زیر تعلیم ہیں۔

1 گھر والے اہتمام کرلیں تو ان کا ساتھ دیتی ہوں' ورنہ ہر سالگرہ پر اللہ کا شکر' شکرانے کے دو نفل پڑھ کر مناتی ہوں اور احساسات؟ اپنی آخرت کی فکر اور بڑھ جاتی ہے۔ شادی سے پہلے شدید بخار میں میری فرینڈز نے اچانک آکر میری پسند کے گفٹ دے کر خوش کیا تھا اور اس سال مجھے سردی کا شدید اٹیک تھا۔ میری بیٹی نے چاکلیٹ کیک اپنے ہاتھوں سے بنا کر میرا دل خوش کردیا۔ ویسے بھی میری سالگرہ یکم مارچ ہوتی ہے بہاروں کی آمد۔

2 عمیرہ احمد نے اللہ سے عشق کرنا سکھایا۔ اس کا

نعم البدل نمرہ احمد ہے۔ جس کا ہر لفظ شاہکار ہے۔ خصوصی طور پر "مصحف" میں قرآن کی تفسیر کے جملے' پھر "جنت کے پتے" میں ترکی گھومتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ہم خود وہاں موجود ہیں۔ رخسانہ نگار کے ناول "زندگی ایک روشنی" کے تمام کردار عنیزہ احمد' فرحت اشتیاق' راحت جبیں' فائزہ افتخار' صائمہ اکرم اس کے علاوہ بے شمار رائٹرز ان کے جملے کیا کیا لکھوں "پیر کامل' اور بیل' روشنی کا سفر' زرد موسم"۔

کس کس تحریر کی بات کروں' ہر تحریر پر دم نکلے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ سب قلم سے جہاد کر رہی ہیں۔ اب سب کے لیے دعا۔

جزاک اللہ الخیر۔

3 پہلے شمارے سے آج تک ایک لفظ بھی مس نہیں کیا۔ شعاع کے ساتھ ساتھ جو سلسلہ آپ نے شروع کیا تھا۔ کئی بار دل چاہا کہ اس میں شرکت کروں' لیکن بے تحاشا مصروفیت نے موقع نہیں دیا۔ اس سلسلے کو جاری رکھیں۔ اس کے علاوہ شروع میں صحیح احادیث کا سلسلہ بے حد خوب صورت ہے۔ آپ نے امہات المومنین کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ زبردست معلومات تھیں۔ مسلم ہیروز کو اپنے رسالوں میں نمایاں جگہ دیں۔ تاکہ آنے والی نسل ان کو اپنا آئیڈیل بنا کر اپنی زندگیوں کو شان دار بنائیں۔

"تاریخ کے جھروکے" بھی زبردست سلسلہ ہے۔ انٹرویوز میں شوبز کو کم کریں اور رائٹرز کو جگہ زیادہ دیں۔ ان کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگتا ہے۔ ان کے ڈرامے جب میرے بچے دیکھتے ہیں تو حیران ہوتے ہیں ان تحریروں نے ٹی وی کو بھی سجا دیا ہے۔ لیکن اچھے سے اچھا ڈرامہ تحریر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اس کے علاوہ باقی بہنوں کی طرح میری رائے بھی یہی ہے کہ آپ ٹائٹل پر لڑکیوں کی تصویروں کی جگہ پھولوں کی قدرتی سین کی تصویریں دیا کریں۔ اس طرح رسالہ سامنے پڑا ہو تو نماز پڑھتے ہوئے اس کو چھپانا نہیں پڑے گا۔ باقی سب کچھ شان دار ہے۔ ویل ڈن آپ سب کے لیے دعائے خیر۔

عائشہ خان.... ٹنڈو محمد خان

سادگی سے ہی مناتی ہوں۔ شوہر کے اصرار پر گھر میں کوئی خاص ڈش پکا لیتی ہوں۔ زیادہ تر بریانی پکاتی ہوں۔ عمر کے ایک سال رخصت ہونے پر۔ ویسے تو کچھ خاص خیال نہیں آتا تھا۔ مگر جب سے میں ماں بنی ہوں تب سے اپنے بچوں کا خیال آتا ہے کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو ان کا کیا ہوگا۔ کیونکہ ایک سال رخصت ہونا یعنی زندگی کا ایک سال کم ہونا ہوتا ہے۔ ویسے تو چھوٹے موٹے گفٹ ملتے ہی رہتے ہیں۔ مگر شادی کے بعد شوہر نے سالگرہ پر سوٹ گفٹ کیا تھا اور ان دنوں میں اپنی امی کے گھر کراچی میں تھی اور شوہر ٹنڈو محمد خان میں تھے۔ فون کر کے مبارک باد دی تھی۔ یہ بات پسند آئی تھی۔

2۔ ثمینہ عظمت علی "کچھ رشتے بس" نومبر 2011ء

"کچھ رشتے بس فیس بک پر ہی اچھے لگتے ہیں۔"

ثریا انجم کرچیاں دسمبر 2011ء

"زندگی کے سفر میں اگر ہمسفر اچھا مل جائے تو انسان ہر اچھے برے وقت کا سامنا بڑی آسانی سے کر لیتا ہے۔"

3۔ وقت کے ساتھ ساتھ شعاع میں منفی تبدیلی تو کوئی نہیں آئی۔ ہاں مگر نئے زمانے میں جیسے جیسے جدید ٹیکنالوجی آ رہی ہیں تو کہانیوں کا معیار بھی وہ ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کہانیوں کے موضوع بڑھ گئے ہیں۔ ہمارا بچپن پچھلا زمانہ اتنا بے فکر تھا کہ ہر کہانی دل پر گہرائی سے اثر کرتی تھی۔ اب شاید ہم اتنی گہرائی سے نہیں پڑھ پاتے۔ (مصروفیت کے باعث) تو اس میں شعاع کے معیار کی کوئی بات نہیں۔

پرانی رائٹر نے نہایت خوش اسلوبی سے شعاع کی ذمے داری نبھائی ہے۔ شعاع کو اس مقام تک پہنچایا اور اب نئی رائٹر نے ان کی جگہ سنبھال لی ہے۔

اسماء خان.... کیماڑی کراچی

1 آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ہمارے گھر میں سالگرہ نہیں منائی جاتی۔ (اسماء ہمیں بالکل حیرت نہیں ہوئی ہمارے ہاں اب بھی 90٪ گھرانوں میں سالگرہ کا کوئی تصور نہیں) البتہ اسکول لائف میں ہم دوستیں سالگرہ منا لیتی تھیں اور عمر کا ایک سال رخصت ہونے پر یہی سوچ ہوتی ہے کہ گزرے سال میں کتنی نیکیاں کمائیں اور کتنے گناہ کیے۔ مجھے وہ گفٹ نہیں بھولتا جب میری دوست زوبیہ نے مجھے ریڈ روز کا شوپیس گفٹ کیا تھا جو مجھے بے حد پسند آیا۔

2 ایسے جملے تو بہت سے ہیں۔ مگر اس ماہ کے شمارے میں "دیوار شب" میں عالیہ جی کے یہ جملے' یہ تحریر میں کبھی نہیں بھولوں گی۔

"حقیقت کتنی بھی تلخ سہی' لیکن اسی تلخ ترین گہرائی سے خیر کا چشمہ بھی پھوٹنے کا منتظر ہوتا ہے' بالکل ویسے ہی جیسے گہری سیاہ رات کے قریب تر سحر کی پہلی کرن۔"

3 کب سے پڑھنا شروع کیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ جب سے شعور پایا تو غلط نہ ہوگا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میں جب ساتویں جماعت کی اسٹوڈنٹ تھی تب سے آپی سے چھپ چھپ کر پڑھتی تھی۔ وہی پرانے شعاع منگواتی تھیں۔ نئے البتہ میٹرک کے بعد میں نے منگوانے شروع کیے۔ وقت کے ساتھ ساتھ شعاع کی تحریریں بہت خوب صورت ہوتی جا رہی ہیں' مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔

ثانیہ عبدالغفور.... للیانی سرگودھا

1 میں اپنی سالگرہ بالکل نہیں مناتی۔ اپنی سالگرہ والے دن میں بہت اداس ہوتی ہوں۔ سوچتی ہوں کہ میری زندگی کتنی بے مقصد گزر رہی ہے۔ آئندہ سال کے لیے کچھ کرنے کا عزم کرتی ہوں۔

میں اپنی سالگرہ پر امی سے بہ اصرار گفٹ لیتی ہوں اور مزے کی بات میری سالگرہ 11 اگست کو ہے۔ (آپ بھی وش کر دیں نا۔)

2 اس ماہ کے چند جملے جو میرے دل و جان کو چھو گئے۔

برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اپنی محرومیوں اور دکھوں کو بھلا کر زندگی کی دوڑ میں شامل ہونا ہی پڑتا ہے۔ ورنہ انسان وقت اور زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔"

(نمرہ احمد.... جنت کے پتے)

"عورت کا رتبہ بہت بلند ہے۔ دنیا میں محبت کی سب سے مضبوط علامت قربانی دینے کا وصف اللہ نے اسی میں رکھا ہے۔"

(عالیہ بخاری.... دیوار شب)

3 میں نے شعاع جنوری 2010ء سے شروع کیا تھا۔ تب میں 10th کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اس کے بعد میری شخصیت میں بہت تبدیلیاں آئیں۔ میری سوچ بہت مثبت ہو گئی اور پہلے سے کہیں زیادہ اعتماد آ گیا۔ اس عرصہ میں شعاع نے زندگی کے بہت سے پیچیدہ پہلوؤں پر میری رہنمائی کی۔ بلاشبہ شعاع ایک بہترین رہبر ہے۔

صبا طارق.... گوجرانولہ

سالگرہ منانے کا ہمارے گھروں میں رواج تو نہیں ہے کہ پارٹی کی جائے بڑی سی' سب رشتے داروں کو بلایا جائے اور بہت سا پیسہ ان فضول کاموں میں برباد کیا جائے۔ لیکن میں ہر سال اپنی سالگرہ پہ اتنا ضرور کرتی ہوں کہ ایک اچھا سا سوٹ سلواتی ہوں جو میں اپنی سالگرہ کے دن پہنتی ہوں اور دہی بڑے یا چنا چاٹ میں ضرور بنواتی ہوں چاہے یہ خود بناؤں یا امی جی۔ دہی بڑوں کے ساتھ چکن بریانی یا کوئی اور اچھی سی ڈش بنا لی بس اس سے زیادہ میری سالگرہ پر کچھ نہیں ہوتا۔ عمر کا ایک سال کم ہونے پر تو کوئی احساسات نہیں ہوتے۔ بس یہ فکر پڑ جاتی ہے کہ گھر والے کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ اتنی بڑی ہو گئی ہے اب اس کی شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے اور یہی بات پریشان کرتی ہے کہ گھر والوں کو چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ سالگرہ پر تحفے تو ملتے ہی

ہیں جو میرے لیے تو بہت خوبصورت ہوتے ہیں اور میرے خیال میں کہ تحفہ چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو تحفہ ہوتا ہے وہ کوئی چیز نہیں' یہ ایک احساس ہوتا ہے کہ دینے والے نے کتنے پیار سے دیا ہے۔ خوبصورت جملہ تو ابھی تک کسی نے نہیں کہا اور رہی بات مبارک باد کی تو رات کے بارہ بجے ہی سب بہنیں اور فرینڈز کے فون اور میسجز آجاتے ہیں اور میرے لیے یہ ہی سب سے اچھی بات ہے کہ سب یاد رکھتے ہیں اور وش کرتے ہیں۔

2۔ شعاع میں شایع ہونے والی تحریروں میں کچھ جملے اتنے خوبصورت ہوتے ہیں کہ دل کو چھو لیتے ہیں۔ ایسے دل میں گھر کرنے والے جملے انتخاب کر کے لکھیں ——— کنیز نبوی کی کہانی "تشنگی کا سفر میں" سے یہ تھوڑے سے خوبصورت جملے ہیں"۔ بندہ جب تک اپنی "میں" کو ختم نہیں کرے گا تب تک منزل نہیں ملتی بیٹا! اپنے نفس کی بات ماننا بھی شرک ہے"۔ اور دوسرا یہ۔

"کیا کسی سے دل لگانا اپنے اختیار میں ہوتا ہے"

3۔ فاطمہ عسکری کے افسانے "ذرا سنبھل کے" میں سے یہ جملہ "ہر چیز کا ایک صدقہ ہے اور عقل کا صدقہ یہ ہے کہ جاہل کی بات کو برداشت کرو کیونکہ تم اسے سمجھانے سے قاصر ہو۔"

4۔ "ہمارے دلوں میں اتنی تھوڑی جگہ کیوں ہے کہ ہم تمام رشتوں سے ایک جیسی محبت نہیں کرتے (فرحت اشتیاق)"۔

"محبت کو تقسیم نہ کرو ضرب دو۔ تقسیم سے محبت بٹتی ہے' ضرب سی بڑھ جاتی ہے (کنیز نبوی)"

"کبھی بڑوں کو بھی چھوٹوں کے آگے جھک جانا چاہیے اس سے ان کی عزت میں فرق نہیں آتا بلکہ چھوٹوں کو بھی جھکنا آجاتا ہے (عمیرہ احمد)"

5۔ "بیٹیاں رحمت ہیں اور رحمت کے بارے میں اللہ کبھی سوال نہیں کرے گا کہ وہ اس کا اپنا فیصلہ ہے جس کو چاہے نوازے۔ ہم بیٹیاں مانگتے نہیں' وہ ہمارے لیے اللہ کی پسند بن کر آتی ہیں۔ بیٹا ہم مانگتے ہیں رو رو کر' گڑگڑا کر۔ وہ نعمت بن کر آتے ہیں اور نعمتوں کی جواب دہی کرنی پڑے گی۔ ایک بیٹی کی پرورش پر جنت کی بشارت اور آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلی برابر فاصلے کا ساتھ ہے۔ دس بیٹے پالنے پر بھی کوئی انعام نہیں"۔

6۔ "کسی بھی انسان کی معذوری اس کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہوتی' کوئی بھی انسان خود کو بدصورت بنانا پسند نہ کرتا۔ اگر خود کو بنانا اس کے اپنے اختیار میں ہوتا۔ ہمیں معذور لوگوں پہ ہنسی آتی ہے ہم بدصورت لوگوں سے نفرت کرتے ہیں ہمیں ان پر ترس آتا ہے مگر محبت نہیں ہوتی شاید اس لیے کہ ہم تخلیق کرنے والے کی نگاہ نہیں دیکھتے"۔

"شعاع" کی سب سے پہلی کہانی جو میں نے پڑھی تھی وہ "تیری راہ میں رل گئی وے" میمونہ خورشید کی تھی۔ اور جب یہ کہانی پڑھی تو اس کے بعد سے اب تک رسالہ پڑھنا نہیں چھوڑا اور یقین مانیں! میں نے اپنی پیدائش سے پہلے کے بھی رسالے پڑھ لیے ہیں اور اتنے ڈھیر سارے نئے پرانے رسالے پڑھے ہیں کہ جو میرے سے بڑی بہنوں نے بھی نہیں پڑھے۔

وقت کے ساتھ شعاع میں بھی بہت تبدیلیاں آئی ہیں مثلاً" یہ کہ جو میں چاہتی تھی کہ اس موضوع پر کہانیاں لکھی جائیں۔ اسی پر لکھی جارہی ہیں اور بہت کچھ سیکھ بھی رہی ہوں میں ان سے۔



ستارۂ شام

آمنہ ریاض

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے' جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں رواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی "جنت" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کا دن رات نوکری کی چکی میں تپتے گزر رہا ہے۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ اچھے مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا۔ ہردم "اس" کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت بی بی ان کی حراست میں ہے' جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگم بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت شیزوفرینہ کی مریض ہے۔ جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے۔ جسے اس نے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماویٰ کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کو تلاشنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت دانیال ملنسار اور مجتبی خاتون ہیں۔ ولی' جولید اور ااینیا ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں اینیا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

شبیہہ العباس طبعتاً "سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے' جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ



پھپھی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے سخت نالاں ہے۔ شبیہہ، تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبیر اور نمرہ تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہہ، تنوی کا منگیتر ہے، وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہتک آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔

دین محمد، جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارتے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی۔

ثروت، دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر میکے چلی جاتی ہیں۔ انیبا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن، ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ثمینہ، ماوی کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹتی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیہہ العباس، ماوی کے رشتے دار ہیں اور یہ کہ ماوی کے باپ، رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ، ماوی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

شبیہہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ ثمینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ ثمینہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں، لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ ثمینہ اسے گھر بلاتی ہیں۔ ثمینہ، ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیہہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں، جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہہ بھی کرتا ہے۔

انیبا دل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے.... ماوی، ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان، ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے ثمینہ، ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبیر، نمرہ اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے، وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد، بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پڑوسن کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو، رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پنپنے والی منفی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہتک آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔

دین محمد، جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارتے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی ہے۔

ثروت، دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر میکے چلی جاتی ہیں۔ انیبا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن، ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ثمینہ، ماوی کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹتی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیہہ العباس، ماوی کے رشتے دار ہیں اور یہ کہ ماوی کے باپ، رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ، ماوی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

ثمینہ نے بتایا۔ رجب کے مرنے کے بعد جنت بی بی نے ان کے سامنے رجب کی وصیت رکھ دی۔ جس میں انہوں نے اپنی ساری جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی۔ وہ ساری جائیداد اٹھارہ برس کی عمر ہونے کے بعد رجب کی بیٹی یعنی ماوی کو منتقل ہونا تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ وصیت جعلی تھی لیکن ثمینہ کے اس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ وہ جنت کو چیلنج کر سکتیں۔ وہ خاموشی سے حویلی چھوڑ کر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گئیں۔

بعد میں ایک دن جنت بی بی ثمینہ سے ملنے آئی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اس کے بڑے بیٹے سے شادی کر لیں۔ جو ذہنی معذور تھا۔ ثمینہ نے انکار کر دیا۔ تب جنت نے بتایا کہ وہ رجب کی ساری جائیداد اپنے نام کرا چکی ہے۔ ساتھ اس نے انکشاف کیا کہ رجب کو اس نے زہر دے کر مارا ہے۔

ثمینہ نے کہا کہ ماوی آئرش نیشنل ہے۔ جنت اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔ ایمبیسی حرکت میں آجائے گی۔

ثمینہ نے ماوی سے کہا، وہ اس کی شادی جلال سے طے کر چکی ہیں۔ اسے جلال سے نکاح کرنا ہوگا تاکہ حویلی جا سکے۔ انہوں نے کہا اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد ماوی جلال سے خلع لے لے تاکہ شہروز سے شادی کر سکے۔ شہروز کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ماوی نے انکار کیا تو ثمینہ نے خواب آور گولیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کی۔

ماوی بالآخر ثمینہ کی بات مان کر حویلی چلی گئی۔ جنت بیگم گاؤں سے باہر گئی ہوئی تھی۔ مستقیم بھٹی اور دیگر لوگوں نے ماوی کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ وہ سب رجب اور ثمینہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رجب کی جائیداد ماوی کے نام کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم شبیہہ العباس کو یہ منظور نہیں۔ وہ جنت بیگم کے آنے تک کوئی فیصلہ کرنے کے خلاف ہے۔ وہ ماوی کا دشمن ہو گیا اور اس نے اپنی تمام کزنز کو ماوی سے بات کرنے سے منع کر دیا۔ ماوی کو یہ پتا چلا تو اس نے مستقیم بھٹی سے اس کی شکایت کر دی۔ انہوں نے ماوی کے سامنے شبیہہ العباس کو ڈانٹا۔

فیضان ملک میں واپس آ گئے۔ وہ سیدھے ثمینہ کی انیکسی پہنچے۔ انیبا نے انیکسی کی چابیاں ان کے حوالے کر دیں۔ مگر ثمینہ کے انیکسی چھوڑ کر چلے جانے کا نہیں بتایا۔

ماوی کو حویلی کے ایک حصے اور ملازمین کے رویے میں عجیب پر اسراریت کا احساس ہوا تو اس نے تمام حالات جاننے کے لیے ایک خاص ملازمہ تسنیم سے دوستی کر لی۔

وہ جنت بیگم کی حویلی میں واپسی کی شدت سے منتظر تھی، جب ہی ایک صبح اسے شبیہہ کے ساتھ جنت بیگم نظر آئی۔ جنت بیگم کے ساتھ جلال بھی تھا۔ وہ ماوی کو حویلی میں دیکھ کر حیران رہ گیا تاہم اس نے اپنے تاثرات ظاہر نہ ہونے دیے۔ جنت بیگم نے ماوی کو یہاں دیکھ کر مستقیم بھٹی پر بے حد غصہ کیا۔ جنت بیگم نے تنہائی میں ماوی سے حویلی آنے کا مقصد پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کا سراغ لگانے اور جائیداد میں سے اپنا حصہ لینے آئی ہے۔

جنت بیگم نے اسے دھمکی دی کہ وہ اسے حریم کی شادی کے بعد حویلی سے باہر نکال دے گی۔

فیضان، ماوی کی پر اسرار گمشدگی سے پریشان ہیں۔ ثمینہ ان سے کہتی ہیں کہ ماوی پاکستان میں ہی ہے لیکن انیبا انہیں بتاتی ہے کہ ثمینہ نے اسے بتایا ہے وہ آئرلینڈ واپس چلی گئی۔

رات کے وقت جلال، ماوی سے ملنے اس کے کمرے میں گیا تو شبیہہ نے اسے وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔

شبیہہ نے جلال سے باز پرس کی تو جلال نے اسے بتا دیا کہ وہ ماوی سے نکاح کر چکا ہے۔ جب وہ شبیہہ کو یہ بات بتا رہا تھا تو تنوی نے سب کچھ سن لیا۔ اس نے حرم اور نمل کو بھی بتایا مگر انہیں یقین نہیں آیا۔ فیضان کو پتا چل گیا کہ ماوی حویلی میں ہے۔ فیضان، ثمینہ پر بے حد ناراض ہوئے۔

ماویٰ نے حویلی کی خاص ملازمہ تسنیم کو آمادہ کرلیا کہ وہ اسے حویلی کے تمام رازوں سے آگاہ کرے گی۔ حرم کی مہندی کی تقریب ہو رہی تھی۔ سب لوگ اس میں مصروف تھے جب تسنیم نے ماویٰ کو ملنے کا اشارہ کیا۔ ماوی حویلی کے عقبی حصے میں گئی تو وہاں اسے تسنیم کے بجائے ایک لاغر سا ڈھانچہ نما شخص کھڑا نظر آیا۔ وہ خوف زدہ ہو گئی۔

۲۵
پچیسویں قسط

وہ جو کوئی بھی تھا بے حد ضعیف اور مدقوق تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں کمزور جلد سے باہر ابلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے ماویٰ کو دیکھ رہا تھا۔ اپنی تمام تر طراری کے باوجود ماویٰ کو اس سے بری طرح خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ چیخ کر تسنیم کو آواز دے لیکن قوت گویائی نے اس کا ساتھ دینا بند کر دیا تھا۔ اس کے حلق سے کچھ عجیب عجیب آوازیں بھی آ رہی تھیں جن کا مفہوم سمجھنا مشکل تھا لیکن اس کے دیکھنے کا انداز کہتا تھا کہ وہ عنقریب حملہ کرنے والا ہے۔

تب ہی وہ رینگتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگا۔ ماوی کا رہا سہا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔ اس نے بند دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بمشکل تھوک نگلا اور اتنی ہمت جمع کی کہ کسی کو مدد کے لیے پکار سکے لیکن اس سے پہلے کہ وہ حلق کا پورا زور لگا کر چیختی' دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور تسنیم تیر کی تیزی سے اندر داخل ہو کر اس ڈھانچے کی طرف بڑھی۔

"ادھر آؤ ابا! ان کو کچھ نہیں کہنا۔ یہ رجب چاچا کی بیٹی ہیں۔ تم سے ملنے آئی ہیں۔"

تسنیم پچکار پچکار کر اسے کونے میں پڑی چارپائی کی طرف لے جا رہی تھی اور وہ تھا کہ ماویٰ کی طرف جانے کو بے چین تھا۔ اس عمل کے دوران اس کے حلق سے کچھ عجیب ناقابل فہم آوازیں بھی نکل رہی تھیں' جو کم سے کم ماویٰ کے لیے تو سمجھنا ناممکن تھا لیکن تسنیم نہ صرف ان آوازوں کے مفہوم کو سمجھ رہی تھی بلکہ ان پہ رد عمل بھی ظاہر کر رہی تھی۔

بالآخر تھک ہار کے اس نے ماوی کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا۔

"بی بی! آپ ڈریں نہیں۔ ابا آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔"

"تمہیں یقین ہے نا تسنیم!" ماوی نے سابقہ سہمے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔ "ان کے انداز سے تو ایسا نہیں لگتا کہ یہ کچھ نہیں کہیں گے۔"

"نہیں بی بی! آپ بے فکر رہیں' میرے ابا کتنے بھی بیمار سہی لیکن نقصان کسی کو نہیں پہنچاتے۔" تسنیم نے جیسے اس کی بات کا برا مانتے ہوئے کہا تھا' پھر اس نے اپنے ابا کو مخاطب کر کے پنجابی میں کچھ کہا۔ ماوی نہ صرف اس زبان سے نابلد تھی بلکہ خوف کے زیر اثر بھی تھی' اس لیے خاک بھی اس کے پلے نہ پڑی۔

"بی بی! ابا آپ کے سر پہ پیار دینا چاہتے ہیں۔ ان کی بات مان لیں ورنہ یہ اسی طرح اپنی ضد پہ اڑے رہیں گے اور اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلیں گے۔" تسنیم نے اس سے منت بھرے انداز میں کہا۔

"نہیں..... میں سر پہ پیار لے کر کیا کروں گی؟" اس نے ہونق پن سے پوچھا۔

"بڑوں کا پیار تو بڑا نیک شگون ہوتا ہے بی بی..... ان کی دعاؤں سے تو بگڑے کام بھی بن جاتے ہیں۔" تسنیم نے جیسے اسے لالچ دیا۔

"اچھ..... چھا۔" ماوی ابھی بھی تذبذب کا شکار تھی اور الجھن بھری نظروں سے اس بوڑھے اور حواس باختہ

شخص کو دیکھ رہی تھی۔

"جلدی فیصلہ کرلیں بی بی! کیونکہ اپنی مرضی پوری کیے بغیر ابا نے یہاں سے ٹلنا نہیں ہے اور اتنی دیر میں آپ کو کوئی ڈھونڈتا ہوا آگیا تو سمجھیں' سب کچھ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔" تسنیم نے جلدی جلدی اسے تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھا دیا تھا۔ "پھر مجھے آپ کے پاس تو کیا شاید اس حویلی کے پاس بھی پھٹکنے نہ دیا جائے۔"

بات درست تھی۔ ماویٰ کے دل کو بھی لگی' تب ہی ساری ہمت مجتمع کر کے دو انتہائی مختصر قدم آگے بڑھی۔ یہ پیش رفت اس کی آمادگی کی نشانی تھی۔

تسنیم نے جلدی سے ابا کو آگے کیا تاکہ وہ ماوی کے سر پر ہاتھ پھیر کر اپنا شوق پورا فرما سکیں لیکن اس دوران بھی اس نے بزرگوار کو کندھوں سے دبوچ رکھا تھا۔

بوڑھے آدمی نے اپنا رعشہ زدہ ہاتھ ماوی کے سر پہ پھیرا اور نہ سمجھ میں آنے والی زبان میں غالباً" اسے دعاؤں سے نوازتا چارپائی کی طرف پلٹ گیا۔

ماویٰ نے جلدی سے ہاتھ پھیر کر اپنا ہیئر اسٹائل درست کیا لیکن نظریں مستقل تسنیم اور اس کے ابا کے تعاقب میں ہی تھیں۔ تسنیم ابا کو لٹا کر ماوی کی طرف آگئی۔

"میں نے کہا تھا نا' ابا آپ کو کچھ بھی نہیں کہیں گے۔" اس کا انداز جتاتا ہوا تھا۔ ماوی اتنی دیر میں پرسکون ہو چکی تھی لیکن اس کی نظریں ابھی تک اس بوڑھے آدمی کی طرف ہی تھیں' جو لیٹنے اور آنکھیں بند ہونے کے باوجود بڑبڑا رہا تھا۔

"ویسے تمہارے ابا نے میری جان نکالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" ماویٰ نے پرسکون لہجے میں کہا تھا۔

"آپ یہاں آکر بیٹھ جائیں بی بی!" تسنیم نے اس کی بات پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا اور کمرے میں موجود واحد ٹوٹا پھوٹا موڑھا جھاڑ پونچھ کر اسے پیش کیا۔

"تمہارے ابا کو کیا بیماری ہے تسنیم! اور یہ اس ویران جگہ پہ قیدیوں کی طرح کیوں رہ رہے ہیں؟" ماویٰ نے ایک سانس میں دو سوال نمٹا لیے تھے۔

"بڑھاپا تو خود سب سے بڑی بیماری ہے جی!" تسنیم نے اس کے بالکل سامنے زمین پہ نشست سنبھالتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں لیکن ایسی بیماری تو نہیں ہے کہ سب سے کاٹ کر انسان کو الگ تھلگ کر دیا جائے۔" ماویٰ نے جرح شروع کی۔ تسنیم کے چہرے پر واضح طور پر سایہ لہرایا تھا۔

"آپ مجھ سے اپنے ابا کے متعلق کیا جاننا چاہتی ہیں؟" اس نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"فی الحال تو میں تم سے تمہارے ابا کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔" ماویٰ نے سنجیدگی سے کہا۔ "اور بہتر ہو گا کہ تم مجھے ٹالنے کے بجائے ساری حقیقت بتا دو۔ اپنے ابا کے بارے میں بھی اور میرے ابا کے بارے میں بھی۔" اس کا انداز بے لچک اور دو ٹوک تھا۔

"بی بی! میں پہلے بھی آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں بہت کچھ نہیں جانتی لیکن جو مجھے پتا ہے' وہ آپ کو ضرور بتا دوں گی۔" تسنیم نے کہا۔ "جہاں تک سوال میرے ابا کا ہے تو یہ غلط نہیں ہے کہ بڑھاپا خود سب سے بڑی بیماری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حویلیوں کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ ایسی غلطیوں کی سزائیں بھی بھگتنا پڑ جاتی ہیں' جو ہم جیسے پیدائشی کمیوں نے کی ہی نہیں ہوتیں۔" تسنیم کا سر جھکا ہوا تھا اور زبان ٹھہر ٹھہر کے چلتی تھی۔

ماویٰ کے تجسس کو گویا ہوا ملنے لگی۔

"سنو تسنیم! میں بڑی نالائق سی لڑکی ہوں۔ مشکل باتیں آسانی سے سمجھ نہیں آتیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم مجھے ساری باتیں آسان لفظوں میں سمجھا دو۔"

تسنیم نے گہری سانس بھر کے اسے دیکھا اور گو کہ منہ سے کچھ نہیں کہا لیکن ماوی جانتی تھی وہ سوجان سے اس کی کم عقلی پر لعنت بھیج رہی ہے۔

"میرے ابا کو بڑی بی بی یعنی آپ کی سوتیلی دادی نے اس کال کوٹھڑی میں پچھلے کئی سالوں سے بند کر رکھا ہے۔ ان کی غلطی کیا تھی۔ میں نہیں جانتی، مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ حویلی کے اس حصے میں میرے ابا سمیت کئی ملازم قید ہیں۔ باقی تمام ملازم اپنی چھوٹی موٹی کوتاہیوں کی سزا بھگتنے کے بعد چھوٹتے بند ہوتے رہتے ہیں لیکن میرے ابا کی قید تاحال ختم نہیں ہوئی اور مجھے اب اس کی کوئی امید یا خواہش بھی نہیں ہے۔"

"لیکن کیوں؟" ماوی نے اچنبھے سے پوچھا۔

"وہ اس لیے بی بی! کیونکہ میرے آگے پیچھے تو کوئی ہے نہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی خود کو اور ابا کو اس حویلی کا ملازم پایا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے ابا کی قید نعمت کی طرح ہی لگتی ہے کیونکہ اگر بڑی بی بی نے ہمیں حویلی سے نکال دیا تو میں ایسے میں ابا کو لے کر کہاں خوار ہوتی پھروں گی جس کا دماغ ہی کام نہیں کرتا جو اپنی حفاظت نہیں کر سکتا۔ اس سے میں اپنے لیے کوئی اچھی امید کیا رکھوں۔"

"جو بھی ہو لیکن یہ تو تمہاری بڑی بی بی کا سراسر ظلم ہے۔"

"کچھ بھی ہے بی بی! لیکن کم سے کم اس حویلی میں میری عزت تو محفوظ ہے۔ کوئی بری نظریں ڈالنے والا تو نہیں۔" تسنیم اس حال میں بھی اچھی خاصی مطمئن تھی۔ ماوی کو تعجب تو ہوا لیکن اس نے زیادہ کریدنا یا اکسانا مناسب نہ سمجھا۔

"ٹھیک ہے بھئی۔ جیسے تم خوش۔ میں کون ہوتی ہوں تمہیں مشورے دینے والی۔ اب تم مجھے وہ بات بتاؤ جس کے لیے اتنا رسک لیا ہے۔"

"ہاں بی بی! میں بتاتی ہوں۔ اس وقت میں بہت چھوٹی تھی لیکن اس کے باوجود اپنے ابا اور رجب چاچا کی دوستی کے قصے مجھے یاد ہیں۔ پھر کچھ باتیں جب تک ابا کا دماغ کام کرتا رہا، وہ بھی مجھے بتاتے رہتے تھے۔"

"تمہارے ابا اور میرے بابا دوست تھے؟"

"صرف دوستی کہنا غلط ہوگا بی بی! یہ دونوں تو بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ آپ سوچتی ہوں گی نوکر اور مالکوں میں کیسا بھائی چارہ..... تو یہ حقیقت ہے جی! اس وقت تو رجب چاچا اور ان کی بیوی بھی یہاں نوکروں کی طرح ہی رہتے تھے۔ بڑی بی بی نے سچی بات ہے ان دونوں پہ بڑے ظلم ڈھائے تھے۔ ابا کہتے تھے ایسا سلوک تو کوئی اپنے دشمنوں سے بھی نہیں کرتا جیسا بڑی بی بی ان دونوں سے کرتی ہیں۔"

"اچھا مثلاً..... ایسا کیا کرتی تھیں؟" ماوی نے پوچھا۔ تسنیم آگے اسے وہی تفصیلات بتانے لگی، جو وہ ممی سے سنتی آئی تھی لیکن تسنیم سے سارے حقائق اگلوانے کے لیے اس سے یہ سب سننا ضروری تھا تاکہ گفتگو کے بہاؤ میں وہ سب اگلتی چلی جائے۔

تسنیم بول رہی تھی۔ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ محسوس نہ ہوتی۔ ماوی کو اس کی بات سمجھنے کے لیے ہمہ تن گوش ہونا پڑ رہا تھا اور اپنی اپنی مصروفیت میں گم ان دونوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ چارپائی پر لیٹے ہوئے نحیف و نزار اور ہوش و خرد سے بیگانہ وجود کو اس کا لاشعور ماضی کے ویرانوں میں پٹخنیاں دیتا پھر رہا ہے۔



یہ برسات کے دن تھے لیکن کئی دن گزر جانے کے باوجود بارش کے نام پر ایک بوند بھی نہ برسی تھی۔ آسمان بے رونق سا محسوس ہوتا۔ جلتے بلتے سورج نے جیسے ساری کائنات کے رنگ چھین رکھے تھے۔ دن بھر اور شام ڈھلنے تک آسمان کے محور پر کالی سیاہ چیلیں گردش کرتی رہتی تھیں۔ جس سے وقت کے چہرے سے اور نحوست ٹپکنے لگتی۔ ہوا چلتی لیکن لو کے تھپیڑوں سے لبریز۔ ایسا لگتا مدت سے ہوا کی تراوٹ کو محسوس ہی نہیں کیا۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ سخت ترین گرم، بیزاری میں مبتلا کر دینے والا اور حقیقتاً "منحوس"۔

رب نواز نے سر اٹھا کر اپنی چندھی آنکھوں سے آسمان کا چہرہ ٹٹولنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کوشش میں وہ بری طرح ناکام رہا تھا۔ آسمان آگ اگلتا تھا اور اپنی طرف نظر بھر کے دیکھنے بھی نہ دیتا تھا۔ رب نواز گو کہ گھنے برگد کے سائے میں کھڑا تھا لیکن اسے اپنا آپ بھی اس آگ سے جھلستا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سامنے دیکھا۔ دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت پانی مانگتے تھے۔ اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں ابھر آئیں۔

"بڑی بی بی! چوہدری فیاض کے آدمیوں نے پھر ہماری زمینوں کا پانی روک دیا ہے۔" رب نواز جنت بیگم کے سامنے مؤدبانہ سر جھکائے کھڑا تھا۔

جنت بیگم نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

"چوہدری فیاض کے آدمی کچھ زیادہ ہی سر چڑھتے جا رہے ہیں۔" اس کا انداز جھنجلاہٹ آمیز اور پرسوچ تھا۔

"سب چوہدری کی دی ہوئی شہ ہے بی بی! ورنہ نوکروں کی کیا مجال کہ ایسی حرکت کریں۔"

"ہاں ٹھیک کہتے ہو۔" جنت بیگم نے کہا۔ رب نواز کو جنت بیگم کی تائید سے بڑا سکون ملا تھا۔

"پھر بی بی! وہ لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان زمینوں کی سرپرست ایک عورت ہے۔ اس بات نے انہیں نڈر بنا دیا ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" جنت بیگم نے تڑخ کر کہا تھا۔ "کون سا کوئی عورت پہلی بار سرپرستی کر رہی ہے..... تم جاؤ چوہدری فیاض کے آدمیوں سے بات کرو۔ تحمل سے بات۔ نہیں سمجھیں گے تو میں چوہدری سے خود بات کروں گی۔"

جنت بیگم نے اپنے مخصوص اسٹائل اور کھرے انداز میں کہا تھا لیکن لہجہ اس طنطنے سے خالی تھا، جو اس کا خاصا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ ساتھ والے گاؤں کے آدمیوں نے اس کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ وہ بار بار اس کی زمینوں کا ناکہ توڑ کے پانی کا رخ اپنی زمینوں کی طرف موڑ لیتے تھے۔ رب نواز کی بات اس کے دل کو لگی تھی لیکن ایک ملازم کے سامنے اعتراف کرنا اس کی انا اور خودداری کے خلاف تھا۔

"تم جاؤ اور ان سے بات کرو..... جاہل لوگوں کو تمیز کی زبان سمجھ میں ہی نہیں آرہی۔"

"اچھا سنو....." کچھ خیال آنے پر اس نے کہا۔ "اپنے ساتھ رجب کو بھی لیتے جانا۔ پڑھا لکھا آدمی ہے، بھاؤ سے بات کرلے گا۔"

رجب کے سامنے مانے یا نہ مانے دل میں تو اعتراف کرتی ہی تھی کہ رجب میں خاصی قابلیت ہے۔

"بلکہ رجب کو میرے پاس بھیجو..... میں خود اسے تاکید کر دیتی ہوں کہ وہاں سلیقے سے بات کرے۔ کب سے مفت کی روٹیاں توڑ رہا ہے، کسی کام تو آئے اس کا ناکارہ وجود۔" اس نے نخوت سے کہا تھا۔ رب نواز سر جھکا کر باہر نکل گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

"مل گئی فرصت؟" جنت بیگم نے رجب کو دیکھتے ہی حسب عادت ناک چڑھا کر کہا تھا۔

"مجھے ابھی رب نواز نے آپ کا پیغام دیا۔" رجب علی نے اپنی ناگواری کو چھپا کر تحمل سے کہا۔ یوں بھی جب سے وہ بیمار ہوا تھا۔ کسی بھی بات پر معترض ہونا اس نے چھوڑ دیا تھا۔ اسے خود سے زیادہ ثمینہ کی خوشی اور عزت پیاری تھی اور جنت بیگم کی کسی بھی بات پر اعتراض کرنا ہر بل کی بے عزتی کو گلے لگانے کے مترادف تھا۔ اس لیے رجب کو یہی مناسب لگتا کہ چپ چاپ اپنی سوتیلی ماں کے سامنے سر جھکائے کھڑا رہے۔

"خیر اب اپنی ہڈ حرامی کو رب نواز کے کھاتے میں تو نہ ڈالو۔ وہ تم سے کہیں زیادہ قابل اور احسان شناس ہے۔" جنت بیگم نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔ رجب خاموش رہا۔

"اب میری بات دھیان سے سنو! رب نواز کچھ ملازمین کے ساتھ چوہدری فیاض کے منشی سے ملاقات کے لیے جا رہا ہے۔ وہ لوگ بار بار ہماری زمینوں کا پانی روک دیتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں تم وہاں جاؤ اور ذرا طریقے سے بات کرو۔ وہ جاہل لوگ ہیں ہمیں ان کے منہ نہیں لگنا چاہتی۔ معاملات سنبھالنا تمہاری ذمہ داری ہوگی۔"

"جی بہتر......"

"اور سنو...... میری بات یاد رکھنا۔ میں تمہیں وہاں معاملات سنبھالنے کے لیے بھیج رہی ہوں۔ ایسا نہ ہو سب بگاڑ کر آجاؤ۔" انداز اب بھی ویسا ہی تھا۔ اس بار رجب کو بری طرح تاؤ آگیا تھا۔

"آپ کو لگتا ہے، میں معاملات نہیں سنبھال سکوں گا تو مستقیم یا منصور میں سے کسی کو بھجوا دیں۔ وہ یقیناً بہت بہتر طریقے سے اس سارے معاملے کو سنبھال لیں گے۔" یہ کھلا طنز تھا۔ وہ دونوں ہی بخوبی جانتے تھے کہ منصور میں تو پریشان کن حالات کا سامنا کرنے کی صلاحیت سرے سے ہے ہی نہیں جبکہ مستقیم کو جنت بیگم نے خود زمین جائیداد کے معاملات سے کسی مصلحت کے تحت الگ رکھا ہوا تھا۔

جنت بیگم کا سلگ جانا کچھ ایسا بے جا بھی نہ تھا۔

"اپنی اوقات میں رہو رجب! اور جو کہا جا رہا ہے، صرف وہی کرو مشورے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں اپنی اوقات پہچانتا ہوں۔ اچھا ہوگا اب آپ بھی پہچان لیں۔"

رجب نے ہمت کر کے کہا۔ یوں بھی وہ روز کی چخ چخ سے تنگ آچکا تھا۔ اسے اب دیکھنا تھا کہ حالات کیا رخ لیتے ہیں۔

"مجھے ابا کی جائیداد میں سے اپنا حصہ چاہیے۔ آپ جتنی جلدی ترکہ میرے حوالے کر دیں، اتنا ہی بہتر ہوگا۔ میں چوہدری فیاض کے آدمیوں سے مل لیتا ہوں، آپ بے فکر رہیں میں معاملات سنبھال لوں گا لیکن اس بارے میں جلد کوئی فیصلہ ہو جائے تو بہتر رہے گا۔"

رجب علی دو ٹوک انداز میں کہتا اپنی ٹانگ گھسیٹتا باہر نکل گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر جنت بیگم کے تاثرات بھی نہیں دیکھے۔ یہ اس کی ایک اور غلطی تھی۔

✲ ✲ ✲

رجب علی، رب نواز کے ساتھ چوہدری فیاض کے آدمیوں سے ملنے آتو گیا تھا لیکن اس نے کوئی خاص لائحہ عمل تیار نہ کیا تھا۔ یہ اس کی ایک اور غلطی تھی۔

اس کا خیال تھا سیدھے سبھاؤ سے بات کی جائے گی اور پھر واپسی کی راہ لیں گے لیکن اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی، جب بات کرتے کرتے اچانک رب نواز نے اس کے کان میں ریوالور نکالنے کا خیال ظاہر کیا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے رب نواز! جب وہ لوگ آرام سے بات کر رہے ہیں تو ہمیں یہ حماقت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" رجب نے درشتی سے کہا تھا۔ مبادا وہ اپنے خیال پر عمل نہ کر بیٹھے۔

"آپ کو نہیں پتا چھوٹے چوہدری جی! یہ سارے کے سارے لاتوں کے بھوت ہیں۔ خالی خولی باتوں سے ان کا کچھ نہیں ہونا۔ بندوق کی شکل دیکھتے ہی سیدھے ہو جائیں گے۔" رب نواز نے اپنا تجربہ جھاڑا تھا۔

"جو بھی ہو لیکن یہ حماقت کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔" رجب نے ڈپٹ کر کہا تھا۔ "مت بھولو کہ ہم یہاں حالات بہتر کرنے آئے ہیں، بگاڑنے نہیں۔"

"لیکن چھوٹے چوہدری......" رب نواز نے اکتا کر کہا مگر ساتھ ہی رجب کی ہدایت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے پھرتی سے ریوالور بھی نکال لیا۔ رجب نے جھنجلاتے ہوئے اس سے ریوالور چھیننا چاہا لیکن ان کے ہاتھ میں اسلحہ دیکھتے ہی مخالفین نے اپنے بچاؤ کے لیے ان پر لاٹھیاں برسانا شروع کر دی تھیں۔

عجیب سی صورت ہو گئی تھی۔ رجب کے لیے تو بہت ہی پریشان کن۔ کیونکہ اسے ایسے جھگڑوں کی عادت ہی نہ تھی اور وہ معاملہ اتنا بگڑنے کی توقع بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس جھگڑے کو روکنے کا فوری طور پر اسے ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا اور اس نے وہی آزمانے کا سوچتے ہوئے رب نواز کے ہاتھوں سے ریوالور چھیننے کی کوششیں تیز کر دی تھیں۔ اپنی مفلوج ٹانگ کے ساتھ یہ مشقت اسے بہت بھاری پڑ رہی تھی، پھر بھی وہ پوری جان سے لگا ہوا تھا۔ عین اس لمحے جب ریوالور اس کے ہاتھ میں آیا، رب نواز کی انگلی ٹریگر دبا چکی تھی اور مخالفین کے ایک آدمی کو لگ بھی چکی تھی۔

فائر کی آواز کے ساتھ چلتی ہوئی لاٹھیاں رک گئی تھیں۔ لیکن درختوں پر بیٹھے ہوئے کوؤں نے اپنی پناہ گاہیں چھوڑ دیں اور ساری کائنات جیسے ان کی مکروہ آوازوں سے بھر گئی تھی۔

چند لمحوں بعد سارے میں سناٹا پھیل گیا تھا۔ وہ سب پھٹی پھٹی نگاہوں سے کچی زمین پر پڑی لاش کو دیکھ رہے تھے۔

"یہ...... یہ کیا کر دیا۔"

پتا نہیں کس نے کہا تھا مگر رب نواز وہ پہلا شخص تھا، جس کے اعصاب نے پھرتی سے کام کرنا شروع کیا تھا۔ معاملے کی نزاکت کا احساس ہوتے ہی اس نے رجب علی کی طرف دیکھا، جو اب تک بے یقینی سے اس زخمی کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ آپ نے کیا کر دیا چھوٹے چوہدری جی....! چوہدری فیاض کا خاص بندہ مار دیا۔"

"مم...... میں...... میں نے نہیں...... مجھے نہیں پتا، یہ کیسے چل گئی۔" رجب نے ہڑبڑا کر ریوالور یوں چھوڑ دیا، جیسے اس پر کانٹے اگ آئے ہوں۔

"کوئی چوہدری صاحب کو تو خبر کرو۔" ان میں سے ایک نے چلا کر کہا تھا۔

"نہیں، پہلے چوہدری رجب کو پکڑو...... بھاگنے نہ پائے۔" دوسرا چیخا۔ تیسرا تیزی سے اس کی طرف لپکا لیکن اس سے قبل کہ رجب تک رسائی حاصل کر پاتا، رب نواز اس کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر تن گیا تھا۔

"کوئی چھوٹے چوہدری جی کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔" اس کا انداز جارحانہ تھا۔

"چھوٹے چوہدری جی! آپ نکلیں یہاں سے...... ان سب کو میں سنبھال لوں گا۔" اس نے تیز لہجے میں رجب

سے کہا تھا۔

"لیکن رب نواز....."

"آپ بھاگ جائیں چوہدری جی! وقت کم ہے۔"

رجب نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا اور حتی المقدور تیزی سے مخالف سمت نکل گیا اس بات سے بے خبر کہ وہ کسی جرم سے بچ کر نہیں بھاگ رہا بلکہ اس طرح منہ چھپا کر بھاگنے سے ایک ناکردہ جرم اپنے کھاتے میں لکھوا رہا ہے۔

✡ ✡ ✡

جنت بیگم ہکا بکا ان دونوں کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"کیا کہہ رہے ہو تم..... رجب نے چوہدری فیاض کا آدمی مار دیا؟"

"یہ..... یہ جھوٹ ہے۔" رجب کا پریشانی سے برا حال تھا۔

"میں نہیں جانتا گولی کیسے چلی اور اس آدمی کو لگ گئی۔" وہ تقریباً رو دینے کو تھا۔

"آپ کو غلط فہمی ہے چوہدری جی! آپ کی انگلی ٹریگر پر آئی تب ہی تو گولی چلی ناں....."

رب نواز نے زور دیتے ہوئے لیکن مؤدبانہ کہا تھا۔ اس کا سارا زور اسی بات پر تھا کہ کسی طرح بس یہ ثابت ہو جائے کہ جس وقت گولی چلی ریوالور اس کے بجائے رجب کے ہاتھ میں تھا اور اس مقصد کے لیے وہ ایڑی چوٹی کا زور بھی لگا رہا تھا۔

"کس طرح کی باتیں کر رہے ہو رب نواز!" رجب نے اپنے خوف کے زیر اثر چڑ کر کہا تھا۔ "میں تو تمہیں ریوالور نکالنے سے روک رہا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں خود اس پر فائر کروں؟"

"چوہدری جی....."

"تم دونوں خاموش ہو جاؤ بلکہ یہاں سے دفع ہی ہو جاؤ..... ایک ذرا سا کام نمٹانے بھیجا تھا' میرے لیے اور مصیبت کھڑی کر دی۔" جنت بیگم نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا تھا اور باقاعدہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

رب نواز مالکن کے مزاج کو بخوبی سمجھتا تھا۔ اسی لیے خاموشی سے باہر نکل گیا۔ یوں بھی وہ ساری صورت حال کو اپنے حق میں اور رجب کے خلاف کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ جنت بیگم کی نظروں میں رجب کی جو حیثیت تھی۔ اس سے تو وہ واقف ہی تھا' اس لیے پریشانی کسی قدر کم ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کندھوں سے بوجھ اتر گیا ہو۔ گو کہ رجب سے اس کی کوئی دشمنی نہ تھی بلکہ اس کی ہمدردیاں تو ہمیشہ ہی رجب کے ساتھ رہی تھیں لیکن اس وقت مسئلہ یہ تھا کہ اسے اپنا آپ بچانا تھا اور واحد مہرہ رجب ہی ہو سکتا تھا' سو اس نے بڑے آرام اور خود غرضی سے اس مہرے کو چل دیا تھا۔

رب نواز کے جانے کے بعد رجب' جنت بیگم کو وضاحتیں دینے لگا تھا لیکن جنت بیگم کو اس کی وضاحتوں سے کوئی غرض نہ تھی' اس کے نزدیک سب سے اہم سوال یہ تھا کہ بنا کسی اور مشکل کا شکار ہوئے اس صورت حال سے کیسے نمٹا جائے یعنی سانپ بھی مار دیا جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ وہ اسی سوچ کا شکار تھی اور رجب کی آواز اس کے ارتکاز کو بار بار توڑتی تھی۔

"تم یہاں سے دفع کیوں نہیں ہو جاتے۔" اس نے چیخ کر کہا تھا۔ رجب ایک دم چپ ہو گیا۔

"مجھے سوچ لینے دو کہ اب کیا ہو سکتا ہے۔ اچھی خاصی بنی بنائی ساکھ بگڑ کر رہ جائے گی۔ وہ چوہدری فیاض سر

چڑھے گا سو الگ..... اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہو گا رجب! اس کے لیے معاف نہیں کروں گی میں تمہیں۔ خدا گواہ ہے' جب بھی تم اس حویلی میں قدم رکھتے ہو' میرے لیے مشکلات کھڑی کرتے ہو۔"

جنت بیگم کا انداز نخوت بھرا تھا۔ رجب کے پاس اس کے سوا اب کوئی چارہ نہ تھا کہ چپ چاپ باہر نکل جائے۔

✡ ✡ ✡

"تم جھوٹ کیوں بول رہے ہو رب نواز! تم اچھی طرح جانتے ہو چوہدری فیاض کے آدمی پر گولی میں نے نہیں چلائی۔"

چند روز بعد تھک ہار کر رجب نے پھر رب نواز سے رابطہ کیا تھا۔ وہ اس ساری صورت حال سے بری طرح اکتا چکا تھا اور مشکل یہ تھی کہ اس سب سے بچ نکلنے کی اسے کوئی راہ بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ جنت بیگم ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کو ذلیل کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی تھی' اب تو پھر اس کے ہاتھ ایک مستقل بہانہ آیا ہوا تھا۔ تسلی کی بات یہ تھی کہ اس بات سے حویلی میں چند ہی لوگ واقف تھے۔ رجب کے لیے سہولت ہو گئی تھی کہ وہ خود پر لگے ہوئے الزام کو ثمینہ سے چھپا سکے۔ لیکن جتنا وہ اس مسئلے کا حل تلاش کرتا' اتنا الجھتا تھا۔

"میں آپ کا نوکر ہوں چوہدری جی!" رب نواز نے عاجزی سے کہا تھا۔ "میں غریب بھلا کیوں جھوٹ بولوں گا۔ حقیقت یہی ہے کہ بندوق آپ سے چلی اور گولی اس بندے کو لگ گئی۔"

"ریوالور بھلے ہی میرے ہاتھ میں تھا لیکن گولی کسی اور نے بھی تو چلائی ہو سکتی ہے۔" رجب کا انداز ایسا تھا جیسے اب ہمت ہار کر گرا کہ تب۔

"یہ کیسے ممکن ہے جی! جبکہ بندوق ہی وہاں صرف ایک تھی۔" رب نواز نے چوکنا ہو کر بات سنبھالی تھی۔

"آپ مانیں یا نہیں لیکن گولی آپ ہی سے چلی ہے....."

"نہیں رب نواز! مجھے اتنی بڑی غلط فہمی نہیں ہو سکتی....." رجب کے انداز میں بے چارگی تھی لیکن اس نے وثوق سے کہا تھا۔

اس کے اتنے اعتماد پر لحظہ بھر کے لیے رب نواز کا اعتماد ڈگمگا گیا' جسے اس نے فوراً سنبھالا تھا۔

"غلط فہمی ایک آدمی کو ہو سکتی ہے' دو کو ہو سکتی ہے لیکن اتنے بہت سے لوگوں کو تو غلط فہمی نہیں ہو سکتی ناں۔"

"دیکھو رب نواز!....."

"چھوٹے چوہدری جی! ہم تو غریب لوگ ہیں۔ ہم نے کیا دیکھنا دکھانا ہے۔ اچھا ہو گا' آپ یہ ساری باتیں بڑی چوہدرائن جی کو بتائیں۔" اس نے بظاہر اپنائیت سے لیکن نظریں پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہاری بات درست ہے لیکن صرف تم ہو جو میرے حق میں گواہی دے سکتے ہو۔" رجب نے یکدم کہہ کر رب نواز کے پیروں تلے سے گویا زمین کھینچی تھی۔

"کیا مطلب چوہدری جی!"

"مطلب صاف ظاہر ہے۔" رجب نے لجاجت سے کہا تھا۔ "صرف تم ہو جو حویلی میں سے اس وقت میرے ساتھ تھے۔ صرف تم جانتے ہو کہ میں بے گناہ ہوں..... تو میرے حق میں گواہی بھی تم ہی دے سکتے ہو ناں۔"

"بے شک میں آپ کے ساتھ تھا لیکن میں نہیں جانتا کہ آپ بے گناہ ہیں یا نہیں۔" رب نواز نے اب کی بار دو ٹوک کہا تھا۔ بے شک رجب نے اس پر بہت احسانات کیے تھے لیکن وہ یہ سمجھ گیا تھا مروت کے اس کھیل میں

بلاشبہ سب سے زیادہ نقصان وہ ہی اٹھائے گا۔ اس لیے یہی بہتر تھا کہ رجب کی ہر آس امید کو توڑ دیا جائے۔

"میں تو خود کہہ رہا ہوں کہ گولی آپ ہی سے چلی تھی..... ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ آپ اسے گولی مارنا نہ چاہتے ہوں لیکن وہ آدمی تو اپنی جان سے چلا گیا ناں..... میں اسی لیے آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ بڑی چوہدرائن سے بات کریں، صرف وہی ہیں جو آپ کو اس سارے معاملے سے بچا سکتی ہیں، ورنہ آپ جانتے ہیں چھوٹے چوہدری جی! ہم چھوٹے لوگوں کی کیا اوقات ہے۔"

رجب کی ہر آس پر پانی پھر چکا تھا۔ اس نے اتنی مایوسی کا سامنا زندگی میں شاید اس وقت بھی نہیں کیا ہوگا جب اسے حویلی سے بے یارومددگار نکلنا پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ درست ہے کہ جس وقت ریوالور سے گولی نکلی اور چوہدری فیاض کے آدمی کو اس نے گھائل کیا، ریوالور رجب کے ہاتھ میں تھا لیکن ٹریگر پر دباؤ ڈالنے والی انگلی رب نواز کی تھی اور یہ بات صرف رب نواز ہی جانتا تھا۔

اس کا خیال تھا، وہ اپنا جرم رجب کے سر ڈال کر مطمئن ہو بیٹھے گا لیکن یہ محض اس کی خام خیالی تھی۔ اگر اسی طرح انسان نے مطمئن ہونا ہوتا تو ضمیر نام کی کسی چیز کا وجود اس دنیا میں نہ ہوتا یا کم سے کم اس کا ذکر نہ ہوتا۔

صرف دو ہفتوں بعد جب یہ طے پا چکا کہ رجب کو پولیس کے یا چوہدری فیاض کے حوالے کر دیا جائے گا تو رب نواز اچھا خاصا مطمئن ہو گیا لیکن اسی رات سے اس کے ضمیر نے اسے جھنجھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے پہل تو وہ اس منحوس ضمیر کی بے تکی آوازوں پر کان ہی نہیں دھر رہا تھا پھر اس نے اسے حتی المقدور ٹالا بھی لیکن نتیجہ وہی صفر کا صفر۔

تھک ہار کر رب نواز نے اپنا گناہ تسلیم کرنے کا سوچا گو کہ یہ فیصلہ کرنا بھی بڑی دقتوں کی بات تھی۔ اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور ایک ہی بیٹی تسنیم تھی۔ کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہیں تھا کہ تسنیم کو اس کے حوالے کر جاتا۔ اپنا جرم تسلیم کرنے میں اگر کوئی دقت تھی تو وہ تسنیم کا وجود تھا، جو اس کی راہ میں حائل ہوتا تھا اور حتمی فیصلہ کرنے نہ دیتا تھا۔ وہ ہر رات تہیہ کرتا کہ اگلے روز اسے جنت بیگم کو حقیقت حال سے آگاہ کرنا ہے اور اگلے دن کا سورج طلوع ہوتے ہی اس کے ارادے ڈگمگا جاتے تھے۔

لیکن پھر ایک روز اس نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا ہی دیا اور جنت بیگم کے سامنے جا کر اپنا گناہ قبول کر لیا۔ اس وقت وہ باقاعدہ کانپ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ متوقع سزا کا خیال ہی اس کی آدھی جان نکال چکا تھا۔

جنت بیگم الگ ششدر۔ آخر معاملہ کیا ہے۔ کون سچا ہے کون جھوٹا۔

"مجھے معاف کر دیں چوہدرائن جی! بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے جو اپنا جرم چھوٹے چوہدری جی کے سر ڈالا۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں نے پہلے بھی سوچا کہ آپ کو ساری حقیقت بتا دوں لیکن ہر بار شیطان بھٹکا دیتا تھا اور درست فیصلہ نہ کرنے دیتا تھا..... مجھے معاف کر دیں جی..... اور مجھے سزا سے بچا لیں۔ میری چھوٹی سی بچی ہے۔ میں اسے کس کے بھروسے چھوڑ کر جاؤں گا چوہدرائن جی.....! مجھے بچا لیں جی.....!" وہ روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔

جنت بیگم نے چند منٹ سوچنے میں صرف کیے پھر گہری نظروں سے اسے دیکھ کر بولی۔

"اس بات سے کون کون واقف ہے؟"

"جی! میں سمجھا نہیں۔" سوال اس کے سر سے گزر گیا تھا۔

"اس میں نہ سمجھنے کی کیا بات ہے جاہل آدمی!" جنت بیگم حسب معمول غصے سے بولی۔

"میں پوچھ رہی ہوں، تم نے یہ بات کہ چوہدری فیاض کے آدمی کا قتل رجب سے نہیں بلکہ تم سے ہوا ہے۔ کس کس کو بتائی ہے؟"

"کسی کو نہیں چوہدرائن جی! اتنی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی کہ کسی کو بتا سکتا۔" رب نواز نے لاچاری سے کہا تھا۔

"ہوں۔" جنت بیگم کا انداز اس بار بھی پرسوچ تھا۔ "اب میری بات غور سے سنو رب نواز! بھول جاؤ اس روز جو بھی ہوا تھا۔ بھول جاؤ کہ ریوالور تمہارے ہاتھ میں تھا۔"

"جی!....." رب نواز حیران پریشان اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"ہاں رب نواز! بھول جاؤ کہ تم سے کوئی قتل ہوا ہے اور اپنی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر لو..... یاد رکھنا! جب تک تمہاری زبان بند رہے گی تب تک تم اور تمہاری بیٹی کی حفاظت اور کفالت کی ذمہ داری میری ہوگی لیکن اگر تمہاری زبان کسی کے سامنے بھی کھلی حتی کہ رجب کے سامنے بھی..... اس دن سے میری ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔ پھر تم جانو اور تمہارا کام..... تمہیں حویلی میں رہائش دی جائے گی، روٹی، کپڑا ہر طرح کی ضروریات زندگی فراہم کی جائے گی..... باقی فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔ اچھی طرح سوچ لو پھر مجھے بتا دینا..... یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے فائدہ بہرحال تمہارا ہی ہوگا۔"

"لیکن..... چوہدرائن جی! چھوٹے چوہدری جی..... میرا مطلب ہے وہ تو ناحق مارے جائیں گے۔" رب نواز کے آنسو تھم چکے تھے، اس سے آگے تعجب اور بے یقینی کی منزل تھی۔

"اس کا معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تمہارا کام اپنا جرم قبول کرنا تھا سو تم نے کر لیا۔ اب میں جانوں اور میرا کام..... رجب بچتا ہے یا ناحق مارا جاتا ہے، اس سے تم کو کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے..... تم صرف اتنا بتاؤ تمہیں یہ سودا منظور ہے یا نہیں؟"

اس لمحے جنت بیگم اسے بے حد سفاک لگی تھی لیکن چونکہ سودا واقعی مہنگا نہیں تھا، سو اس کا سر نیم رضامندی سے اثبات میں ہل گیا تھا۔ خدا جانے کون زیادہ سفاک تھا جنت بیگم یا وہ خود۔

☼ ☼ ☼

رسم مہندی تھی یا رنگوں کا میلہ سا لگ گیا تھا۔

آرائشی قہقہوں سے سجی حویلی میں رنگ ہی رنگ بکھرے تھے۔ حرم زرد جوڑے میں سمٹی سمٹائی، شرمائی گھبرائی سی اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ بے ساختہ بلائیں لینے کو دل چاہ رہا تھا۔ باقی لڑکیاں بھی بڑے دل سے تیار ہوئی تھیں سب کی چھب ایک دوسرے سے بڑھ کر تھی۔

تنوی سب سے منفرد لگ رہی تھی کیونکہ کبھی اس طرح سے بنی سنوری نہ تھی۔ سب نے سراہا۔ جنت بیگم نے اکلوتی نواسی کے سر سے مرچیں وار کر جلانے میں بھی تاخیر نہیں کی۔ تنوی اپنی تعریفوں پر خوش تھی، جتنی بار شبیہہ سے سامنا ہوا، توقع کرتی رہی وہ بھی کچھ کہے گا لیکن شبیہہ وہ پتھر تھا، جس کے سینے پر پانی کے قطرے ٹپکتے رہنے کے باوجود ابھی سوراخ ہونے میں وقت لگتا تھا۔

وہ مایوس ہو کر تھک گئی تو دو تعریفی جملوں کی آس بھی ترک کر دی۔ سوئے اتفاق اسی وقت شبیہہ کی نظر اس پر پڑ

گئی۔

تھا تو سچ مچ پتھر لیکن اس بار چونک سا گیا۔ وہ لگ ہی اتنی منفرد اور خوب صورت رہی تھی کہ لحظہ بھر کو تو یقین ہی نہ آیا کہ یہ وہی جھلی سی لڑکی ہے، جس کے معمولی معمولی باتوں پر آنسو نکل آتے ہیں۔ جسے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے سے زیادہ رغبت صرف رونے اور منہ لٹکا کر رکھنے سے تھی۔

آج خوب چہک رہی تھی۔ شبیہہ کی نظریں اس پر سے ہٹ کر نہ دیں۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" جلال نے بروقت اس کی چوری پکڑی تھی۔ شبیہہ نے سٹپٹا کر نظریں پھیر لیں۔

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے صاف مکرتے ہوئے کہا تھا۔ جلال چڑانے والے انداز میں خوب زور سے ہنس دیا۔

"یار! اب ہم سے کیا پردہ داری۔"

شبیہہ نے گھور کر اسے دیکھا۔ "مطلب کیا ہے؟"

"آئے ہائے..... جیسے تم تو جانتے ہی نہیں۔" جلال چہکا۔

شبیہہ کا موڈ حسب سابق ذرا بھی نہ بدلا۔ یوں بھی بہت سے معاملات میں وہ خود کو لاتعلق ظاہر کرنے کے لیے یوں ہی خود پر غصے کا پردہ ڈالے رکھتا تھا اور یہ عادت کوئی نئی نہ تھی کہ جلال سمجھ ہی نہ پاتا۔ وہ تو اسے بچپن سے جانتا تھا سو ذرا بھی پروا نہ کی۔

"اس میں غصہ کرنے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اچھی لگ رہی ہے تو بتا دو اسے۔ وہ بے چاری بھی خوش ہو جائے گی۔"

"تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔ تمہارے مشوروں پر عمل کرنے لگا تو بس کر چکا عقل مندی کے کام۔"

"ٹھیک ویسے ہی جیسے تم کر چکے ہو۔" اس کا انداز کاٹ دار تھا۔

"محبت میں عقل کا کیا کام میرے بھائی!" جلال آج کچھ زیادہ ہی چہک رہا تھا۔ "ویسے اگر تم کہو تو میں بی جان سے بات کروں۔ گھر کا لڑکا گھر کی لڑکی..... نہ کوئی جھنجٹ نہ پریشانی..... حرم کی رخصتی کے بعد تم لوگوں کی نیا بھی پار لگ جائے گی۔"

وہ اپنی طرف سے بڑا مخلص بنا مشورے دے رہا تھا مگر شبیہہ نے غضب ناک ہو کر گھورا۔

"مجھے ضرورت ہوگی تو بی جان سے خود بات کرلوں گا۔ تمہاری طرح کوئی اوٹ پٹانگ کام نہیں کروں گا۔"

"اوٹ پٹانگ کام؟..... اچھا..... چھا..... مثلاً "کون سا اوٹ پٹانگ کام؟" وہ جانتے بوجھتے انجان بنا۔

"آئے ہائے..... جیسے تم تو جانتے ہی نہیں۔" شبیہہ نے اسی کا جملہ لوٹا دیا۔ جلال ایک بار پھر زور سے ہنس دیا۔

"تم نے کبھی محبت نہیں کی نا۔ جس روز کرو گے سب سمجھ میں آجائے گا کہ محبت میں کچھ بھی اوٹ پٹانگ نہیں ہوتا۔ صرف عمل ہوتا ہے جو محبوب کو مشکل میں دیکھ کر خود بخود سرزد ہو جاتا ہے۔ دل چاہتا ہے' اس کی پریشانیاں سمیٹ لی جائیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آنے دیے جائیں اور....."

جلال نے ایک جذب کے عالم میں بولتے ہوئے شبیہہ کی طرف دیکھا۔ وہ غضب ناک نظروں سے اسے گھور رہا تھا جیسے اس کی کم عقلی پر بھڑک اٹھا ہو۔ جلال ذرا سا جھینپا' پھر ہولے سے ہنسا اور یکایک اس کی ہنسی خوش دل قہقہے میں بدل گئی تھی۔

شبیہہ کے غصے میں اضافہ ہوا تھا لیکن صاف محسوس ہوتا تھا کہ محبت نے جلال کو بدل کے رکھ دیا ہے۔ وہ سر جھٹکتا دوسری طرف چلا گیا تھا' یوں جیسے اب جلال سے کسی عقل مندی کی امید عبث ہو۔

جلال کی متبسم نگاہیں ماوی کو تلاش کرنے لگی تھیں۔ یکایک اسے احساس ہوا کہ وہ بہت دیر سے دکھائی نہیں

دے رہی۔ آخر وہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ جلال کو تشویش نے گھیر لیا۔ اس کی نظریں مزید شدومد سے ماوی کو تلاش کرنے لگی تھیں۔



"ڈیڈی! کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ممی کو واپس لے آئیں؟"

ڈائننگ ٹیبل پر انیبا نے ولی کے اٹھ جانے کے بعد دانیال حسن سے اچانک پوچھا تھا۔ وہ بڑی دیر سے تذبذب کا شکار تھی کہ آیا کہ اسے ڈیڈی سے بات کرنا بھی چاہیے یا نہیں۔ پھوپو کی موجودگی بھی معنی رکھتی تھی۔ ولید نے تو خیر ڈائننگ ٹیبل پر آنا ہی چھوڑ رکھا تھا جبکہ ولی بے چارہ دن بہ دن خاموش سے خاموش تر ہوتا جا رہا تھا۔ انیبا کو ڈر تھا کہیں وہ بھی ولید کی طرح کسی غلط سرگرمی میں نہ پڑ جائے۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی اس کے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں تھا جن کے ہاتھ میں سب کچھ تھا وہ چپ سادھے بیٹھے تھے۔

ناچار انیبا نے ایک آخری کوشش کرنے کی ٹھانی گو کہ پہلے بھی ایک ایسی ہی کوشش میں منہ کی کھا چکی تھی' پھر بھی اس نے ہمت کر کے دانیال حسن سے کہہ ہی دیا۔

دانیال حسن نے صبح کے اخبار سے نظریں ہٹا کر قدرے تعجب سے اسے دیکھا تھا۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ دوبارہ اس ایشو پر کوئی بات نہیں ہوگی۔" دانیال حسن نے سنجیدہ لہجے میں اس کو یاد دلایا تھا۔

"کیوں ڈیڈی!" وہ روہانسی ہو کر بولی۔ "اسی ایشو پر بات ہونا سب سے ضروری ہے' آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں۔"

"تو پھر اپنی ماں سے کہو۔ آنا ہے تو خود واپس آئے۔ تمہیں مہرہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔" دانیال حسن کا لہجہ سخت ہی نہیں ناگواری لیے ہوئے بھی تھا۔ انیبا دم بخود رہ گئی۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ ممی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔"

"میں اچھی طرح جانتا ہوں کس نے کیا کہا' کس نے کیا نہیں۔" دانیال حسن نے سلگ کر کہا۔

"لیکن یہ طے ہے کہ میں ثروت کو لینے نہیں جاؤں گا اسے آنا ہے تو خود آئے۔ یہاں سے جانے کا فیصلہ بھی اس کا اپنا تھا واپس آنے کا فیصلہ بھی اسے خود ہی کرنا ہوگا۔ بتا دینا اسے۔" دانیال حسن نے اخبار تہ لگا کر میز پر پٹخا

اور اٹھ کر چلے گئے۔

انیبا مایوسی سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

رب نواز نے جنت بیگم سے خود کو سزا سے بچانے کی استدعا کی تھی لیکن چونکہ جنت بیگم اپنے نام کی طرح منفرد تھی اور اسے ہمیشہ سے کچھ نہ کچھ منفرد کرتے رہنے کا شوق بھی تھا' خواہ وہ کسی کی زندگی کا سکون برباد کرنا ہی کیوں نہ ہو اس لیے اس نے نہ صرف رب نواز کو بچالیا تھا بلکہ رجب کا نام بھی اس کیس سے بڑی صفائی کے ساتھ خارج کروالیا گیا تھا۔

گو کہ جنت بیگم کے اپنے باپ کی زندگی میں آجانے کے بعد سے ہی رجب کو اپنی زندگی کا تاوان ادا کرنا پڑتا رہا تھا لیکن اس احسان کے بعد رجب جب تک زندہ رہا' اسے اس احسان کا کفارہ ادا کرنا پڑتا رہا۔

✡ ✡ ✡

تسنیم کے خاموش ہوتے ہی ماوی کا انہماک بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی نظریں تسنیم کے چہرے سے ہٹ کر چارپائی پر لیٹے رب نواز کے وجود سے لپٹ گئی تھیں لیکن اس کا ذہن اس وقت بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ آج انکشافات کی ایک اور رات اس کی زندگی میں در آئی تھی اور ہر بار جب اپنے باپ سے متعلق کسی انکشاف کا سامنا اسے کرنا پڑتا تھا' وہ اسی طرح پہلے بے یقین اور پھر گم صم ہو جاتی تھی۔

"کیا اس شخص کو دوبارہ کبھی ضمیر کی سرزنش کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہوگا۔" رب نواز کے ضعیف' بے بس وجود کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

"پھر....." معاً" اس نے تسنیم کی طرف رخ پھیرا۔ "خاموش کیوں ہو گئی ہو تسنیم! مجھے بتاؤ پھر کیا ہوا تھا؟" وہ اپنی عادت کے برخلاف بے حد سنجیدہ اور مغموم دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا تمہارے ابا کو دوبارہ کبھی ضمیر کی اس آواز نے تنگ نہیں کیا جس نے ان سے جنت بیگم کے سامنے اعتراف جرم کروایا تھا؟" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا انداز کاٹ دار ہو گیا تھا۔

"ضمیر کی آواز نے تنگ نہ کیا ہوتا تو کیا آج ابا اس حال میں ہوتے؟" تسنیم نے گردن موڑ کر بوڑھے رب نواز کو ترحم بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جب انسان اندر کی آوازوں سے بہت تنگ آجاتا ہے ناں بی بی! تب ہی اس حال کو پہنچتا ہے۔ ایسے جیسے دیمک لکڑی کو چاٹ گئی ہو۔ بالکل بے کار سا ہو جاتا ہے۔ آپ نے تو آج میرے ابا کو دیکھا ہے ناں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے' ابا کو ایسے ہی دیکھ رہی ہوں۔ اچانک بیٹھے بیٹھے گم صم ہو جاتے ہیں یا اچانک خود سے باتیں کرنے لگتے ہیں..... مجھے نہیں یاد کہ میں نے انہیں کبھی اس سے زیادہ ہوش میں دیکھا ہو۔"

تسنیم کے لب و لہجے میں تاسف بولتا تھا۔ کرب کی تحریر اس کے چہرے پر صاف پڑھی جاتی تھی۔ ماوی کو ذرا سی شرمندگی نے گھیرا لیکن مقابل اس کے اپنے بابا تھے اور بے قصور بھی تھے' سو زیادہ ہمدردی ان کے ساتھ تھی۔

"خیر تم مجھے اس سے آگے کی بات بتاؤ....." اس نے جلدی سے کہا تھا۔

"بی بی! اس سے آگے تو....." ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر کے گھور سناٹے میں کھٹکا سا ہوا۔ وہ دونوں چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگیں۔ دل بے ڈھب انداز میں دھڑکنے لگے تھے۔

"مجھے پہلے ہی ڈر تھا کوئی آنہ جائے۔" تسنیم نے سراسیمگی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"گھبرانے کی کیا بات ہے کوئی آبھی گیا تو میں سنبھال لوں گی۔"

ماوی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ یہ الگ بات کہ گھبرا وہ بھی گئی تھی۔ ساتھ ہی وہ اٹھ کر دروازے کی طرف جانے لگی تو تسنیم نے پھرتی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا۔

"آپ رکیں۔ پہلے میں جا کر دیکھتی ہوں' میری یہاں موجودگی حیران کن نہیں ہے لیکن آپ کو یہاں دیکھ کر کوئی بھی چونک جائے گا۔" اس نے کہا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ ماوی بھی پھرتی سے اس کے پیچھے آئی تھی۔

ان دونوں کے دل بہت تیزی سے دھڑک رہے تھے۔

✡ ✡ ✡

"ممی! کیا یہ ممکن ہے کہ آپ خود واپس آجائیں؟"

انیبا نے ذرا سے گھماؤ کے ساتھ یہی سوال ثروت کے سامنے بھی رکھ دیا تھا۔

"نہیں یہ ممکن نہیں ہے۔" ثروت نے گہری سانس بھر کر فون ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

انیبا کی اس آخری امید پر بھی پانی پھر گیا جس کے سہارے اس نے ثروت کو فون کیا تھا۔

"لیکن آپ نے کہا تھا آپ آجائیں گی۔" اس نے یاد دلایا۔

"میں اتنے دن سے ہمت ہی جمع کر رہی ہوں! لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں نہیں کر پا رہی۔" ثروت نے بے بسی سے کہا۔

"اس طرح واپس آؤں گی تو دانیال کے ہاتھ ایک اور کمزوری لگ جائے گی۔ وہ مجھے ٹیز کرنے کا ایک اور بہانہ ڈھونڈ لیں گے۔ سمجھنے کی کوشش کرو میرے بچے! میں بہت مجبور ہوں۔ کئی سال میں نے اپنی انا کو مارے رکھا' دانیال کا ہر طعنہ ہنس کر سہہ گئی لیکن اب مجھ میں اور ہمت نہیں ہے۔"

"کیا آپ اپنی اولاد کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتیں؟" وہ ماں کا درد محسوس کرنے کے باوجود خود کو بے بس پاتی تھی۔

"دانیال کے ساتھ مسلسل بے عزتی سہتے ہوئے اتنے سال صرف اولاد کے لیے ہی گزارے ہیں میں نے۔" ثروت نے سابقہ بے بسی کے ساتھ کہا۔

"لیکن ہمیں آپ کی ضرورت ہے ممی!" انیبا رو دینے کو تھی۔

ثروت سے کچھ بولا نہیں گیا۔ انیبا کی بات ماننے میں سراسر ان کی نسوانیت کی توہین تھی اور بیٹی کی آواز میں جھلکتا درد بھی سہا نہ جاتا تھا۔

"آپ جانتی ہیں کہ ولید آج کل کن ایکٹویٹیز میں پڑا ہوا ہے....." بالآخر اس نے ماں کو حقیقت بتانے کی ٹھان لی تھی۔

"کک..... کیا کہہ رہی ہو تم۔" ثروت حقیقتاً" پریشان ہو گئی تھیں۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔" اس نے آنسوؤں سے بوجھل آواز میں کہا تھا۔ "اور وہ اتنا بدلحاظ ہو چکا ہے کہ کوئی بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔"

"مم..... میں اس سے بات کرتی ہوں۔" ثروت نے کہا۔

"ممی! صرف اس سے بات کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ آپ کو یہاں آنا پڑے گا۔" اس کا لہجہ اس بار تیز تھا۔ ماں باپ میں سے کوئی بھی تو اس کی بات سمجھنے پر تیار نہیں ہو رہا تھا۔

"مجھے ایک بار بات کر لینے دو! وہ سمجھ دار ہے۔ مجھے یقین ہے میری بات سمجھ لے گا۔" ثروت کی طرح انیبا خوش امید نہیں تھی، سو مایوسی سے اس نے فون رکھ دیا۔

✡ ✡ ✡

جس طرح شبیہہ کی چوری جلال کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی تھی ٹھیک ویسے ہی جلال کی متلاشی نظروں نے تنوی کو چوکنا کر دیا تھا۔ وہ یوں بھی متجسس تھی اور ان دونوں کی ٹوہ میں لگی ہوئی تھی کہ کوئی موقع ہاتھ لگے اور ان دونوں کو گھیرے۔ یہ الگ بات ہے کہ تقریب کی رنگا رنگی بار بار اس کی توجہ بھٹکا دیتی تھی۔ ایسے ہی کسی وقت میں ماوی غائب ہو گئی اور اب جلال کی نظریں مستقل اسے کھوج رہی تھیں۔

"کسی کو ڈھونڈ رہے ہیں جلال بھائی!" عین اس لمحے جب وہ ماوی کو نہ پا کر پریشان ہونے لگا تھا، تنوی نے اسے جا لیا۔

"نہیں بھئی۔ میں نے کسے ڈھونڈنا ہے۔" جلال نے سٹپٹا کر کہا۔

"اچھا..... مجھے لگا کسی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔" وہ شرارت سے بولی۔

"ارے نہیں بھئی۔" جلال نے ٹالا پھر کچھ خیال آنے پر پوچھ ہی لیا۔

"سنو! ماوی نظر نہیں آ رہی، بہت دیر سے..... تم نے اسے دیکھا ہے کہیں؟"

"اچھا تو یوں کہیں نا کہ آپ ماوی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔" اس نے پھر آنکھیں مٹکا کر کہا۔

"بھئی میں اسے کیوں ڈھونڈنے لگا۔ وہ تو بس، بہت دیر سے نظر نہیں آ رہی تھی تو تم سے پوچھ لیا۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"نظر تو بہت دیر سے نمل بھی نہیں آ رہی۔ اس کے بارے میں تو نہیں پوچھا۔" وہ بھی آج بال کی کھال اتارنے پر تلی تھی۔ جلال حیران ہوا۔

"وہ تو گھر کی فرد ہے، ماوی کی طرح مہمان تو نہیں کہ حویلی کی بھول بھلیوں میں گم ہو جائے گی۔"

"اچھا جی..... صرف یہی بات ہے کیا؟"

"معاف کر دو تنوی! جو تم سے پوچھنے کی غلطی کر بیٹھا۔" جلال نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے اور دوسری طرف چلا گیا۔ تنوی شرارت سے ہنسی اور نمل کی تلاش میں دوڑی۔ بڑی کھوج کے بعد وہ حرم کے پہلو سے چپکی ملی۔

"یعنی تم اب ان دونوں کی جاسوسی کرو گی؟" نمل نے اس کے ارادے جان کر پوچھا۔

"صرف میں نہیں..... بلکہ ہم دونوں۔" تنوی نے جیسے اسے باور کروایا تھا۔

"مجھے تو معاف کر دو بھئی۔" نمل نے بیزاری سے کہا تھا۔ "جلال بھائی کی بزدلی سے اچھی طرح واقف ہوں اس لیے تمہاری بات پر یقین نہیں آ رہا کہ وہ پسند کی شادی کرنے جیسی بہادری کر سکتے ہیں۔ ہاں! یہی بات کوئی شبیہہ کے بارے میں کہے تو میں فوراً یقین کر لوں گی۔"

"اسی لیے تو تم سے کہہ رہی ہوں میرے ساتھ چلو۔ آج سب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔" حرم اور نمل زور سے ہنس دیں۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے حرم آپا! آپ اس سے کہیں ناں....." وہ برا مان گئی تھی۔

"نمل ٹھیک کہہ رہی ہے تنوی!" حرم نے کہا۔ "اور یہ تم جا کہاں رہی ہو ادھر آؤ۔" اسے منہ بسور کر جاتا دیکھ حرم نے ڈپٹ کر کہا۔

"میں جا رہی ہوں، جو کرنا ہے اب خود ہی کر لوں گی۔"

"خبردار! جو کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو..... ورنہ میں ابھی بی جان سے تمہاری شکایت کر دوں گی۔ کسی بات کا اثر نہیں تم پر..... خدا معلوم شبیہہ اور جلال میں کیا بات ہو رہی تھی اور تم کیا سمجھ بیٹھیں..... اب بے وجہ کوئی اوٹ پٹانگ حرکت کر کے بات کا بتنگڑ نہ بناؤ..... تمہیں تو کوئی کچھ نہ کہے گا، میرا بھائی پھنس جائے گا۔"

حرم نے خوب لتاڑا۔ تنوی برا مان گئی۔

"ہاں جیسے جلال بھائی میرے تو کچھ لگتے ہی نہیں ناں۔"

"یہ کس نے کہا؟"

"تو آپ کی بات کا اور کیا مطلب ہے..... اونہہ....."

"اچھا غصہ تھوک دو۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔" حرم نے مصلحت آمیزی سے کہا۔

"جی نہیں..... اب تو جو آپ نے کہنا تھا کہہ دیا، میں بھی ثابت کر کے دکھاؤں گی کہ جو میں کہہ رہی ہوں وہی سچ ہے۔ جلال بھائی نے ماوی سے نکاح کیا ہوا ہے، پھر آپ دونوں کو پتا چلے گا..... اور جو کرنا ہے وہ بھی میں اکیلی کر لوں گی۔ نہ دیں آپ دونوں میرا ساتھ۔"

وہ اٹھ کر تیزی سے اس طرف چلی گئی جس طرف جلال کو جاتے دیکھا تھا۔ حرم پکارتی ہی رہ گئی۔

"یا اللہ! اس لڑکی کو عقل دے۔ کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی کر دے یہ۔"

"چھوڑو حرم آپا! اس بونگی نے کیا کر لینا ہے۔" نمل نے بیزاری سے کہا تھا۔ حرم محض سر ہلا کر رہ گئی۔

✡ ✡ ✡

"ماوی میری کال ریسیو نہیں کر رہی۔" ایئر پیس پر ابھرنے والی آواز میں گو کہ اشتعال نمایاں تھا لیکن اس آواز نے ثمینہ کو اچھا خاصا سکون فراہم کیا تھا۔

"آپ نے مجھے اس کا کانٹیکٹ نمبر غلط دیا ہے ناں آپا؟" فیضان نے سابقہ انداز میں پوچھا تھا۔

"میں ایسا کیوں کروں گی؟"

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔" فیضان نے تیز لہجے میں کہا۔

"تم مجھ سے اتنے بدگمان کیوں ہو گئے ہو فیضان! کہ میری کسی بات پر یقین ہی نہیں کر رہے۔" ثمینہ کے لہجے میں دکھ بولا۔

"میں آپ سے بدگمان نہیں ہوں لیکن آپ کی کسی بات کا اعتبار بھی نہیں رہا مجھے اور ایسا کیوں ہے اب پلیز یہ مجھ سے مت پوچھیے گا کیونکہ آپ سب جانتی ہیں۔ انسان امیچور ہو، کم عقل ہو تو چلو اس سے ایسی بے وقوفی کی توقع بھی کی جائے۔ آپ نے تو بالکل ہی حد کر دی۔"

"بس اب باتیں سناتے رہو مجھے۔ تم میری فیلنگز سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ کئی سال میں نے اس آس میں گزار دیے کہ جنت بیگم کو سزا دلواؤں گی۔"

"اور اپنے اس شوق کے لیے کس خود غرضی سے اپنی ہی اولاد کو آپ نے خطرے کے منہ میں دھکیل دیا۔" فیضان نے بے رحمی سے کہا۔

"صرف اس لیے کہ میرے بھائیوں کو میرا اتنا بھی احساس نہیں تھا کہ وہ میرے لیے کچھ کرتے۔"

ثمینہ نے ایک پل میں ان کی اور فیاض بھائی کی ساری ریاضت خاک میں ملادی۔ فیضان نے اپنے دل میں اشتعال کو ابھرتے محسوس کیا' جسے اگلے ہی پل لیکن بڑی دقتوں سے دبالیا اور استہزا ابھرے لہجے میں بولے۔

"مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے آپا! کہ آپ نے اپنے ذہن میں جو دنیا تخلیق کر رکھی ہے اس میں سب ظالم ہیں سوائے آپ کے۔ عقل پر صرف آپ کی اجارہ داری ہے باقی سب عقل سے پیدل ہیں۔ کاش کہ مجھے کچھ عرصہ پہلے آپ کی ذہنی حالت کا اندازہ ہو گیا ہوتا تو میں آپ کو یوں ہر گز ماوی کو خطرات کے منہ میں نہ دھکیلنے دیتا۔ اب مہربانی فرما کر مجھے فوراً" سے پیشتر اس کا درست کانٹیکٹ نمبر دے دیں۔ ورنہ میں اسی وقت حویلی پہنچ جاؤں گا اور پھر جو ہو گا اس کے نتائج آپ کو خود ہی بھگتنا پڑیں گے۔"

ثمینہ کو فیضان کی ساری باتیں بری لگیں لیکن ان کے لہجے میں سنگینی تھی اور ثمینہ کو یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں وہ سچ مچ حویلی نہ پہنچ جائیں سو مصلحت آمیزی کے ساتھ وضاحتی لہجے میں بولیں۔

"میں جھوٹ نہیں کہہ رہی فیضی! میں نے بالکل درست نمبر تمہیں دیا تھا۔ ممکن ہے ماوی کہیں مصروف ہو؟" انہوں نے خیال ظاہر کیا۔

"اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے اسے میرا فون ریسیو کرنے سے منع کر دیا ہو۔"

ثمینہ فوری طور پر کچھ بول نہ سکیں۔

"کیوں ٹھیک کہا ناں میں نے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" ثمینہ نے تحمل سے کہا۔ "مجھے یقین ہے ماوی مصروف ہو گی کیونکہ حویلی میں کسی فنکشن کا ذکر کیا تھا اس نے۔ شاید کسی کی شادی ہے۔ تم اس کا نمبر ٹرائی کرتے رہو' وہ جب بھی فارغ ہوئی تم سے بات کر لے گی۔"

"ٹھیک ہے میں ایک بار پھر آپ کی بات کا یقین کر لیتا ہوں لیکن بہتر ہو گا کہ آپ اسے مجھ سے بات کرنے کی تاکید کر دیں۔"

فیضان نے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ ثمینہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔ وہ تو جس مشکل سے نکلنے کی کوشش کرتی تھیں اور زیادہ اس میں پھنستی جا رہی تھیں اور یہ بات ان کے لیے بے حد جھنجھلاہٹ کا باعث بن رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

تسنیم نے آہستگی اور احتیاط سے ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں بلی کی سی چمک اور تیزی تھی' تب ہی اندھیرے سے مانوس ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ اس نے پہلے دروازے کی جھری بنا کر باہر جھانکا پھر ماوی کو وہیں رکنے کا اشارہ کرتی باہر نکلنے لگی تو ماوی نے سرعت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟"

"آپ یہیں رکیں بی بی! میں باہر اچھی طرح دیکھ کر آتی ہوں' کیا پتا کوئی تاک میں ہو۔" تسنیم نے آواز دبا کر کہا۔

"لیکن....." ماوی نے خائف نظروں سے رب نواز کی طرف دیکھا جو چارپائی پر لیٹا اس وقت اپنی چنی منی آنکھیں کھولے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"ڈریں نہیں بی بی! ابا جتنے بھی بیمار سہی لیکن حملہ نہیں کرتے۔"

"بے وقوف..... یہ بات نہیں ہے۔" ماوی بری طرح شرمندہ ہو کر بولی تھی۔

"تو پھر....." تسنیم حیران بھی ہوئی اور اکتائی بھی کہ ماوی مسلسل اسے دیر کروا رہی تھی اور اس دوران اگر واقعی کوئی باہر تھا تو اندر آنے میں اسے کتنی دیر لگ سکتی تھی۔

"پھر..... وہ ایکچوئیلی....." ماوی جانے کیوں تذبذب کا شکار تھی۔

"بی بی! مجھ پر بھروسا کریں۔ میں یوں جاؤں گی اور یوں واپس آجاؤں گی۔"

تسنیم یقیناً" اس کے خدشات بھانپ گئی تھی تب ہی تسلی دینے والے انداز میں اس کا اپنے کندھے پر رکھا ہاتھ دبا کر بولی۔ ماوی نے لحظہ بھر کو سوچا اور اپنا ہاتھ اس کے بازو سے ہٹا لیا۔ تسنیم پھرتی سے باہر نکل گئی۔ دروازہ البتہ اس نے نیم وا رہنے دیا تھا' یوں کہ ماوی تو باہر جھانک سکے لیکن کسی کی اندر تک نظر نہ پڑنے پائے۔

ذرا دیر بعد تسنیم واپس آگئی تھی۔ ماوی نے یہ چند منٹ بڑے صبر اور دقت سے گزارے تھے۔

"بلی بدذات نے کچا گرا دیا تھا۔" تسنیم نے آتے ہی خوش ہو کر بتایا تھا۔ "لیکن آپ فوراً" یہاں سے نکلنے کی کریں۔ ہمیں تو باتیں کرتے ہوئے وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہو سکا اور کچھ نہیں تو کم سے کم دو تین گھنٹے گزر ہی چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے اگلی طرف آپ کی تلاش بھی شروع ہو گئی ہو گی۔"

"نہیں خیر..... اتنے لوگوں میں کسی کو میری کمی کیا محسوس ہوئی ہو گی۔" ماوی نے وثوق سے کہا لیکن اس کے باوجود اپنا غرارہ اور دوپٹا آگے پیچھے سے سمیٹتے ہوئے دروازے کی طرف چل دی تھی۔

"سنو تسنیم!" دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رکی۔ "موقع ملتے ہی تمہیں مجھے باقی بات بتانی ہو گی....."

اس نے آگے تسنیم کا جواب سننے کی بھی زحمت گوارا نہ کی تھی اور تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ تسنیم چند منٹ رک کر احتیاط سے تالا بند کرنے لگی۔

ماوی اونچی ایڑی کے ساتھ احتیاط لیکن پھرتی سے چلتی حویلی کے اندرونی حصے کی طرف جا رہی تھی۔ محتاط انداز میں ارد گرد نظریں ڈالتے ہوئے اس کا ذہن بھی تسنیم کی باتوں میں الجھا ہوا تھا اور اس کا رخ بھی اپنے کمرے کی جانب تھا کہ مبادا کسی کی نظر پڑ بھی جائے یا اس کی غیر موجودگی کو نوٹس کر لیا گیا ہو تو وہ طبیعت خرابی کا بہانہ کر کے کمرے میں جانے کا کہہ سکتی تھی۔

بہت احتیاط سے چلنے کے باوجود اس کی اونچی ایڑی غرارے میں اٹکنے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ لہرا کر گرتی اس نے غرارے کا کنارہ ہیل سے نکالنے کے لیے سر جھکایا ہی تھا کہ اچانک کسی نے عقب سے اس کا بازو پکڑا اور ماوی کے چونکنے سے بھی پہلے تیزی سے اسے گھسیٹ کر نیم تاریک راہداری میں لے گیا۔

ماوی نے بری طرح ہڑبڑا کر دیکھا اور کچھ بول بھی نہ سکی۔ وہ جلال تھا اور اس نیم تاریک ویران راہداری میں اس کے اتنا قریب تھا کہ ماوی کو اس کی سانسوں کا لمس تک اپنے چہرے پر محسوس ہوتا تھا۔

اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فائزہ جمال

چاند رات مبارک

"اُڈ کوٹھے او تو کانواں وے
ساڈے دل دا پروہنا کوئی نہ ناں
تینوں چُوریاں کیوں پانواں وے۔"

لائٹ کے آتے ہی ریڈیو آن ہو گیا تھا۔

"بندہ پوچھے ہمارے فلم سازوں سے کہ چُوری جنم جنم سے طوطوں کی خوراک چلی آرہی ہے نا کہ کوؤں کی۔ اتنی بڑی ٹیکنیکل غلطی کے ہوتے ہوئے بھی وہ فلمی صنعت کی زبوں حالی کا رونا کس منہ سے روتے ہیں۔"

ناولٹ



شیشے کے نفیس پیالے میں سیب کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹتے ہوئے کوکب نے اعتراض کیا۔

"کوے جیسے ازلی ندیدے اور لالچی پرندے کو کیا فرق پڑتا ہے کہ کون سی چیز بطور خاص اس کے لیے بنی ہے۔ جیسے کچھ انسان بھی تو ہوتے ہیں جو ہر وقت بس پیٹ بھرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ کون سی چیز انہیں کھانا ہے۔ اگر کھانا بھی ہے تو کتنی مقدار میں؟"

صوفیہ نے ڈائجسٹ سے نظریں ہٹا کر کوکب کو دیکھا۔ کافی بڑا سا پیالا مختلف قسم کے موسمی پھلوں سے لبالب بھر گیا تھا اور جس پر ڈھیر سارا فروٹ چاٹ مسالا چھڑکنے کے بعد کوکب چٹخارے لے کر کھا رہی تھی۔

"کہیں طنز سے لبریز تمہارا اشارہ میری طرف تو نہیں؟ اگر ہے بھی تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ فروٹ چاٹ میری کمزوری ہے۔" بے نیازی سے کہتے ہوئے کوکب نے دوپٹے کے پلو سے ناک پونچھی۔ چٹ پٹا بنانے کے لالچ میں مسالا کچھ زیادہ ہی ڈال دیا تھا۔

"ہونہہ! اتنا کچھ ٹھونسنے کے بعد کمزوری کا لفظ اس شرقاً "غرباً" پھیلے اسی کلو کے وزن پر کچھ جچتا نہیں ہے۔" ٹھیک ہے وہ ڈائٹ کانشس تھی۔ اپنی اسمارٹنیس کا خیال اسے وقت بے وقت منہ میں کچھ نہ کچھ ڈالنے سے روکتا تھا مگر فروٹ چاٹ میں کون سی اتنی کیلوریز تھیں کہ وہ احتیاط برتتی۔ دل میں چاٹ کھانے کی شدید خواہش پیدا ہوئی مگر مقابل کوکب تھی، جو چاٹ تیار کرنے کے بعد جھوٹے منہ بھی اسے دعوت دیے بغیر

خود کھانے میں جت گئی۔ تب ہی تو صوفیہ اچھی خاصی تپ گئی تھی اور اسی لیے جلے دل سے کوکب کے موٹاپے پر بھرپور چوٹ کی۔

"حق ہا! بس کہ دشوار ہے دبلا ہونا۔"

کوکب نے ایک مصنوعی سرد آہ بھری۔

"میں روز صبح اٹھ کر ڈائٹ پلان ترتیب دیتی ہوں کہ آج کم کھاؤں گی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوتا ہے کہ جس دن ڈائٹنگ کا پروگرام بناؤں، اسی دن معمول سے زیادہ کھا جاتی ہوں۔" سخت بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے بوتل منہ سے لگالی۔

دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کا پانی ایک بار پھر صاف کرتے ہوئے کھانے کو لمحہ بھر کا وقفہ کیا۔

"تو تم ایسا کرو۔ اب کے تم یہ ارادہ دل میں لاؤ کہ میں نے کھانا ہے اور خوب کھانا ہے۔ شاید اس طرح تمہیں ڈائٹنگ کی توفیق نصیب ہو جائے۔" صوفیہ نے پُرخلوص مشورہ دیا۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ لیکن اگر میں نے زبانی اور جھوٹے ارادے کے مطابق زیادہ کھالیا تو..." لہجے میں اندیشہ در آیا تھا۔ صوفیہ ایک بے بس سانس لے کر رہ گئی۔

"کوکی! تمہاری باتیں بھی ناں، کبھی کبھی علی عظمت کی ویڈیو کی طرح لگنے لگتی ہیں۔ کبھی نہ سمجھ میں آنے والی قطعی ناقابل فہم۔"

"نہیں سچ میں تمہیں اس موٹاپے سے جان چھڑانا چاہتی ہوں مگر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے اندر قوت ارادی کی کمی ہے۔" لہجہ ایک دم دھیما اور انداز بہت بڑے راز کا سراغ پالینے کا سا تھا۔

"ہاہاہا۔" صوفیہ زور سے ہنسنے لگی۔

"تمہارا تو اس سکھ پولیس والے کا حال ہے، جسے چوری کسی چور کا ہی کام لگی تھی۔ ظاہر ہے تمہارے اندر ول پاور ہی کی کمی ہے۔ جو برسوں سے ڈائٹنگ پلان التوا میں پڑا ہے۔"

"میں نے سوچا، ایک چکر اماں کی طرف لگا آؤں۔ بڑا ملنے کو جی چاہ رہا تھا۔" اسی دم فردوس پھپھو کی آمد ہوئی۔

میلا چیکٹ سرمئی برقع اتار کر چارپائی پہ ڈھیر ہو گئیں۔ صوفیہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ برقعے کا اصل رنگ سفید تھا لیکن صابن و پانی کی محرومی نے سرمئی پن عطا کر دیا تھا۔

"ایک چکر؟" صوفیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ "صرف آج کے دن بلا مبالغہ آپ کا ساتواں چکر ہے۔ کہیں آپ کے ہاں گنتی کا حساب یہ تو نہیں کہ سات کو ایک شمار کیا جائے۔"

"ہاں تو میری ماں کا گھر ہے۔ میکہ ہے میرا۔ سو واری بھی آؤں۔ تم کاہے کو میرے پھیرے گن رہی ہو۔" فردوس تیز لہجے میں بولی۔

"ویسے اماں ہیں کہاں؟ نظر نہیں آرہی ہیں۔"

"ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں۔" صوفیہ رسالے میں پھر سے گم ہو چکی تھی۔

"ڈاکٹر کے پاس؟ میری ماں بیمار پڑ گئی اور تم لوگوں نے مجھے اطلاع کرنا گوارا نہ کیا۔ ہائے اماں!" دل گیر لہجے میں بولتے ہوئے ہلکے سے دوہتڑ سینے پہ رسید کیے۔

"ہاں تو ڈاکٹر کے پاس جانے کا یہ کہاں سے مطلب نکلتا ہے کہ وہ بیمار ہو گئی ہیں۔" صوفیہ کو فردوس کا واویلا قطعاً نہ بھایا۔

"ناں تو پھر ڈاکٹر کے پاس پانڈے قلعی کروانے جاتے ہیں کیا؟" فردوس طنز سے بولی۔

"بات دراصل یہ ہے کہ کل رات دادی نے مجھ سے حلیم کھانے کی فرمائش کی تھی۔ اور آپ تو جانتی ہیں جو چیز یہ ملکہ پکوان اور لذت کی ضامن یعنی ناچیز کوکب رشید بنالے تو دادی کے ساتھ 'ہل من مزید' والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ شکم کے پیچ و تاب کی اصلاح کے لیے پہلے تو اپنے ہی تیار کردہ معجون و سفوف چاٹے مگر کوئی افاقہ نہ ہوا تو مجبوراً "بہر دفع درد کے لیے ڈاکٹر کی طرف رجوع کرنا پڑا۔" کوکب نے تفصیلاً "دادی کے ڈاکٹر کے پاس جانے کی وجہ بتائی تو فردوس نے گھور کر دیکھا کہ واقعی اس کی ماں بیمار نکلی۔

"ویسے کوئی! تم لوگوں کے ہاں مہمانوں کو پوچھ کھانے کا نہیں پوچھا جاتا؟" فردوس نے کوکب کی گود میں رکھے پیالے کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ پیٹ بھر جانے کی وجہ سے وہ دھیرے دھیرے ٹونگ رہی تھی۔

"مہمان؟ جو بندہ ہفتے میں سات دن اور ہر دن میں بارہ چکر گھر کے لگائے، اُسے مہمان کی کسی کیٹگری میں رکھا جائے۔" اطمینان سے پیالے میں چمچ گھماتے ہوئے حیرانی سے دریافت کیا گیا۔

کچھ کہنے کی بجائے غصے کے گھونٹ بھرتے ہوئے فردوس گھر کے داخلی دروازے کی طرف متوجہ ہو گئی جہاں سے دادی اندر آرہی تھیں۔

فردوس نے لپک کر ماں کے سر سے برقع اتارا اور چارپائی پہ لیٹنے میں مدد کی۔ اگلے چند لمحوں میں جملہ افراد خانہ دادی کی چارپائی کے گرد بیٹھے ان کی صحت کے بارے میں دریافت کر رہے تھے۔ کمزوری و نقاہت کی وجہ سے دادی ان کی خاطر خواہ تسلی کرانے سے قاصر تھیں۔

"کوکب! یہ دوائیں تم مجھ سے سمجھ لو کہ کس وقت دینا ہیں۔" رشید نے لفافے سے مختلف قسم کے طاقت کے ٹانک اور دوائیاں نکال کر میز پہ رکھتے ہوئے بیٹی کو مخاطب کیا۔

"ہائے! بیٹھے بٹھائے میرے بچے کو تین ہزار کی ڈانگ لگ گئی۔ یہ سب منحوس تیری وجہ سے ہوا ہے۔ نہ اتنا تیز مسالا ڈالتی... میں بیماریوں کی پوٹ ایک ہی دن میں نچڑ کر رہ گئی۔" دوائیاں اٹھاتی کوکب کی کمر پہ وہ زوردار دھموکا جڑا کہ بلبلا کر رہ گئی۔

"ہاں تو جب تیسری پلیٹ بھر رہی تھیں تو میں نے کہا تھا کہ اپنے کمزور معدے کا ضرور خیال رکھیں۔ چیز پرائی ہو پر پیٹ تو اپنا ہوتا ہے ناں۔" کمر سہلاتے ہوئے وہ منہ بنا کر بولی۔

گوشت سے بھری کمر پہ دادی کے ہاتھ کی ضرب اتنی شدت سے لگی تھی کہ مانو آگ کا شعلہ سا لپک گیا ہو۔

دادی کا صرف ایک ہی شوق تھا۔ اچھا کھانا اور اچھا کھانا بہت زیادہ کھانا اور کھانے [illegible]

پیداوار تھی۔

بلا کی خوش خوراک اور بسیار خور، سات خون آسانی سے معاف کر دیتیں مگر اپنے اس شوق پر ہرگز سمجھوتا نہیں!

شام کا کھانا بڑی بہو نسرین جبکہ دوپہر کا سلمیٰ کے ذمے ہوتا۔ سدا کی کام چور، سست اور ذمہ داریوں سے جی چرانے والی بہوؤں کی اس وقت جان پہ بن آتی تھی۔ جب مینیو دادی خود ترتیب دیا کرتیں۔

دونوں کی نور چشمیاں تھیں کوکب اور صوفیہ۔

دادی سے وراثت میں ملنے والے اکلوتے شوق یعنی خوش خوراکی کی بدولت کوکب ہر وقت کچن میں گھسی کسی نہ کسی ڈش پہ طبع آزمائی کرتی رہتی۔ اسی لیے جب ماں کی کھانا بنانے کی باری آتی تو وہ بخوشی یہ کام اپنے ذمہ لے لیتی۔

نسرین کو چھٹکارہ تو مل جاتا تھا پر بسیار خوری کے سبب کوکب کا بڑھتا ہوا وزن اس پہ مستزاد پکی سانولی رنگت، گزارے لائق نین نقش... نسرین کی راتوں کی نیند ہرگز حرام نہ ہوتی جو اگر صوفیہ بے حد اسمارٹ، خوب گوری رنگت اور دلکش نقوش کی حامل نہ ہوتی۔

دونوں کی عمر میں صرف دو ماہ کا فرق تھا مگر کوکب کے ظاہری ڈیل ڈول اور کھڑے نقوش کو دیکھ کر دیکھنے والے بلا تکلف اسے صوفیہ سے دو سال بڑا قرار دیتے جس کا کوکب چنداں برا نہ مانتی مگر نسرین کی جان جل کر راکھ ہو جاتی تھی، جب وہ سلمیٰ کو اتراتا دیکھتی۔ ظاہر ہے ہر ماں کی طرح بیٹی کی تعریفیں اسے بھی اچھی لگتی تھیں۔

"ماسی! ڈاکٹر نے پرہیز تو بہت بتایا ہوگا۔ دیکھیں تو دو دنوں میں آدھی رہ گئیں۔" ہمدرد لہجے میں بولتے ہوئے نسرین نے اک موہوم سی آس سے پوچھا۔

"تم بھی بچوں جیسی باتیں کرتی ہو نسرین! بھلا پرہیز کیا کرنا ہے یہی دلیہ، کھچڑی اور یخنی وغیرہ۔" سلمیٰ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں نسرین کو کچھ جتایا۔

"یہ پھیکے اور بے مزا کھانے سے تم چاہتی ہو کہ

دونوں بہوؤں کی بات انہیں پسند نہیں آئی تھی۔ اس لیے فوراً" اٹھ بیٹھیں۔

"جسم میں پہلے ہی پانی اور نمکیات کی کمی ہے۔ کوئی سبزی مرغی کا گوشت اور ساتھ میں کوئی میٹھا بنالو۔" نحیف آواز میں پرہیزی کھانا بتایا تو سلمٰی اور نسرین دونوں ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھ کر رہ گئیں۔

" ساس جھگڑالو ہو۔ آنے جانے پہ پابندی لگادے۔ میاں سے پٹوادے۔ چلو زیادہ سے زیادہ آگ لگا کر جان لینے کی کوشش کرے پھر بھی وارا کھاتی ہے مگر ایسی چٹوری اور ذائقے باز ساس... اللہ کسی کو بھی نہ دے۔"

مٹر کے چھلکے بکری کے آگے تھال میں ڈالتے ہوئے سلمٰی کافی رنجیدہ و سنجیدہ تھی۔

"تم خواہ مخواہ کسر نفسی سے کام لے رہی ہو۔ ایسی کون سی مشہور زمانہ ساس والی خوبی ہے، جو ہماری ساسوماں میں نہیں پائی جاتی۔ آج سالن پھیکا اور کسٹرڈ پتلا بنا لینا پھر دیکھنا مہابھارت چھڑی کہ نہیں۔"

نسرین کی بات کافی حد تک درست تھی۔ اپنی ہدایات اور اصولوں سے انحراف پہ دادی بہوؤں کے خوب لتے لیتیں۔ صرف اسی پہ ہی اکتفا نہیں بلکہ بیٹوں کے سامنے بھی ان کی بیویوں کی کاہلی اور سستی پہ خوب روشنی ڈالی جاتی تھی۔ رشید اور حمید ماں کے فرماں بردار تو تھے ہی، پر بیویوں پہ بھی بس نہ چلتا تھا، سو جھوٹ موٹ آنکھیں نکال لینے سے کام چلا لیتے تھے۔ اس پر بھی نسرین اور سلمٰی اتنا بگڑتیں کہ لینے کے دینے پڑجاتے۔

ایسی ہی ناخوشگوار صورتحال سے بچنے کے لیے دونوں بھائی زیادہ سے زیادہ وقت دکان پہ گزارنے لگے۔ وقت اور توجہ زیادہ ملنے سے چھوٹی سی کریانہ کی دکان دیکھتے ہی دیکھتے دو سالوں میں سپر جنرل اسٹور کی شکل اختیار کرگئی تھی۔

بیٹوں کی اس ترقی کو دادی اپنی دعاؤں جبکہ سلمٰی اور نسرین اپنے قدموں کی برکت قرار دیتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

بادل بھی دلوں سے ڈٹے کھڑے تھے۔ نہ ہٹتے نہ برستے۔ گھٹاؤں نے ایسی چھاؤنی ڈالی کہ سورج آنکھیں دکھانا ہی بھول گیا۔ گھٹاؤں کی صف بندی سے ساکن فضا میں بلا کا حبس در آیا تھا۔ ایک پتا تک ہلتا دکھائی نہ دے رہا تھا۔

"خوش ہو رہے تھے کہ ساون لگ گیا ہے۔ خوب بارش میں نہائیں گے۔ موجیں اڑائیں گے مگر لگتا ہے بادل صرف اپنی شکل سے ہمیں بہلاتے رہیں گے۔ برسنے کا ارادہ نہیں ہے ان کا۔"

صوفیہ نے گردن پہ مسلسل بہتے پسینے کو اکتاہٹ سے صاف کیا۔ خلق ارضی کی بار بار خود پہ پڑتی منتظر و بے قرار نگاہیں بادلوں کو محظوظ کررہی تھیں مگر تیسرے دن مزید ستانا ترک کرکے آبی قطروں کی صورت میں زمین پہ ٹپک پڑے۔

"باہر بارش ہو رہی ہے۔" خوشی سے چیختے ہوئے کوکب کا انداز مطلع کرتا ہوا تھا۔

"تو کیا بارش کبھی اندر بھی ہوئی ہے۔ بے وقوف ناں ہو تو۔"

شلوار کے پائنچے چڑھائے۔ باہر صحن میں پاؤں رکھتے ہوئے صوفیہ نے سر جھٹکا۔ بازو پھیلائے، آسمان کی سمت منہ کیے گول گول گھومتے ہوئے بارش کی تیز بوچھاڑ تن من بھگونے لگی تھی۔ بچہ پارٹی کا نہانے سے زیادہ دانستہ کچے صحن میں پھسلنے اور دوسروں کو ٹانگ اڑا کر گرانے پر زیادہ زور تھا۔

بادل یوں ٹوٹ کے برسے کہ ہر طرف جل تھل ہوگئی تھی۔ دھرتی کا سینہ جی بھر کے سیراب ہونے لگا۔ دھلے دھلائے پودوں کی چھب ہی نرالی ہوگئی۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد بارش کا زور ٹوٹ گیا۔ موسم ایک دم سے سہانا ہوگیا تھا۔ مستانی ہوا کے جھونکے دلوں کو گدگدانے لگے۔ صوفیہ نے کوکب کے ساتھ مل کر برآمدے سے چارپائیاں نکال کر صحن میں لگائیں۔

"ایسے ٹھنڈے، خوشگوار موسم میں تو کوئی چٹ پٹی مزیدار چیز کھانے کو جی چاہتا ہے جیسے پکوڑے یا گلگلے وغیرہ۔"

دادی نے آم چوستے ہوئے کوکب کے خیال کی پرزور تائید کی۔

"مگر بیسن کا ڈبہ تو خالی ہے۔"

"تو یہ کون سا مسئلہ ہے۔ ابھی فصیح لے آتا ہے۔" آم کے رس سے سنی انگلیوں کو چاٹتے ہوئے دادی نے فصیح کو پکارا، جو صحن کے نشیبی حصے میں بارش کے پانی سے بن جانے والے تالاب میں کاغذ کی کشتیاں تیرا رہا تھا۔

"دادی، دکانیں تو بڑی سڑک پر ہیں۔ میں وہاں نہیں جاسکتا۔ گلی میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا ہے۔" فصیح نے عذر پیش کیا۔

پوتے کے صفا چٹ انکار نے دادی کو آگ بگولہ کردیا۔ دل شدت سے کوئی نمکین، چٹ پٹی چیز کھانے کو چاہ رہا تھا مگر یہ ڈھیٹ بچے.....

"یہ سب ماؤں کی ڈھیل کا نتیجہ ہے۔ پالا پوسا تو ڈھور ڈنگروں کو بھی جاتا ہے۔ پر تربیت تو انسانوں کے بچوں کی کی جاتی ہے۔

دادی کی بات کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں۔ مجال ہے جو بچوں کو غلط صحیح کی تمیز کروائی ہو۔ ارے تربیت تو پتا ماری کا کام ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں۔ اپنے بچوں کی ہم نے ایسی تربیت کی تھی کہ لوگ مثالیں دیا کرتے تھے۔ ہمارے چاروں بچے تمیزدار، شریف اور نماز روزے کے پابند۔" دادی اب اپنے پسندیدہ موضوع پہ آچکی تھیں۔

"آپ کن بچوں کی بات کررہی ہیں۔" سلمٰی نے حیرانی سے دریافت کیا۔ "وہ جو دن چڑھے بستر پر اینڈتے رہتے ہیں۔ صبح کے سورج کا نہیں پتا کہ مشرق سے نکلتا ہے یا مغرب سے، کبھی ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جمعہ کی نماز طوہاً" کرہاً" پڑھی جاتی ہے۔ ذرا کھانے میں دیر ہوجائے تو بیوی کی ایسی کی تیسی کردیتے ہیں۔" سلمٰی کا انداز جلا کٹا تھا۔

"اصل مرد تو وہ ہوتا ہے جس کی ناک پہ غصہ ہر وقت دھرا ہو۔ بیوی کا ہر کام الٹا لگے۔ بیوی کے ہر کام میں سو سو عیب نکالے، چیخنا، چلانا، چنگھاڑنا تو مرد کی شان ہوتی ہے۔ اللہ بخشے تم لوگوں کے دادا کو، غصے میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ کمرے میں وہ دہاڑ لگاتے کہ ادھر کچن میں میرے ہاتھ سے برتن نکل نکل جاتے تھے۔" لہجے میں شوہر سے زیادہ اپنے لیے توصیف تھی۔

"ہائے ایسے خوف ناک دادا میرے بڑے ہونے سے پہلے داغ مفارقت کیوں دے گئے۔ ہم بھی تو دیکھتے وہ ہماری دادی جیسی دہشت گرد بیوی پہ کیسے رعب رکھتے تھے۔" صوفیہ کے لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔

"مرحوم میرے ہاتھ کا کھانا بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ ہمیشہ کھانے کے بعد یہی کہتے حمیدے کی ماں! مجھ سے ہلا جلا نہیں جارہا۔ میری تو سمجھو محنت وصول ہو جاتی تھی۔" دادی کے چہرے پہ بیتے دنوں کا عکس جھلملا رہا تھا، ہونٹوں پہ البیلی سی مسکان دمک رہی تھی۔

"چہ چہ... بے چارے دادا، کھانا کھانے سے اتنی طبیعت خراب ہو جاتی ہوگی کہ چلنے پھرنے سے بھی رہ جاتے تھے۔" کوکب نے بھرپور تاسف سے سر ہلایا۔

"منحوس! کھانا لذیذ اور مرغن ہو، پھر زیادہ مقدار میں کھا لیا جائے تو سستی ہوتی ہے کہ نہیں؟" دادی نے غصے میں مقدور بھر بچے کھچے سولہ دانتوں کو پیسا۔

"کیا فائدہ ایسے لذیذ اور مزے دار کھانے پکانے کا جو عین جوانی میں شوہر کی جان ہی لے لیں۔ نہ آپ اتنے عمدہ کھانے پکاتیں کہ دادا کھانے کے فوراً" بعد سو جاتے، حالانکہ ڈاکٹر واضح طور پر بتاتے ہیں کہ کھانے کے فوراً" بعد لیٹنا صحت کے لیے سخت مضر ہے۔ تھوڑی بہت واک ضروری ہے، پر افسوس! اتنا زریں کلیہ ہمارے دادا کو معلوم نہ تھا کہ عین جوانی میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔"

کوکب نے چہرے پہ یوں رقت طاری کی کہ ابھی رو پڑے گی۔

"ٹھہر جا منحوس!" دادی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے کچا چبا جائیں۔ "ٹھہر، تجھے بھی دادا کے پیچھے بھیجتی

ہوں کھانا نہ سہی جوتے ہی کھلا کے۔" دادی جوتا اٹھانے کو چارپائی سے نیچے جھکیں اور کوکب چھلانگ لگا کر ایک پل میں یہ جا وہ جا۔

✡ ✡ ✡

رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ اپنے جلو میں بے پایاں فیوض و برکات سمیٹے آن پہنچا۔

دادی سمیت سارے گھر والے انتہائی ذوق و شوق سے ماہ صیام کی رحمتیں سمیٹنے لگے مگر بے تحاشا گرمی، حبس بھرے طویل دن اور غیر اعلانیہ لوڈ شیڈنگ نے وہ حال برا کیا کہ کوکب اور صوفیہ نے چار روزے رکھنے کے بعد معذرت کرلی اور ہر وقت دادی کی تنقید کی زد میں رہتیں۔

"میں پوچھتی ہوں کل کو محشر کی جان پگھلا دینے والی گرمی کیسے برداشت کر پاؤ گی، جب یہ معمولی سی تپش بھی تم لوگوں کی جان لینے لگتی ہے۔ نہ خوفِ خدا نہ دین کی شرم۔ ارے تم لوگوں کی عمر میں روزے چاہے سردی کے ہوتے یا گرمی کے مجال ہے کبھی روزہ چھوڑا ہو ہم نے۔"

"افوہ دادی! آپ ذرا سردیوں کے روزے آنے دیں، پھر دیکھیے گا کہ ہم بھی کیسے پورے روزے رکھتے ہیں۔" دادی کی مسلسل لن ترانیوں سے تنگ آکر صوفیہ بول پڑی۔

"چپ کرو نکمی لڑکی! سوائے کنگھی چوٹی کرنے کے، تمہیں آتا ہی کیا ہے۔ کوکی تو چلو افطاری تیار کر کے کچھ تو ثواب کما لیتی ہے مگر تم کام کی نہ کاج کی دشمن اناج کی۔" دادی نے اسے بری طرح جھاڑ دیا جبکہ "دشمن اناج کی" کہنے پر وہ سخت برا مان گئی۔

"یہ آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ میں کھاتی بھلا کتنا ہوں جو آپ کو اپنا اناج کم پڑتا محسوس ہو رہا ہے۔"

"اناج سے یاد آیا۔ وہ جو میری ممیری بہن میراں نہیں ہے؟"

بات ادھوری چھوڑ کر دادی دستی پنکھے کی ڈنڈی سے کمر کی پیٹ مارنے لگیں۔

"ارے دادی! کیوں نہیں ہیں، میراں دادی واقعی آپ کے ماموں کی بیٹی ہیں۔" کوکب سمجھی دادی تصدیق چاہ رہی ہیں اس لیے فوراً اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

"ہاں تو وہی کہہ رہی ہوں، میری ممیری بہن میراں کل اپنے گھر آرہی ہے۔"

"لو جی نیا سیاپا، روزوں میں بھی لوگوں کو اپنے گھر آرام نہیں آتا، زبردستی کی مہمانی۔" سلمٰی کوفت سے بڑبڑائی۔ دادی بوا میراں کی آمد پر ہمیشہ غیر معمولی اہتمام کرواتی تھیں اور سلمٰی پہ تو مقررہ کام ہی اتنے بھاری ہوتے کجا کہ مہمان نوازی۔

"اتنا گرم موسم، اوپر سے روزے، اگر بہن سے ملنے کی اتنی ہی ہڑک جاگ اٹھی ہے تو عید پہ ملنے آجائیں۔ نہ وقت نہ ویلا، جب جی چاہا دوسروں کو تنگ کرنے چل دیے۔" نسرین کو بھی بوا میراں کی آمد بے وقت ہی لگی تھی۔

"بس چپ کر، مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں، اگر دو تین ہانڈیاں زیادہ چڑھا لو گی تو ہاتھ نہیں ٹوٹ جائیں گے۔" بہوؤں کے منہ کے بگڑے ہوئے زاویے کو دیکھ کر انہیں غصہ آگیا تھا۔

"میرے میکے سے کوئی آئے تو تم کام چورنیوں کی یونہی جان نکلنے لگتی ہے۔ میراں بے چاری کب خالی ہاتھ آئی ہے بھلا۔ جب بھی آتی ہے ڈھیروں چیزیں لے کر آتی ہے، کھجور کے پتوں کے دستی پنکھے، چٹائیاں، چنگیریں، اپنی زمینوں کی سبزیاں اور پھل جنہیں کئی مہینوں تک تم لوگ ٹھونستی رہتی ہو، ویسے بھی وہ اس مرتبہ خاص کام سے آرہی ہے۔"

"نہیں ہر بار کوئی نہ کوئی خاص کام ہوتا ہے، گاؤں کی کسی عورت کا شناختی کارڈ بنوانا یا ڈاکٹر سے گرمیوں میں نکلنے والی پھوڑے پھنسیوں کی دوا لینا، یہ سارے ضروری کام ہی تو ہیں۔" سلمٰی کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"تو اپنے گزارے جوگا دماغ نہ کھپا، وہ اپنے پوتے اللہ داد کے رشتے کی خاطر آرہی ہے۔ مجھ سے کوکی، سوفی کے بارے میں بات کی تھی، میں نے کہا خود آکر دیکھ جاؤ، میرے لیے تو دونوں ایک جیسی ہیں۔" ایک

دھماکہ تھا جو دادی نے ان سب کے سروں پہ کیا تھا۔

"جی؟" کوکب اور صوفیہ نے فوراً ایک دوسرے کو دیکھا۔

"ماسی جی! یہ اللہ داد اپنے نعمت لالا کا بیٹا ہے ناں؟" سلمٰی فوراً لپک کے ان کے قریب آکر بیٹھ گئی، لہجہ بے حد نرم، انداز بے حد مودب۔

"ہاں ہاں وہی ہے۔ میراں کا بڑا پوتا، کئی مربع زمینوں کا مالک ہے۔ چار چار ٹریکٹر، تین تین ٹیوب ویل ہیں۔ ویسے بھی جن کے گھر کے دانے، وہاں کے کملے بھی سیانے، باردانہ اپنے گھر کا ہو تو آدھی فکریں آپ ہی ختم ہو جاتی ہیں۔" سلمٰی اور نسرین دونوں کے دل میں بیک وقت ساس کا منہ چومنے کا خیال آیا تھا۔

"حمید صحیح کہتا ہے، اماں زبان کی بری ہے پر دل کی اچھی ہے، اور میں حمید پہ ہی چڑھ دوڑتی تھی۔ جھلی نہ ہوں تو۔" سلمٰی کو ساس ایک دم سے پیاری اور اپنی اپنی لگ رہی تھی۔

نسرین کا حال بھی کم مختلف نہیں تھا، یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنا اچھا رشتہ اس کی معمولی صورت اور پکے رنگ والی بیٹی کے لیے بھی آسکتا ہے۔ جس کے مستقبل نے اس کی راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ "سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ساس کا دل کیسے خوش کیا جائے کہ بوا میراں فیصلہ کوکب کے حق ہی میں کریں۔ اگر ماسی جی کی حمایت مل جائے تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کوکی حویلی نہ جائے۔"

"ارے ماسی جی! آپ فکر ہی نہ کریں، ان کی عنایتیں ایک طرف، رشتے تو رب سوہنا بناتا ہے۔ آپ کی بہن ہونے کے ناتے وہ ہمارے لیے اتنی ہی معزز و محترم ہیں جتنی آپ۔" نسرین بے حد عاجزی سے بولی۔ پیچھے رہنا سلمٰی کو بھی نہیں آتا تھا۔

"ماسی جی! شام کا کھانا میں بناؤں گی۔ آپ بتائیں قورمہ، کوفتے، کباب، بریانی آخر روزوں کی وجہ سے آپ کو کمزوری ہو گئی ہے۔ کھانے کا تو خاص خیال رکھنا چاہیے آپ کو ... ساتھ میں اچار گوشت بھی ٹھیک رہے گا۔ آپ کو میرے ہاتھ کا اچار گوشت بڑا پسند ہے ناں؟" سلمٰی ایک دم لگاوٹ سے بولی۔

"اتنی ساری ہانڈیوں کا ناس مارنے سے بہتر ہے کہ تم ایک ہی ہانڈی ڈھنگ سے چڑھا لو۔ کوفتے اتنے سخت کہ ہتھوڑی ہاتھ میں لینا پڑتی ہے۔ کچے قیمے کے کباب سے تم یہ سمجھتی ہو کہ کباب کچے ہوں تب ہی انہیں اچھی طرح گلے بغیر ہی اتار لیتی ہو۔" یہ لگاؤ دادی کی سمجھ میں خوب آرہا تھا، تب ہی بے مروتی سے بولیں۔

سلمٰی کا تو منہ ہی بن گیا البتہ نسرین دل ہی دل میں خوب خوش ہوئی۔

"اگلے دن افطار تو میرے ذمہ ہو گا، بوا میراں بھی آچکی ہوں گی۔ میں مسالا بھری بھنڈیاں اور کریلے گوشت بناؤں گی۔" نسرین نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

"رہنے دو، تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ پکانے سے پہلے کریلوں کو اچھی طرح دھو کر کڑواہٹ نکالی جاتی ہے۔ تب ہی جا کر حلق سے اترتے ہیں، تم نے سوچا کہ جو ساس کریلوں سے مرے، اسے زہر کیوں دوں، نہ بی بی! یہ جیتا جاگتا جہاں کس کو برا لگتا ہے۔ ابھی میں نے مرنا نہیں ہے، جو جانتے بوجھتے زہر نگلتی رہوں۔" دادی نے تو بدگمانی کی حد ہی کردی۔ نسرین کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کرتے ہوئے چہرے پہ کھینچ کھانچ کے شرمندگی کے تاثرات لے آئی۔

"تو ماسی جی! پکاتے ہوئے آپ سے رہنمائی لے لوں گی۔ آخر بزرگ ہوتے کس لیے ہیں۔" نسرین ٹھان چکی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے وہ کوکب کو یہیں کھپا کے ہی رہے گی۔

"کوکی! تو بس کل سے روزے رکھ رہی ہے۔" نسرین بے حد سنجیدہ تھی۔

"ارے چھوڑو اماں! یہ بیس اکیس روزے کیا کریں گے، جب مہینوں کے لمبے لمبے وظیفوں نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا، کتنی دعائیں مانگیں مگر مجال ہے جو کہیں بات بن پاتی ہو۔" دانہ دانہ کر کے منہ میں انگور ڈالتے ہوئے وہ لاپروائی سے بولی۔

"منحوس! میں کہہ رہی ہوں روزے رکھ، شاید

وزن کم ہو' چل شکل صورت پہ تیرا بس نہیں چلتا مگر ہلکی تو ہو سکتی ہے۔ سارا دن۔ کھڑی بھینس کی طرح چرتی رہتی ہے۔ رمضان ہے۔ ذرا تو منہ کو ستا لینے دیا کر۔" غصے سے انگوروں کی پلیٹ چھین کر میز پر پٹخی۔

"اب تو کچن میں کچھ بنانے کے لیے گھسی تو ہاتھ توڑ دوں گی۔ کمبخت! کوئی کوکب خواجہ کی گدی تو نہیں سنبھالنا جو ہر وقت چولہے پہ کھڑی رہتی ہو۔"

"اماں! تو خواہ مخواہ رولا ڈال رہی ہے' رشتے ناتے تو نصیب سے جڑتے ہیں' اگر تیری طرح فکر ڈالنے سے رشتے ہوتے تو آج کوئی لڑکی' ماں کی دہلیز پہ نہ بیٹھی ہوتی۔" ماں کے جھنجلائے ہوئے انداز کو دیکھ کر وہ تحمل سے بولی۔

"کیسے فکر نہ کروں۔ جن ماؤں کی بیٹیاں تیری طرح "ماٹھی" صورت کی ہوں' انہیں ہلکان ہونا ہی پڑتا ہے۔ اگر جو تو صوفی کی طرح دبلی پتلی' گورے رنگ کی ہوتی تو فکر کاہے کی ہوتی۔" نسرین بری طرح چڑی ہوئی تھی۔

سلمٰی کو مطمئن و پر سکون دیکھ کر اس کے اندر رہ رہ کر حسد اور احساس کمتری کے ابال اٹھتے رہتے تھے۔

"کاش! کہیں سے کوئی ایسا ریگ مال مل جائے' جسے تیرے چہرے پہ مار کر تھوڑی سی کالک جھاڑ دوں۔ لڑکیاں منہ چمکانے کے لیے کتنے جتن کرتی رہتی ہیں۔ اس صوفی کو ہی دیکھ لے' کتنی بار کہا ہے دودھ ملائی کھایا کر' تاکہ رنگ صاف ہو اور نحوست کا اثر بھی کچھ کم ہو۔ بس الم غلم پیٹ میں ٹھونستی رہتی ہے۔ اب اگر میں نے تجھے منہ چلاتے دیکھ لیا ناں تو خیر نہیں ہے تیری۔" نسرین نے سخت لہجے میں دھمکایا مگر ادھر خاک اثر نہ ہوا۔

"اماں! تو بلاوجہ دبلی ہو رہی ہے۔ یہ موٹاپا' سانولی رنگت' موٹی ناک' پھیلے ہوئے ہونٹ اور چھوٹی آنکھیں' نانی کہتی ہے تو ہو بہو میری نسرین کی جوانی کی تصویر ہے۔ میرے ابا کی طرح ہوگا کوئی زندگی سے بے زار اور قربانی کا جذبہ رکھنے والا مائی کا لعل تو شگنوں کی مہندی میرے ہاتھوں پہ ضرور لگ کر رہے گی۔"

انتہائی اطمینان سے کہتے ہوئے دوبارہ اس نے انگوروں کی پلیٹ اٹھالی اور نسرین اتنے سفاک تبصرے اور وہ بھی اپنی بیٹی کے منہ سے سن کر ایسا بلبلائی کہ ایک زور دار جھانپڑ کوکب کے چوڑے چکلے "ڈولے" دے مارا۔

✲ ✲ ✲

"گورے رنگ کا زمانہ' کبھی ہوگا نہ پرانا
گوری ڈر تجھے کس کا ہے
تیرا تو رنگ گورا ہے"

اپنا پسندیدہ گانا گنگناتے ہوئے صوفیہ نے کلینزنگ ملک کی چند بوندیں' ہتھیلی پہ ٹپکائیں' جب سے دادی میراں ان کے گھر آئیں' اس دن سے یہ گا[...] اس کے لبوں سے ایک لمحہ کے لیے بھی جدا نہ ہوا تھا۔

"صوفی! ذرا میرے تو فیشل کردو پلیز!" [...]سی دم کوکب نے اندر جھانکا۔

"ارے آؤ ہیوی ویٹ چیمپئن! آج کیسے چہرے کی قسمت جاگ پڑی؟" چہرے پہ دھیرے دھیرے مسا[...] کرتے ہوئے صوفیہ خوش دلی سے بولی۔

"یقین کرو' اپنی یہ سانولی نمکین رنگت مجھے بڑی عزیز ہے مگر اماں کی نظر میں خوب صورتی کا معیار صرف گوری رنگت تک ہی ہے۔ کل تو حد ہی ہوگئی' سرینا ولیمز کو دیکھ کر کہنے لگیں کہ اگر میں[...] خود پر توجہ نہ دی تو سرینا اور وینس کے ساتھ ساتھ ان کی تیسری بہن کی حیثیت سے منظر عام پہ آجاؤں گی۔" آئینے میں اپنے چہرے کا کئی زاویوں سے جائزہ لیا' سانولی رنگت گرمیوں میں ہر بار کی طرح اچھی خاصی سیاہ پڑ چکی تھی۔

"چاچی بھی حد کرتی ہیں' قسم سے یہ تو بڑی زیادتی ہے۔" صوفیہ نے افسوس سے سر ہلایا۔

"ہے ناں؟ واقعی لفظوں کے وہ تیر مارتی ہیں کہ بند[ہ] خود سے نظر نہیں ملا پاتا۔" وہ خاصی مسکینیت سے بولی۔

"زیادتی تمہارے ساتھ نہیں بلکہ سرینا ولیمز کے ساتھ کی ہے انہوں نے رنگ کالا ہے تو کیا ہوا' پر اسمارٹ تو ہے ناں۔" صوفیہ نے اپنی بات کی وضاحت کی تو کوکب کے تلووں پہ لگی اور سر پہ بجھی۔ جب سے اللہ داد کے رشتے کا چکر چلا تھا' وہ اکثر اس پر چوٹ کر جاتی تھی۔

"اچھا بس میرا منہ نہ کھلواؤ' ٹھیک ہے تم اسمارٹ ہو۔ سولہ کریمیں بیک وقت لگانے سے رنگ بھی صاف ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہنستے ہوئے پورے بتیس دانت دکھائی دینے سے تم سونم کپور لگنے لگتی ہو۔" بے حد جلے کٹے انداز میں بولتے ہوئے آئینے میں صوفیہ کا چہرہ دیکھا' جس پہ دبی دبی سی مسکان سجی تھی' جیسے اسے جلا کے مزا آرہا ہو اسے۔

"اچھا بس اب بولنا نہیں' میں ماسک لگا رہی ہوں۔"

"جو بھی لگاؤ' مجھے اپنا رنگ گورا ہی چاہیے' تاکہ اماں کو مجھے دیکھ کر جو ہول اٹھتے رہتے ہیں' ان میں خاطر خواہ کمی آسکے۔" کوکب بچوں کی سی ضد سے بولی۔

"یہ دادی میراں نجانے کب منہ سے بھاپ نکالیں گی' ہفتہ تو ہوگیا ہے۔ کچھ فائنل تو کرلیا ہوگا۔" پرسوچ انداز میں بولتے ہوئے کوکب کو اٹھنے کا اشارہ دیا۔

چہرے کو دائیں بائیں گھما کر اچھی طرح تسلی کی۔ مسلسل رگڑنے سے جلد سرخ پڑ گئی تھی' ٹھنڈے پانی کے کافی چھپاکے مارنے پر بھی جلن کم نہ ہوئی تھی۔

"یہ مسرت کی شادی کا کارڈ ہے۔ عید کے چوتھے دن رخصتی قرار پائی ہے۔" صوفیہ نے دراز سے ایک کارڈ نکال کر کوکب کی جانب بڑھایا۔ کوکب نے ہاتھ بڑھا کر کارڈ تھام لیا۔

"حق ہا.....!"

"عقد" سے کس کو رستگاری ہے
آج یہ ہیں کل ہماری باری ہے"

کارڈ کو دیکھتے ہی ایک لمبی سرد آہ اس کے لبوں سے برآمد ہوئی۔ جس میں حسرت' امید اور تشنہ آرزوؤں کے جذبات بیک وقت موجود تھے۔

"تم خواہ مخواہ چاچی نسرین کی طرح اپنے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہو۔ مجھ سے کوئی پوچھے تو تھوڑی سی رعایت سے تم باآسانی' پاکستانی راکھی ساونت کا ایڈیشن کہلائی جا سکتی ہو۔" کوکب کے چہرے پہ حسرت زدہ تاثرات کو دیکھتے ہوئے صوفیہ ہمدردی سے بولی۔ تاہم آنکھوں میں شرارت کا عنصر موجود تھا' جواباً" کوکب اسے گھور کر رہ گئی۔

"ویسے صوفی! یہ مسرت رقعہ بازی تو اپنے محلے کے اکرم سے کیا کرتی تھی مگر شادی نوید سے رچا رہی ہے۔ کوئی نیا مرغا پھانس لیا ہوگا۔" دیدہ زیب ڈیزائن والے کارڈ پہ "نوید مسرت" خوب صورت الفاظ میں جگمگا رہا تھا' جسے دیکھتے ہوئے کوکب کو کچھ یاد آگیا۔

"کوکی! اپنی میٹرک کی تھرڈ ڈویژن ہی سہی' پر اکلوتی ڈگری کی کچھ لاج رکھ لیا کرو۔" صوفیہ گہرے طنز سے بولی۔

"مسرت کی شادی واقعی اکرم سے ہو رہی ہے' پر تمہارا ابھی کیا قصور' انگلش کا پرچہ تم نے آخری کوشش میں جا کے کلیئر کیا تھا۔"

پڑھائی کا طعنہ وہ بھی صوفیہ کے منہ سے' جس نے خود میٹرک دھکا اسٹارٹ سے کیا تھا' سن کر کوکب نے غصے سے آستینیں چڑھالی تھیں۔

"پہلی کوشش میں ضرور کلیئر کرلیتی' اگر جو تم جیسی موقع پرست' کند ذہن اور نالائق کزن سے واسطہ نہ پڑا ہوتا۔ پوچھا بھائی چارے کا فقرہ تھا' محترمہ نے یہ لکھوا مارا "گوالے سے پوچھا گیا تھا تم دودھ مہنگا کیوں بیچتے ہو۔ وہ بولا بھائی چارہ مہنگا ہوگیا ہے۔" فیل نہ ہوتی تو کیا ہوتی' اور تم خود کون سی گولڈ میڈلسٹ ہو' پاک اسٹڈیز میں اپنی کمپارٹ بھول گئی۔" کمر بمقابلہ کمرا پہ ہاتھ رکھ کر کوکب نے جوابی وار کیا۔

"میری کمپارٹ سراسر تمہاری کم ظرفی کا نتیجہ تھی۔ غلط فقرے کا بدلہ تم نے مجھے غلط مضمون لکھوا کر اتار لیا تھا۔ مضمون ابن بطوطہ پہ لکھنا تھا اور بتایا یہ کہ "طوطا بڑا پیارا پرندہ ہوتا ہے۔ اس کا رنگ

عموماً سبز ہوتا ہے۔ چونچ لال اور گلے پہ ہار بنا ہوتا ہے۔"
اور میں معصوم بھولی بھالی تمہارے منہ سے نکلے فقرات کو آنکھ بند کرکے لکھے گئی۔ ایک لمحہ کو بھی نہ سوچا' کہاں طوطے جیسا عام پرندہ اور کہاں ابن بطوطہ جیسا عظیم "جہاں نورد۔" ہمیشہ کی طرح اپنی کمپارٹ کا الزام اس نے کوکب کے سر رکھ دیا تھا۔

"اچھا تو اس وقت دماغ کو زحمت دے کر طوطا اور ابن بطوطہ میں فرق کر لیتیں۔" کوکب نے کلستے ہوئے باہر کی راہ لی۔

✲ ✲ ✲

"امی صحیح کہتی ہیں میں واقعی عقل کی موٹی اور چغد ہوں۔" کوکب رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"یہ تو تمہاری بڑائی ہے کہ اپنی خوبیوں کا اعتراف اپنے منہ سے کر رہی ہو' اگر یہی بات میں تم سے کہتی تو تمہیں غصہ آجاتا ہے۔" صوفیہ بھرپور تائیدی انداز میں بولی جس پہ کوکب نے سلگ کر اسے دیکھا۔

"مجھ سا کم عقل واقعی دنیا میں کوئی نہیں ہے' تب ہی تو تم سے فیشل کروا بیٹھی تھی۔ جنم جنم سے میری دشمن۔ اللہ تم سے پوچھے صوفی! آستین کی سانپ' دوستی کے نام پر دھبہ' مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تم نے۔" کوکب کا پرسوز واویلا جاری تھا۔

"تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ ہر صورت تمہیں گورا کردوں۔ اب تم نے اتنی تاکید کی کہ مجھ سے بلیچنگ پاؤڈر زیادہ ہی ہوگیا' تو اس میں میرا کیا قصور' لالچ کی سزا تو تمہیں ملنا ہی تھی۔" صوفیہ پہ اس کے کوسنوں کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ اس لیے دل جمعی سے ناخن فائل کرنے میں لگی رہی۔

"ہاں تو رنگ گورا کرنے کو کہا تھا۔ یہ تو نہیں کہا تھا کہ پوری بھوتنی ہی بنا دو۔" صوفیہ کے اطمینان نے اس کے طیش میں اضافہ کیا۔ یعنی کسی کی گزارے لائق رنگت گئی اور ان کی ادا ٹھہری۔

دادی میراں کے دل تک پہنچنے کے لیے معدہ کو خوش کرنے کے لیے وہ نت نئی ڈشز آزماتی اور داد پاتی رہی۔ ہر وقت کچن میں گھسنے اور بلا کی گرمی و حبس سے فیشل کا اثر تو دو دنوں ہی میں زائل ہوگیا تھا۔ قدرتی سانولی رنگت کے بحال ہوتے ہی چہرے کے اطراف میں نکلے گھنے بلیچ شدہ سفید روئیں چہرے کو عجیب چت کبرا سا بنا رہے تھے۔ اس پہ نسرین کی کھنچائی الگ۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ صوفیہ کا گلا ہی دبا ڈالے۔ "تم اپنی دشمنی کسی اور وقت کے لیے بھی تو اٹھا رکھ سکتی تھیں۔ اب میں اس منہ کے ساتھ چاچی حفیظہ کے سامنے کیسے جاؤں گی؟" مارے بے بسی کے اسے رونا آرہا تھا۔

"تو نہ جاؤ' میں نے تو پہلے بھی کہا تھا۔ یہ وزن گھٹانے کے لیے بیری سے لٹکنا' الٹی سیدھی کریموں کا استعمال فضول ہے... اب مجھ جیسی خوب صورت اسمارٹ اور دلکش لڑکی کے ہوتے ہوئے بھلا وہ تمہیں کیسے اپنی بہو پسند کرسکتی ہیں۔" دل آزاری صوفیہ کی کبھی بھی عادت نہیں رہی تھی مگر اس وقت کوکب کی شکستگی اور مایوسی دل کو خاص تقویت دے رہی تھی۔ حویلی کا مکین بننے کا خیال ہی سرور انگیز تھا۔

"ویسے ایک بات ہے' اب تم پوری میری رقیب روسیاہ لگ رہی ہو۔" چند ثانیے بعد وہ شرارت سے بولی۔

"دفع دور' اللہ کرے اللہ داد تمہیں اپنی جوتی برابر نہ سمجھے۔" کوکب باقاعدہ بددعائیہ انداز میں بولی۔

"تو کیا ہوا' غصہ تو مرد کی شان ہوتا ہے۔ بھیگی بلی بنے بیوی کا پلو تھامنے والے مرد تو مجھے پسند نہیں ہیں۔" صوفیہ مزے سے بولی۔ لہجے میں خود بخود کھنک در آئی تھی۔ پھر قدرے مصنوعی تفکر سے بولی۔

"کوکی! تو کہتی سچ ہے' دیہاتی مرد ہوتے اکھڑ مزاج ہیں۔ اپنی من مانی کرنے والے' ثمرہ بخاری کی کہانیوں میں' میں نے تو کم از کم یہ ہی پڑھا ہے۔" اس نے اپنی پسندیدہ مصنفہ کا نام لیا۔

"اچھا' تو پھر میں دعا کرتی ہوں کہ وہ نازیہ کنول نازی کے ہیروز جیسا نکلے۔ زنانہ وار' آٹھ آٹھ آنسو رونے والا' انتہائی رقیق القلب۔ سارا دن آنسو پونچھنے کے

بعد گیلا آنچل نچوڑتے گزر جائے گا۔" کوکب اطمینان سے بولی۔ صوفیہ کو خوش و مطمئن پاکر وہ خود بخود اس رشتے سے دستبردار ہوگئی تھی۔

"اللہ نہ کرے' اب یہ بددعا تو نہ دو۔"

صوفیہ نے دہل کے بے ساختہ سینے پہ ہاتھ رکھا تھا۔

✲ ✲ ✲

ماہ نیم کی اجلی' دودھیا اور میٹھی چاندنی پورے ماحول کو منور کر رہی تھی۔ وسیع و عریض صحن کے وسط میں بچھی چارپائیوں پہ جملہ اہل خانہ براجمان انتہائی خوش گوار موڈ میں خوش گپیاں لگا رہے تھے۔ دادی میراں کی بہو حفیظہ اور پوتا اللہ داد آج تشریف لاچکے تھے۔ سلمٰی اور نسرین خوش اخلاقی اور مہمان نوازی میں ایک دوسرے کو مات دینے میں ہلکان ہو رہی تھیں۔

"پتا ہے کوکی! میں شادی کے بعد اے ڈی سے کہوں گی کہ ہم ہنی مون گاؤں میں ہی منائیں۔ ہرے بھرے کھیت' صاف شفاف ندیاں' درختوں کے جھنڈ میں کوکتی کوئل' فضا میں رچی بھینی بھینی خوشبو' نیچرل بیوٹی مجھے بہت فینسی نیٹ کرتی ہے۔" صوفیہ کا لہجہ خواب ناک سا تھا۔

"چہ خوب' مجھے تو نالائق' کم عقل اور پتا نہیں کیا کیا کہتی رہتی ہو' پر خود بھی تو پڑھ کے گنوایا ہی ہے۔ یہ نہیں پتا اے کے بعد بی آتا ہے ناکہ ڈی۔" کوکب کو پوری بات میں صرف یہ ہی لفظ سمجھ میں آیا تھا' اس لیے طنزاً بولی۔

"کوکی! تمہیں دیکھ کے لگتا ہے بھینس کو ہی عقل سے بڑا ہونا چاہیے تھا۔" صوفیہ ایک بے بس ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔

"ڈفر لڑکی! میں نے اللہ داد کے لیے اے ڈی کا کوڈ ورڈ استعمال کیا ہے۔ بھلا شادی سے پہلے پورا نام لیتی اچھی لگوں گی۔"

"آؤ ذرا باہر کا جائزہ لیں۔ پتا تو کریں دادی میراں نے بلی تھیلے سے باہر نکالی کہ نہیں۔" دونوں صحن کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں آکھڑی ہوئیں۔

"ہائیں! دادی میراں کو بلیاں پالنے کا شوق ہے؟" کوکب نے حیرت سے صوفیہ کو دیکھا' جس نے اب دانت پہ دانت جمالیے تھے۔

"اگر پالنے کا شوق بھی ہے تو تھیلے میں کیوں بند..."

"شٹ اپ کوکی! اب اگر تم نے کوئی فضول لفظ منہ سے نکالا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" سخت لہجے میں ڈپٹتے ہوئے اس نے وارننگ دی۔

وہ دونوں اس وقت کچن میں محصور تھیں۔ دادی نے اللہ داد کی موجودگی میں ان کے گھر میں گھومنے پھرنے پر پابندی عائد کردی تھی۔ کچن میں رکنے کا خیال صوفیہ کا اپنا تھا' کیونکہ یہاں سے صحن کا منظر صاف نظر آتا تھا۔

"میں تو سمجھ رہی تھی کہ دادی میراں کا پوتا اونچا لمبا کافی تگڑی جسامت کا ہوگا۔ خالص دیہاتی ماحول میں پلے ہوئے دودھ مکھن کھانے والے نوجوان تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مگر یہ تو کافی نیلی مارکہ منڈا لگ رہا ہے۔"

کاٹن کے کھڑکھڑاتے جوڑے' پاؤں میں اونچی کھیڑی پہنے' ٹانگ پہ ٹانگ رکھے اللہ داد کو دیکھ کر کوکب نے منہ بنا کر اعتراض کیا۔

"نا تو ہاتھی نما پہلوان میں نے کیا کرنا ہے' کوئی کشتی کے اکھاڑے میں تھوڑا ہی اترنا ہے اسے' میں خود بھی اسمارٹ ہوں۔ میرے ساتھ ایسا ہی اسمارٹ بندہ سوٹ کرے گا۔" صوفیہ کو کوکب کا تبصرہ خاصا برا لگا تھا۔

"دادی کہہ رہی ہیں مہمانوں کے لیے چائے پانی باہر لے آؤ۔" صوفیہ سے چھوٹی ثوبیہ نے اندر آکر دادی کا پیغام سنایا۔

"کیا بتائیں' کافی گرمی ہو رہی ہے' چائے تو بالکل نہیں پئیں گے۔" پُراعتماد و مطمئن صوفیہ پہلی بار کچھ فکرمند ہوئی' کیونکہ اس شعبہ میں اسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔

"دودھ کی کچی لسی بنا لیتے ہیں' دیہاتی لوگ ہیں' یہ ہی پسند کریں گے۔" کوکب نے مشورہ دیا۔

"اب ایسے بھی دیہاتی نہیں ہیں۔" صوفی کا تیکھا

انداز کافی جتاتا ہوا تھا۔

"کئی سالوں سے حویلی میں ٹیننگ پیا جا رہا ہے۔" اس نے خود کو نئے رشتے میں مقید کر کے ابھی سے حق جتانا شروع کر دیا تھا۔

مینگو اسکوائش میں برف کے ٹکڑے ڈالنے کے بعد کوکب نے صوفیہ کے ہاتھوں میں ٹرے تھمائی۔

"کوکی! میں بڑی کنفیوژ ہو رہی ہوں۔ ٹرے تو ہی اٹھا۔" صوفیہ نے ٹرے واپس کوکب کی طرف بڑھائی تو وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

"میں کیوں اٹھاؤں؟ میرا وہاں کیا کام۔"

"یہ کیا بات ہوئی، ابھی سے میرا ساتھ چھوڑ رہی ہے، آگے تو جوتا چھپائی اور دودھ پلائی کی ساری رسمیں تُو نے ہی تو پوری کرنا ہیں۔"

صوفیہ کے لجاجت بھرے انداز پہ وہ ٹرے اٹھا کر ڈھیلے قدموں سے باہر نکل آئی۔ صوفیہ اس کے بالکل پیچھے چھپی چل رہی تھی۔ کوکب کے لمبے قد اور چوڑی جسامت نے تقریباً" اسے چھپا دیا تھا۔

"یہ ہے حمید کی دھی صوفیہ۔" دادی میراں نے بہو سے اس کا تعارف کرایا۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری ہے۔" ابتدائی دعائیہ کلمات کی ادائیگی کے بعد حفیظہ بولی۔

"اور یہ ساتھ میں کوکب ہے، اپنے رشید کی کڑی۔" اب کے روئے سخن اس کی جانب مڑ گیا تھا، جو میز پہ ٹرے رکھنے بعد بے نیازی سے گھڑونچی پہ رکھے مٹکوں کو دیکھ رہی تھی۔

"بڑی سگھڑ بچی ہے۔ بڑا سواد ہے اس کے ہاتھوں میں، حفیظہ! تیرے تو بھاگ کھل گئے ہیں۔ ایسی نوں (بہو) تیرے لیے پسند کی ہے کہ ساری حیاتی تو میرے گوڈے دباتی رہے تو پھر بھی کم ہے۔" دادی میراں نے مسکراتے ہوئے دھماکہ کیا۔

کوکب اور صوفیہ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اگلے ہی لمحے لہرا کر دھپ سے اپنی دادی کی گود میں جا گریں۔



آفتابی گولے نے دھیرے دھیرے مغرب کی بانہوں میں سمٹنا شروع کر دیا تھا۔ صحن میں لگے ٹاہلی اور بیری کے درختوں کی پھننگ زرد روشنی سے چمکنے لگی تھیں۔

"او کوکی! ہو سکتا ہے کل عید ہو جائے۔ کچھ کھانے پکانے کی فکر ہے بھی یا نہیں۔ تم لوگوں کی مائیں تو نہ جانے کس بات پہ ادھار کھائے پھر رہی ہیں۔ ایک کا منہ اِدھر ہے تو دوسری کا اُدھر۔"

کچھ فاصلے پر دوسری چارپائی پہ بیٹھی گم صم بیٹھی کوکب کو دادی نے پکارا، مگر جواب ندارد۔

"آخر میں کہتی ہوں بہری تو نہیں ہو گئیں۔ دماغ کہاں ہے تمہارا؟" اس کی بے توجہی پہ دادی تپ گئی تھیں۔ اس لیے دوبارہ چیخ کے پکارا تو وہ ہڑبڑا کر حواسوں میں لوٹی۔

"جی جی دادی!" پلے کچھ پڑا ہو تو بس ہونق سی ان کی شکل دیکھنے لگی۔

"دادی کی بچی! میں کہہ رہی ہوں سودے کی لسٹ مجھ سے بنوا لو، کل کوئی چیز کم ہوئی تو میرا ڈنڈا اور تیرا سر ہو گا۔ پکار پکار کر گلا بیٹھ گیا، جیسے پاگل ہوں جو خوامخواہ چیخے جا رہی ہوں۔"

دادی کا اعتراض بھی بجا تھا۔ وہ واقعی اپنے ہوش و حواس میں ہوتی تو جواب دے پاتی نا! اس کا دماغ نہ جانے کہاں گواچ گیا تھا۔ جب سے دادی میراں اینڈ فیملی یہاں سے گئی تھی اس وقت سے وہ ایک خواب کی سی کیفیت میں تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا اسے اللہ داد کا نصیب بنانے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

"ہماری کنالوں کی حویلی ہے، جس میں آرام و سکون کی کمی نہیں ہے تو کام بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ منوں کے حساب سے اناج، جنہیں چھانٹنے، صاف اور گوداموں میں ذخیرہ کرنے میں ہی مہینے لگ جاتے ہیں۔ چالیس مزارعوں کا ٹکر پانی تو حویلی سے جاتا ہے۔ اوپر سے میرے اللہ داد کی سیاسی لیڈروں کے ساتھ اٹھک بیٹھک ہے، ان کی چاء پانی کی فکر۔۔۔۔ یہ ساری ذمہ داریاں تو کوکب جیسی صحت مند اور جی کڑی

سنبھال سکتی ہے۔ ہمارے پنڈ کی ہوا میں سخت جان اور محنتی لڑکیاں ہی رچ بس سکتی ہیں۔"

ہر ماں کی طرح حفیظہ کو بھی اپنے لیے خوب صورت بہو کی تلاش تھی، اور گھر میں صوفیہ سے زیادہ کون خوب صورت ہو سکتا تھا۔ دادی میراں کی نظروں سے بہو کی ناپسندیدگی چھپی نہیں رہ سکی، اس لیے اکیلے میں اس کے سامنے کوکب کے وجہ انتخاب کی وضاحت کی۔

"یہ صوفیہ جیسی دھان پان اور دبلی پتلی لڑکی سارے کام تو دور کی بات دودھ کا ڈول ہی اٹھا لے تو بڑی بات ہے۔ ویسے بھی یہ سرمہ کنگھی کرنے والی لڑکی کیا خاک ہماری خدمت کرے گی۔ اسے تو خود کو مانجھنے اور صاف کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔"

حفیظہ تو پہلے ہی ساس کی فہم و فراست اور دور اندیشی کی قائل تھی۔ اپنے فیصلے کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد تو اسے ساس کا انتخاب ہر لحاظ سے بہترین لگا۔ کوکب پر تو ایک سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا حویلی کا مکین بننے کے مقابلے، جس میں وہ شامل ہی نہیں تھی، میں سرخروئی حاصل کر چکی ہے۔ مگر صوفیہ اور چاچی سلمیٰ کے اترے ہوئے چہرے اور ماں کی کھلکھلاہٹ بخوبی باور کرا رہے تھے کہ واقعی ایسا ہو چکا ہے۔

"میری بختاور دھی! میں خوامخواہ تیرے بارے میں وسوسوں کا شکار تھی مگر دیکھ کیسے بازی مار لی تو نے۔" خوشی سے بے حال ہوتے ہوئے نسرین نے چٹاچٹ اس کی بلائیں لی تھیں۔

"مگر اماں! صوفی مجھ سے ناراض ہے، مجھ سے بات تک نہیں کرتی۔" وہ کافی دکھی لہجے میں بولی۔

صوفیہ نے اسے مبارک باد دینا تو درکنار بولنا تک ترک کر دیا تھا۔ اس نے کئی بار اسے خود سے مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ہر بار صوفیہ سرد مہری اور ترشی سے پیش آئی۔

صوفیہ کی تنگ دلی اور کم ظرفی پہ اسے افسوس ہو رہا تھا۔ صوفیہ کا ردعمل فطری تھا۔ کیونکہ اس رشتے سے اس کی دلی وابستگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ مگر نیرنگئی قسمت سے کچھ بعید نہیں، کیا ہو جائے۔

اپنی خوشی سے زیادہ، صوفیہ کا غم اس کے دل کو بوجھل بنا رہا تھا۔

"ارے تو تمہیں کیا ضرورت ہے، اس کے منہ لگنے کی، جل ککڑیاں نا ہوں تو، بڑا غرور تھا سلمیٰ کو بیٹی کی بھوری چمڑی پر، لیکن نصیب کی دھنی تو میری کوکی رہی ہے۔" نسرین کا لہجہ خوشی سے کھنک رہا تھا۔

"میں کہہ رہی ہوں سویاں تو عید پہ لازمی بنیں گی۔ ساتھ میں اور کیا ہو؟" دادی اس سے رائے دریافت کر رہی تھیں۔ وہ گہری سانس لے کر خیالوں سے باہر نکلی۔

"اور کیا بنائیں، بس سویاں ہی ٹھیک ہیں، ساتھ میں کولڈ ڈرنک بھی چلتی رہے گی۔ گرمی ہے اتنا زیادہ نہیں کھایا جائے گا۔" اس نے اپنی رائے پیش کی۔

"کچھ عقل کو ہاتھ مار لڑکی! عید کا دن ہے، مہمانوں کو کالے پانی (پیپسی) کی سزا دے گی، بڑا دن خدا کا، ہاتھ کو کھلا رکھنا چاہیے، تو ایسا کر بڑے گوشت کے چاول، کباب، مچھلی اور میٹھے میں سویوں کے ساتھ گلاب جامن اور سادہ سے دو چار کھانے اور بنا لے۔"

دادی نے ہمیشہ کی طرح اپنی طرف سے سادہ مینیو ترتیب دیا، جسے سنتے ہی وہ غش کھانے کے قریب ہو گئی تھی۔



"خواب جب ٹوٹ کر بکھرتا ہے
دور تلک کچھ نظر نہیں آتا"

ہلال عید دیکھنے کے لیے صوفیہ کافی دیر سے چھت پہ چڑھی آسمان پہ نظریں جمائے کھڑی تھی۔ کوکب اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی۔

"کیا مطلب؟ کون سا خواب۔" ذرا سا رخ موڑ کر تیکھی نظروں سے کوکب کو دیکھا، پھر استہزائیہ انداز میں بولی۔

"یہ پرائمری پاس، ٹخنوں تک شلوار چڑھا کر کھڑے

پانی میں پنیری لگانے والا اللہ داد میرا خواب نہیں ہو سکتا ہے۔ افتخار ٹھاکر کا جڑواں بھائی نہ ہو تو میرا آئیڈیل تو کوئی ایجوکیٹڈ ویل آف' لونگ' کیئرنگ اور بہت ہینڈسم' یوں سمجھو فرحت اشتیاق کی پروڈکشن ہو گا میرا ہم سفر۔ یہ ڈھور ڈنگروں کا چارا بھوسا کرنے والا میرے جیسی نازک و لطیف جذبات رکھنے والی لڑکی کے بھلا کیسے قابل ہو سکتا ہے۔" نخوت سے ناک چڑھاتے ہوئے صوفیہ نے دوبارہ نگاہیں آسمان پہ ٹکا دیں۔

"انگور کھٹے ہیں میری جان۔" کوکب دل ہی دل میں خوب مسکرائی' تاہم بظاہر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے چہرے پہ بدقت انتہائی مسکینیت طاری کرلی۔ وہ ٹھان چکی تھی کہ وہ صوفیہ کو منا کر ہی نیچے اترے گی۔

"سچ کہتی ہو' لیکن کیا میں اتنی ہی بری اور کم شکل ہوں جو ایسے انگوٹھا چھاپ کے پلے باندھ دی جاؤں؟" پھیکا لہجہ' مغموم انداز۔

صوفیہ نے چونک کر بغور اسے دیکھا۔

"دیکھو کوکی! اگر تمہیں لگتا ہے کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو تم دادی کے سامنے انکار کردو۔ میں مکمل تمہیں سپورٹ کروں گی۔" صوفیہ ایک دم پُرجوش ہو گئی تھی۔

"ہونہہ! چلا کوئی! میں انکار کردوں اور ادھر تم قبضہ کرلو۔" کوکب نے غصے سے دل ہی دل میں دانت پیسے۔

"اب دیکھو نا! کہاں تم اتنی صحت مند اور بھاری تن و توش کی مالک اور کہاں اللہ داد سوکھا سڑا' یقین کرو لوگ گلی ڈنڈا یا نمبر دس کہہ کر پکاریں گے تم دونوں کو۔"

صوفیہ کا انداز بھرپور ہمدردی اور غمگساری لیے ہوئے تھا۔

"میں کیا کروں' کم بخت کیوپڈ اسٹوپڈ نے وہ ناک کے تیر مارا ہے کہ میں نمانی کچھ کرنے جوگی نہیں رہ گئی۔" سخت بے بسی سے آہ بھری گئی۔

"کیا مطلب؟ کہیں تُونے چوری چھپے' ڈیٹاں تو نہیں مارلیں؟" صوفیہ نے سختی سے اسے گھورا۔

"جیسا ذہن' ویسی سوچ' میں ایسی لگتی ہوں تجھے؟" کوکب سخت برامان کر بولی۔

"وہ تو جب جاتے وقت انہوں نے اپنے کندھے پہ رکھا رنگین ڈبوں والا رومال میرے سامنے اس زور سے جھٹکا اُف! ظالم کی یہ ادا' میرا دل ہی میرا نہیں رہا۔" دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں ایک دوسرے میں ڈال کر وہ جھوم کر بولی۔

"منگنی نے بھی تم جیسی چھیچھڑ بندی کی کیمسٹری پہ کوئی فرق نہیں ڈالا۔ ٹیوب لائٹ کے نیچے بیٹھنے سے کافی مچھر اور حشرات اس کے رومال سے چمٹ گئے ہوں گے۔ جنہیں تمہارے سامنے جھٹکنے کی غلطی کر بیٹھا اور تم ایویں ہی عقل کے ساتھ ساتھ دل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔" صوفیہ نے شاید تہیہ کیا ہوا تھا کہ نہ تو کوکب کی خوشی بانٹنا ہے اور نہ ہی اسے ٹھیک طرح سے خود خوش ہونے دینا ہے۔

دفعتاً فضا رنگین پٹاخوں سے منور ہو گئی۔ گلی کے نکڑ پر بجتا زور زور سے ڈھول' باہر ہر نوع کی خوشی سے بلند ہوتی آوازیں' چاند رات کی روایتی گہما گہمی کا آغاز ہونے کا اعلان کر رہی تھیں۔

"صوفی! ایسی اور جھگڑے کو جتنا بڑھالیا جائے' مگر یہ سچ ہے مجھے تمہارے بغیر چاند رات منانا ایسے لگ رہا ہے جیسے بغیر چنوں کے پھیکے اور بے مزا گول گپے کھا رہی ہوں۔ یا جیسے سردیوں کی نرم گرم دھوپ میں چائے کے بغیر سموسہ کھا لیا جائے؟" کوکب کچھ اس بے چارگی سے بولی کہ صوفیہ کو ہنستے ہی بنی اور اسے ہنستے پاکر کوکب کی جان میں جان آئی تھی۔

"چلو جلدی کرو منیار ن ماسی زہراں کے پاس چوڑیاں پہننے چلتے ہیں۔" کوکب اس کا ہاتھ تھام کر نیچے اترنے لگی۔ مگر صوفیہ ادھر ہی کھڑی رہی۔

"کیا ہوا؟ چلنا نہیں ہے۔" اسے اپنی جگہ جمے دیکھ کر وہ لحہ بھر کو پریشان ہوئی۔

"چلنا ہے' کیوں نہیں چلنا بھلا چوڑیوں کے بغیر چاند رات ہوتی ہے۔ واپس آکر مہندی بھی لگانا ہے'

لیکن پہلے چاند رات کی مبارک تو لے لو۔" صوفیہ خوش دلی سے بولی تو کوکب ایک دم اس کے گلے لگ گئی۔

"چاند رات مبارک۔"

"تمہیں بھی اور اللہ داد کے ملنے بلکہ گلے پڑنے کی خصوصی مبارک باد۔" زور سے بھینچتے ہوئے صوفیہ مسکرا کر بولی۔ کوکب نے ذرا پیچھے ہو کر اس کا چہرہ تکا۔ سادہ' پُرخلوص اور بے ریا ہنسی۔

ڈھیروں سکون اس کے اندر اتر آیا تھا۔ جب آپ کے اپنے آپ کی خوشیوں میں شامل ہوں تو خوشیاں دگنی بلکہ سہ گنی ہو جایا کرتی ہیں۔

"تمہیں تو عید کی تیاری کی خاص ضرورت نہیں ہے۔ دادی میراں تمہاری کافی بڑی عیدی لائی تھیں۔"

"ہاں لائی تھیں۔ مہندی کے پتے' جن کو کوٹ کر' چھاننے کے بعد ہاتھوں' پیروں پر لیپ تو لگائی جا سکتی ہے۔ بیل بوٹے نہیں بنائے جا سکتے۔ سولہ لڑیوں والے بھاری پراندے جنہیں لگا کر اپنے گنتی کے بالوں سے ہاتھ دھونا مجھے قطعاً گوارا نہیں۔ شوخ' بھڑکیلے اور بھاری بھر کم جوڑے ان شاء اللہ جب چوتھی کی دلہن بنوں گی تو اس وقت زیب تن کروں گی۔ ساری فالتو چیزیں میرے حوالے کرکے کام کی چیزیں دادی نے اپنے قبضے میں کرلی ہیں۔" کوکب منہ بنا کر بولی۔

"کیا مطلب؟" صوفیہ نہ سمجھی۔

ارے ان چیزوں کے ساتھ عیدی میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ میوے والا گڑ' سات میووں کی چوری پنجیری' کدو کا حلوہ' بیسن کی ٹکیاں' جو کے پاپ کارن' دیسی گھی کا حلوہ اور نہ جانے کیا' سارا کچھ دادی نے اپنے پاس یہ کہہ کر رکھ لیا کہ یہ تمہارے کام کی چیزیں نہیں ہیں۔"

"کوکب کو رہ رہ کر دادی پہ غصہ آ رہا تھا' جنہوں نے ان چیزوں کی شکل تک نہیں دکھائی تھی۔ صوفیہ اس کی دلی کیفیت سمجھتے ہوئے ہنس کر بولی۔

"چلو دل چھوٹا مت کرو' وہ دیکھو دادی بچوں کو چھت سے اتارنے کے لیے دیسی حلوہ بانٹ رہی ہیں۔"

"واقعی؟ ماسی زہراں کے گھر بعد میں چلتے ہیں۔ پہلے دادی سے حلوہ تو لے لیں۔ تمہیں تو پتا ہے دیسی حلوہ میری کمزوری ہے۔"

خوشی سے چہکتے ہوئے کوکب نے دادی کی طرف دوڑ لگا دی اور اس کے پیچھے صوفیہ بھی مسکراتے ہوئے چھت سے نیچے اتر آئی۔



مصباح خادم



وہ آخری پیپر دے کر کالج سے لوٹی تھی ٔ جب ندرت خالہ کی آواز سنائی دی ٔ جو ہمیشہ کی طرح امی کے سامنے اپنا دکھڑا رو رہی تھیں۔

"اب تم ہی بتاؤ اسما! کہ میں کیا کروں؟ وہ تو سمجھتی ہی نہیں کہ میں کتنی مجبور ہوں۔"

کپڑے بدلتے ہوئے اسے دوسرے کمرے سے آتی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ ٹھنڈے پانی کا گلاس لے کر کمرے میں آگئی۔

"اب کیا ہو گیا ندرت خالہ!" سلام دعا سے فارغ ہوتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

ندرت خالہ اور امی کا ساتھ کافی پرانا تھا۔ سو دونوں گھروں کی کوئی بات ایک دوسرے سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ ندرت خالہ کی صرف ایک ہی اولاد تھی ارم ٔ جو قسمت سے اچھے گھرانے میں بیاہی گئی تھی ٔ اس لیے آئے روز میکے کی وجہ سے اس کی ناک کٹنے کا اندیشہ رہتا تھا اور اس کے اسی اندیشے نے ہر دوسرے دن ندرت خالہ اور نیاز انکل کو مشکل میں ڈالا ہوتا تھا۔

نیاز انکل ایک ریٹائرڈ کلرک تھے اور تیس سال حکومت کی خدمت کے بدلے آج کل پانچ ہزار روپے بطور پنشن وصول کر رہے تھے۔ ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقم تو وہ ارم کی شادی پر خرچ کر چکے تھے لہٰذا اب یہی پنشن ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ تھی۔ جس میں ندرت خالہ کو اس مہنگائی کے دور میں گھر اور ارم کی سسرال دونوں کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ آئے روز بیٹی کی ناراضی بھی برداشت کرنی پڑتی تھی۔ اس بار بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا ٔ ندرت خالہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔

"ہونا کیا ہے بیٹا...! اس ہفتے ارم کے بڑے والے اسفر کی سالگرہ ہے ٔ اور اس کا وہی ازلی مسئلہ کہ تحفہ اچھا لے کر آئیں ورنہ سسرال میں اس کی بے عزتی ہو گی۔ اب تمہیں تو پتا ہے کہ پچھلے دنوں تمہارے انکل کی طبیعت کتنی خراب رہی ہے۔ کافی پیسہ ان کے علاج پر خرچ کرنا پڑا تھا ٔ اس لیے پہلے جو تھوڑی بہت بچت کر لیتی تھی اس بار وہ بھی نہیں کر سکی۔ اب گنے چنے چند سو روپے میں باقی کا مہینہ گزاروں یا مہنگا تحفہ خریدوں؟"

"تو کیا آپ نے یہ بات ارم باجی کو نہیں بتائی؟" اس نے حیرت سے استفسار کیا۔

"بتائی تھی ٔ مگر اس پر کیا اثر ہونا تھا۔ کہنے لگی ٔ اگر آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں تو میری بے عزتی کروانے سے بہتر ہے کہ آپ لوگ آئیں ہی نہیں... میں کوئی بہانہ کر دوں گی۔" وہ افسردہ لہجے میں بولیں تو ہما کو دکھ سا ہوا۔

"تو ٹھیک ہے نا خالہ... پھر کیا ضرورت ہے اتنی مشکل کر کے جانے کی ٔ زیادہ سے زیادہ ارم باجی ناراض ہی ہوں گی نا ٔ تو ہوتی رہیں۔ جب انہیں آپ لوگوں کا خیال نہیں ہے تو آپ اور انکل بھی ان کی پروا کرنا چھوڑ دیں۔" اس نے سنجیدگی سے مشورہ دیا تھا۔ جس پر عمل کرنا ان دونوں میاں بیوی کے بس میں نہیں تھا۔

"کیسے چھوڑ دیں ہما بیٹا! اس کا احساس تو مر گیا ہے ٔ

پر ہم ماں باپ ہونے کے ناطے اتنے کٹھور دل کیسے بنیں۔ اکلوتی اولاد ہے وہ ہماری ٔ اگر وہ بھی ہم سے ناراض ہو گئی تو کس کے سہارے جئیں گے اس بڑھاپے میں..." وہ بے بسی سے اپنی مجبوری بیان کر رہی تھیں ہما کو غصہ آنے لگا۔

"اسی بات کا تو فائدہ اٹھاتی ہیں وہ۔"

"اٹھاتی رہے بیٹا! بس خوش رہے... ہمیں اور کیا چاہیے۔ اسما! تم مجھے پیسے دے دو۔ ان شاء اللہ اگلے مہینے کی پنشن ملتے ہی واپس کر دوں گی۔ ابھی تمہارے بھائی کو بھوک لگ رہی ہو گی ورنہ بیٹھتی کچھ دیر اور..." وہ نرمی سے اسے جواب دے کر اسما سے بولیں تو وہ فوراً" الماری کی طرف بڑھ گئیں۔

"پتا نہیں! یہ شادی کے بعد بیٹیاں اتنی بے حس کیوں ہو جاتی ہیں؟ وہ ماں باپ... جنہوں نے انہیں



پیدا کیا، پالا پوسا، اتنی محنت سے پروان چڑھایا، سب کچھ بھول کر اتنی خود غرض ہو جاتی ہیں کہ صرف اپنی خوشیوں اور آسانی کے لیے ماں باپ کی زندگی کو کتنا مشکل بنا رہی ہیں۔ انہیں پروا ہی نہیں ہوتی۔" اسما جب ندرت خالہ کو چھوڑ کر واپس آئیں تو وہ غصے میں بھری بول رہی تھی۔ تب ہی ردا نے شرارت سے اسے چھیڑا۔

"کیا پتا آپا...! تم بھی شادی کے بعد ایسے ہی امی کو پریشان کرو، ابھی جو اتنا بڑھ چڑھ کر بول رہی ہو۔" اس نے ردا کی بات پر پہلے اسے گھورا، پھر مسکراتے ہوئے اسما کے پاس جا بیٹھی۔

"جی نہیں... میں اپنی امی سے بہت پیار کرتی ہوں۔ ان کی ساری محنت، ساری ریاضت میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جسے میں چاہوں بھی تو فراموش نہیں کر سکتی، اس لیے میں کبھی اپنی امی کے ساتھ ایسا نہیں کروں گی۔" اس نے اسما کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے پورے یقین سے کہا تھا۔ اسما کے دل سے بے ساختہ آمین کی صدا بلند ہوئی اور ساتھ ہی آنکھوں کے جھروکوں میں وہ وقت آ کر ٹھہر گیا، جب ان کے شوہر رحمان شہادت کا درجہ پا کر سبز ہلالی پرچم میں لپٹے تابوت میں گھر لوٹے تھے۔

وہ ایک فوجی تھے اور بارڈر پر دشمن کی اندھا دھند فائرنگ کے نتیجے میں نہ صرف اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، بلکہ اسما کو بھی بیوگی کی چادر اوڑھا کر بالکل تنہا کر گئے تھے۔ اسما ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں، سو ماں باپ اور شوہر کے دیے مفارقت کے داغوں کے بعد اپنی دو بچیوں کے سوا ان کے پاس اور کوئی دنیاوی سہارا نہیں تھا۔

اب اپنی بچیوں کی پرورش ان کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ چنانچہ انہوں نے شوہر کی شہادت کے نتیجے میں حکومت سے ملنے والی رقم، ندرت خالہ کے مشورے سے ہما اور ردا کے مستقبل کی خاطر بینک میں محفوظ کر دی اور خود شوہر کی پنشن پر آسرا رکھنے کے ساتھ اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کا سوچا اور قلیل تنخواہ پر ہی سہی، قریبی پرائیویٹ اسکول میں ملازمت اختیار کر لی۔

یوں کم آمدنی کے باوجود صبر اور توکل کے ساتھ گھر کی گاڑی چلنے لگی۔ ساتھ ہی اسما اپنی ضرورتوں سے منہ موڑ کر کبھی کبھار کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیتی تھیں۔ بچیاں بھی سرکاری اسکولوں میں ہی سہی مگر اپنی محنت کے بل پر تعلیمی مدارج طے کرنے لگی تھیں اور یوں وقت اپنی مخصوص ڈگر پر بھاگتا دوڑتا آج اسما کو اس مقام پر لے آیا تھا کہ باپ کی عدم موجودگی کے باوجود انہوں نے اپنی بیٹیوں کی شخصیت کو بگڑنے نہیں دیا۔ وہ اچھی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ پراعتماد بھی تھیں، اور اب اسما کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ وہ خیر خیریت سے اپنی بیٹیوں کو ان کے گھر کا کر دیں اور اپنی اس آخری ذمہ داری سے بھی خوش اسلوبی سے سبکدوش ہو جائیں۔

"اللہ سب کی بچیوں کے صدقے، میری بچیوں کا نصیب بھی اچھا کرے۔" ان کے دل نے بے اختیار رب کے حضور التجا کی تھی۔

✡ ✡ ✡

ان کی دعا اتنی جلدی قبول ہو جائے گی، اس کا انہیں خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ ہما کا ابھی رزلٹ بھی نہیں آیا تھا کہ اس کا رشتہ ایک بہت اچھی جگہ پر طے پا گیا۔

ہوا کچھ یوں کہ ندرت خالہ کی طبیعت کافی دن خراب رہنے کے بعد سنبھلی تھی، اس لیے ہر روز ہی کوئی نہ کوئی عیادت کے لیے چلا آتا۔ وہ چونکہ اکیلی تھیں، اس لیے ہما تقریباً روزانہ تھوڑا بہت وقت نکال کر ان کا ہاتھ بٹانے پہنچ جاتی۔ اس دن بھی وہ ادھر ہی تھی، جب ندرت خالہ کی ایک دور پرے کی رشتے دار ان کی بیماری کا سن کر عیادت کو آئیں اور دیکھتے ہی ہما کو اپنے بیٹے وسیم کے لیے پسند کر لیا۔

وسیم دو بہنوں کا ایک ہی بھائی تھا اور ایک بہت

اچھی پرائیویٹ کمپنی میں گرافک ڈیزائنر کی جاب کرتا تھا۔ والد حیات نہ ہونے کی وجہ سے گھر کا واحد کفیل بھی تھا۔

اسما کو اقرار نہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ ان لوگوں کو شادی کی جلدی تھی لہٰذا منگنی وغیرہ کے جھنجھٹ میں پڑے بغیر ڈائریکٹ شادی کی تاریخ طے کر دی گئی۔ اسما کے پاس اچھے وقتوں کا بنا ہوا زیور، رحمان کی شہادت پر ملنے والی رقم اور اپنی جمع پونجی سب کچھ انہوں نے دو حصوں میں تقسیم کر کے ہما کا مقدر اس کے حوالے کیا اور خیریت سے اسے رخصت کر دیا۔

جس نے بھی دیکھا، بے اختیار اسما کی تعریف کی۔ جس نے بیوگی کے باوجود بھی اپنی بساط سے کہیں بڑھ کے کیا تھا اور یہ صرف شادی تک کی بات نہیں تھی۔ بعد میں بھی جب جب ہما کی سسرال میں کوئی موقع آیا، خواہ وہ ہما کی بڑی نند کی شادی کا معاملہ ہو یا کوئی اور اسما نے کبھی کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔

لیکن اس بار مسئلہ کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ اسما چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ دراصل ہما امید سے تھی اور اس کی ڈلیوری میں چند ہی دن باقی تھے، جب ردا کی ایک کلاس فیلو اپنے بھائی کے لیے اس کا رشتہ لے کر آ گئی۔ لڑکا سلجھا ہوا تھا اور اپنا کاروبار کرتا تھا۔ اسما نے اللہ کا شکر ادا کیا اور بیٹی داماد سے مشورہ کر کے رشتے کے لیے ہاں کہہ دی۔

ان ہی دنوں ہما کو اللہ نے بیٹے سے نوازا۔ اس طرف سے خیر کی خبر ملی تو ردا کے سسرال والوں نے منگنی کی خواہش ظاہر کر دی۔ ان کے پہلے بیٹے کی خوشی تھی، اس لیے وہ لوگ بہت پرجوش تھے۔ اسما تو بوکھلا کر رہ گئیں۔ ابھی ہما کے گھر بھی تحفے لے کر جانے تھے۔ اتنے اخراجات وہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں، اس لیے ردا کے سسرال والوں سے معذرت کر لی مگر وہ بضد تھے۔ آخر ان کی مجبوری دیکھ کر یہاں تک کہہ دیا کہ صرف گھر والے آ کر رسم کر جائیں گے۔

اب اسما مزید کیا کہتیں ' نئے نئے تعلقات تھے ' زیادہ بول بھی نہیں سکتی تھیں ' سو چار و ناچار راضی ہونا ہی پڑا۔ انہی بکھیڑوں سے نمٹتے نمٹتے دو ہفتے بعد ہی مبارک باد دینے اور نواسے کو دیکھنے ہما کے سسرال جا سکی تھیں۔

ایک اچھا سوٹ داماد کا اور دو بیٹی کے تھے۔ اس کے علاوہ چند ریڈی میڈ سوٹ نواسے کے اور کچھ دیگر استعمال کی چیزوں کے ساتھ مٹھائی بھی ان کے ہمراہ تھی۔ اس مہنگائی کے دور میں انہی چیزوں نے ان کا کباڑہ نکال دیا تھا۔ اسی لیے وسیم کی ماں بہنوں کے لیے وہ کچھ نہ لے سکیں ' لیکن مطمئن تھیں کہ ایک تو انہوں نے پہلے کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لہٰذا کبھی کبھار کمی بیشی ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا اور دوسرے وہ لوگ بھی لالچی نہیں تھے۔ ان کی مجبوری سمجھ جاتے۔

اسی امید کے ساتھ وہ ہما کے گھر پہنچی تھیں ' جہاں انہیں کافی اچھے طریقے سے خوش آمدید کہا گیا۔ اپنے لائے ہوئے تحائف دکھانے کے بعد بھی ان کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ پا کر وہ کافی پرسکون ہو گئی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ لوگ کھانے کا انتظام کرنے اٹھ گئیں۔ وسیم کا بھی کوئی دوست آ گیا تو وہ بھی معذرت کرتا باہر چلا گیا۔

"یہ کیا کیا امی آپ نے؟" ان کے جانے کے بعد اسما مطمئن سی نواسے کو پیار کر رہی تھیں ' تب ہما کی سخت سی آواز نے انہیں متوجہ کیا۔

"کیا مطلب۔۔۔ کیا کیا ہے میں نے؟" وہ واقعی نہیں سمجھی تھیں ' ہما کو مزید غصہ آ گیا۔

"اتنی ناسمجھ تو نہیں ہیں امی آپ۔۔۔ دنیا بدل چکی ہے۔ فریحہ باجی تو چلیں ' دوسرے ملک چلی گئیں شادی کے بعد ' مگر خالدہ آنٹی اور موش کے لیے تو کچھ نہ کچھ لانا چاہیے تھا نا آپ کو۔۔۔!" وہ خفگی سے کہہ رہی تھی۔

اسما نے حیرت سے اس کے تپے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ یہ بات وہ آرام سے بھی ان سے پوچھ سکتی تھی مگر خیر۔ انہوں نے نظر انداز کرتے ہوئے اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔

"میں ضرور لاتی بیٹا! مگر سچی بات ہے کہ میرے پاس بالکل گنجائش نہیں تھی اور ویسے بھی وہ لوگ کافی اچھے دل کی ہیں انہوں نے ہرگز برا نہیں مانا۔ اس لیے تم پریشان مت ہو۔" انہوں نے اسے تسلی دی تو وہ طنز سے گویا ہوئی۔

"جی۔ یہ انہی کی اچھائی ہے ورنہ آپ نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بیٹی داماد اور نواسے کے لیے چیزیں لے آئیں اور ان ماں بیٹی کے لیے کچھ نہیں۔ اس طرح تو آپ نے صاف صاف انہیں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آپ انہیں ہم لوگوں سے الگ سمجھتی ہیں اور ذرا بھی اہمیت نہیں دیتیں۔"

"ایسی بات نہیں ہے ہما!" انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تم جانتی تو ہو کہ اس اتوار کو ردا کی منگنی ہے۔ اب بیٹا میں غریب عورت۔۔۔ اتنا تو نہیں کر پاتی کہ۔۔۔" وہ اپنی صفائی دینے کی کوشش کر رہی تھیں جب ہما ان کی بات کاٹ کر درشتی سے بولی۔

"اوہ۔۔۔ تو یوں کہیں نا کہ نیا سمدھیانہ ملنے سے پرانے سمدھیوں کی وہ قدر نہیں رہی۔ ورنہ جہاں ردا کے سسرال والوں کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے ' وہاں میرے سسرال کے لیے کیوں نہیں؟"

"ہما۔۔۔!" اسما کتنی ہی دیر بے یقینی سے اسے دیکھے گئیں۔ یہ ان کی وہی بیٹی تھی ' جو ہاتھ تنگ ہونے کی صورت میں موسم کے کپڑے لینے سے بھی منع کر دیتی تھی۔ ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے گھر میں ٹیوشن پڑھاتی تھی۔ اپنی ماں کی مشقت بھری زندگی کو دیکھ کر جو انہوں نے صرف اپنی اولاد کے لیے کاٹی ' انہیں دنیا کی سب سے اچھی ماں قرار دیتی تھی۔ آج وہی بیٹی ان کے گھریلو حالات یکسر فراموش کیے ان کے اتنے شوق اور محبت سے لائی ہوئی چیزوں پر دوسری نظر ڈالے بغیر صرف

اس لیے انہیں باتیں سنا رہی تھی کہ وہ اس کی ساس اور نند کے لیے کچھ نہیں لا سکی تھیں۔ دکھ سے ان کی آنکھیں بھر آئیں اور جب بولیں تو وہی دکھ آواز میں بھی گھل گیا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا ہما! کہ تم جوڑوں کے لیے اپنی ماں کی نیت پر شک کر رہی ہو؟"

"بات جوڑوں کی نہیں ہے امی!" وہ دو ٹوک انداز میں بولی ' ان کی نم آواز سے قطعی بے پروا۔ "بات اصول کی ہے۔ جب وہ لوگ مجھے اتنی عزت اور مان دیتے ہیں ' اتنا خیال رکھتے ہیں میرا۔۔۔ تو آپ کا بھی تو فرض بنتا ہے نا کہ انہیں شکایت کا کوئی موقع نہ دیں۔ بالفرض اگر آپ کے پاس پیسے نہیں بھی تھے تو کسی سے ادھار لے لیتیں اور بعد میں واپس کر دیتیں۔ آپ کو یہ ان کے لیے نہیں ' میری آسانی کے لیے کرنا تھا امی۔۔۔ لیکن آپ کو تو خیال ہی نہیں۔ اب مجھے خود ہی کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا آپ کی طرف سے۔ ظاہر ہے بھگتنا بھی تو مجھے ہی ہے نا ' آپ کو کیا پروا۔۔۔"

وہ نتھنے پھلا کر کہتی ' انہیں ان کی کوتاہیاں گنوانے کے ساتھ ساتھ سبق بھی پڑھا رہی تھی ' ایک بار بھی یہ سوچنے کی زحمت کیے بغیر کہ جس ادھار کو لینے کا مشورہ وہ اپنی ماں کو دے رہی ہے اسے لوٹانے میں اسما کو کتنی مشکل اٹھانی پڑ سکتی ہے ' جو پہلے ہی گھر کا ماہوار خرچہ کھینچ کھینچ کر پورا کیا کرتی تھیں۔ اسما نے بھی اسے کچھ یاد دلانا مناسب نہ سمجھا ' بس خالی خالی نظروں سے اس کے بے لچک چہرے کو دیکھے گئیں۔

اور یاد دلانے کا فائدہ بھی کیا تھا کہ سامنے بیس سال پل پل ان کی قربانیوں کی گواہ ان کی حساس بیٹی کی جگہ وہ گھر گرہستن عورت بیٹھی تھی کہ جسے سامنے دکھائی دیتے رشتوں کی آسانی اور ہمواری ' پیچھے رہ جانے والے مشقت بھرے رشتوں سے کہیں زیادہ عزیز تھی۔

تبدیلی کا عمل شروع ہو چکا تھا اور اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور اسما کے پاس اس کے سامنے سر جھکانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"معافی چاہتی ہوں بیٹا! میری وجہ سے تمہیں اور تمہارے سسرال والوں کو اتنی پریشانی اٹھانی پڑی۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے پرس میں ڈالا ہاتھ ہما کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ تین ہزار روپے ہیں ' میری طرف سے اپنی ساس اور نند کو جوڑوں کے لیے دے دینا۔" یہ وہ پیسے تھے جو انہوں نے ردا کی منگنی کے لیے اسکول سے ایڈوانس لیے تھے اور ابھی واپسی پر وہ ان سے خریداری کا ارادہ رکھتی تھیں۔

"ارے امی۔۔۔ آپ پیسے لائی تھیں تو پہلے کیوں نہیں۔۔۔!" اس کی آواز میں اچانک بشاشت گھل گئی تھی مگر اسما چاہ کر بھی اس کا ساتھ نہ دے سکیں اور باوجود ہما کی ساس اور نند کے روکنے کے ' جلد ہی وہاں سے اٹھ آئیں۔

واپسی کا سفر خاصا طویل اور دل گرفتہ تھا۔ ردا کی منگنی کے لیے اب ان کے پاس ہما کے مشورے پر عمل کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

"محبت اور احساس کی مٹی سے گندھی یہ بیٹیاں ' خدا جانے شادی کے بعد اتنی کٹھور اور بے حس کیوں ہو جاتی ہیں؟"

کبھی کا اٹھایا ہما کا سوال آج ان کا اپنا دل ان سے پوچھ رہا تھا مگر ایک جامد خاموشی کے سوا اسما کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ گہری سانس خارج کرتے ہوئے انہوں نے ایک نظر آگ برساتے سورج پر ڈالی اور تھکے تھکے قدموں کو گھر کے رستے پر ڈال دیا۔



شہزادی عباس خلجی

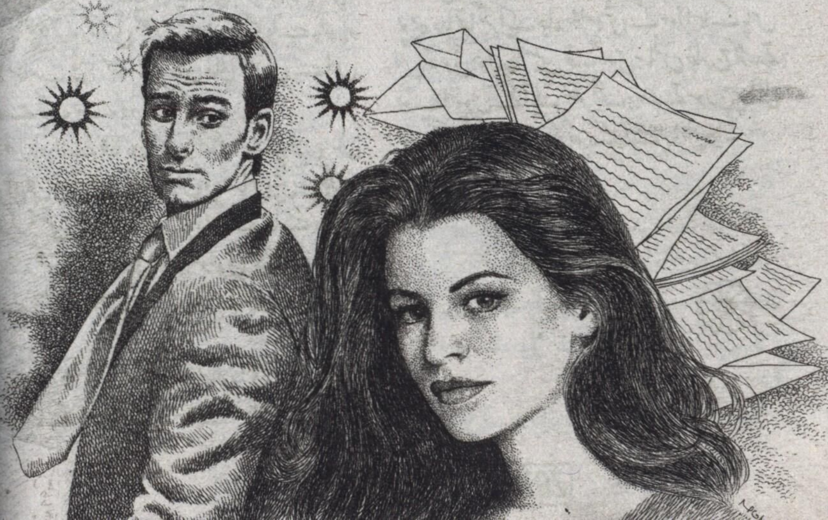
رنگِ خواب اور ریشم

ایک لفظ ہے محبت۔
چار حروف پر مشتمل یہ لفظ انسان کی دنیا تہ و بالا کرنے اور اس کی ذات زیروزبر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

محبت کا فسوں ہر ذی روح کو بے بس کیے رکھتا ہے۔

لفظوں کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے مترنم جذبے..... کنول سے بھی بڑھ کر شگفتہ اور نرم..... شبنم کی پہلی بوند سے زیادہ معطر اور پاک لگتے ہیں۔
یقیناً" یہ تحفہ خاص دلوں کو ودیعت کیا جاتا ہے۔
اس کے خواب پھر خواب نہیں رہتے' ستاروں سے سجی دھنک کے سارے رنگوں سے اجلی اور پھولوں کی خوشبوؤں سے معطر ایک گلستان کا روپ بھر لیتے ہیں۔
کہیں یہ حیات بخش ہے' تو کہیں مژدۂ موت۔
حاصل اور لاحاصل رہ جانے والوں کے لیے اس کے معنی و مفاہم مختلف ہیں۔ جو اس گوہر نایاب کو پالے' وہ اسے طاقت مانتا ہے' جو نہ پا سکے وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی سی زندگی گزارتا ہے۔
محبت کے اس نازک ترین صاف و شفاف آبگینے پر اگر ذرا سی بھی شک کی دھول جم جائے تو نظر پھر کچھ بھی نہیں آتا' بچتا پھر کچھ بھی نہیں۔

مکمل ناول



یہ ڈھول اس فرد کو مٹی میں ملا چھوڑتی ہے، جو محبت کے شہر کا باسی ہو۔ محبت جادو کی وہ پٹاری ہے جسے کھولنے والا جوا کھیلتا ہے، پھر اس کے نصیب میں جو بھی نکلے... اسے قبولنا ہی پڑتا ہے۔

✡ ✡ ✡

گرمیوں کی تپتی سڑکوں کو ناپتے ہوئے پسینے سے شرابور چہرے کو ٹشو پیپر سے پونچھتی تیزی سے "دم الحمرا" کی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے وہ ہال میں داخل ہوئی تھی۔ اصولاً "اسے پینتالیس منٹ قبل پہنچنا چاہیے تھا۔ مگر کیا کیجیے اس پبلک ٹرانسپورٹ کا... تیز دھوپ میں جلتی جھلستی وہ پہنچ تو گئی تھی، مگر ابھی اسے سر رضا کی پھٹکار وصولنا باقی تھی۔

ہال کی ایر کنڈیشنڈ فضا میں قدم دھرتے دور سے ہی اسے سر رضا کی قہر آلود نظروں کا سامنا ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے وضاحت دینے کو پاس پہنچی، لیکن ایک لفظ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے منہ کھولنے سے روکا اور سرد مہری کی انتہا کرتے ہوئے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہا۔

"مس زہرہ! آپ یقیناً" ٹریفک میں پھنسی ہوں گی؟"

اس کے گلے سے گھٹی گھٹی سی "جی" نکلی۔

"کوئی بات نہیں! آپ کا کام مہرین سنبھال چکی ہیں۔ اب آپ ناظرین کے ساتھ ہی تشریف رکھیں اور پروگرام سے محظوظ ہو کر ہمیں شکریہ کا موقع دیں۔" طنزیہ کہا گیا۔

اس کے منہ سے "پلیز سر... سوری سر۔" کے بمشکل نکلتے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے تھے۔ کیونکہ سر رضا اسٹیج کی جانب بڑھ چکے تھے۔

اس نے مڑ کر مہرین اور اس کے ہاتھ میں تھمے کیمرے کی طرف شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا اور پیر پٹختی تیسری رو کی کرسیوں میں سے ایک پر دھپ سے بیٹھ گئی۔ ساری محنت اکارت گئی تھی اور ساری بھاگ دوڑ بے کار۔

گھر سے اس جھلستی دوپہر میں نکلتے ہوئے اماں کی جھڑکیاں سنی تھیں۔ بس اسٹاپ پر گھنٹہ بھر انتظار کرتے ہوئے سورج سے مقابلہ کرنے کے بعد شان سے خراماں خراماں آتی بس میں آدھا گھنٹہ کھڑے ہو کر سفر کرنے کی مشقت اٹھائی۔ دھوپ میں جلتے پسینہ پسینہ ہوئے چہرے کی خوب صورتی بھی متاثر کروائی اور یہاں سب رائیگاں چلا گیا۔

کالج کی ایک ورکشاپ کے اختتام پر کلچرل پروگرام کے لیے رضاکارانہ طور پر کام کرنے والے طلبا درکار تھے۔ یوں تو وہ رج کے کاہل اور ہڈ حرام تھی۔ لیکن کام کی نوعیت جان کے وہ لمحوں میں پرجوش ہوئی تھی۔ فوٹو گرافی کا جنون اسے شروع سے تھا۔ یوں اس کلچرل پروگرام کے انچارج سر رضا سے کہہ کر یہ ذمہ داری اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھانے کے لیے ایک "شارٹ ٹیسٹ" بھی پاس کیا تھا۔ تب کہیں جا کے اس کی اہل قرار پائی تھی۔ وقت سے پہلے پروگرام میں پہنچنا شرط تھی۔ مگر وائے ری قسمت۔

قسمت کی ستم ظریفی پر عمر بھر کے جلنے کڑھنے کے بعد اب وہ چپ چاپ بے زاری سے اسٹیج پر پروگرام دیکھنے میں مصروف تھی، جہاں لائٹس آف کرنے کے بعد کلاسیکی رقص سے آغاز کیا جا چکا تھا۔ تب ہی کوئی اس کے ساتھ والی نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی خوشبو کا ایک مہکتا جھونکا اس کی سانس کے ساتھ اندر اترا تھا۔ اس نے بے اختیار گردن موڑ کر دائیں طرف دیکھا۔

اجنبی شخص کے وجیہہ چہرے پر سجی دو بڑی بڑی روشن آنکھیں اسٹیج پر جمی تھیں۔ نیم روشن ہال میں صرف اسٹیج پر ہی مختلف رنگوں کی روشنیاں ڈرامے میں منظر کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدل رہی تھیں اور ویسے ویسے اجنبی کی کشادہ آنکھوں میں رنگ بدل رہے تھے۔ زہرہ نے ایسی دھنک رنگ آنکھیں پہلی بار دیکھی تھیں۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ متعجب سی سوچتی رہی کہ بھلا وہ کون سا رنگ ہے جو اجنبی کی آنکھوں میں اتر کر انہیں اتنا خاص بنا رہا ہے۔

وہ پلک جھپک کر جب جب آنکھیں کھولتا۔ ان میں ایک نیا رنگ ہوتا۔ ایک نیا سحر ہوتا... زہرہ کو لگا وہ ان میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی ہے۔ کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔

"کیا محبت محض لمحوں کا کھیل ہوتا ہے؟"

کسی انجانے طلسم نے زہرہ کو انسان سے پتھر کی مورتی میں بدل ڈالا تھا۔

"کیا محبت کسی کو جانے، سمجھے، بوجھے بغیر بھی ہو سکتی ہے؟" وہ دنگ تھی۔

"لیکن... محبت؟" اس کا دل پھیل کر سمٹا تھا۔

ابتہاج بڑی دیر سے خود پہ جمی دو نگاہوں کو محسوس کر رہا تھا۔ مگر کافی وقت گزرنے کے بعد بھی جب نظروں کے انہماک میں فرق نہ آیا تو مجبوراً" اسے چہرہ موڑ کر اس کی طرف دیکھنا پڑا۔ سفید لباس میں گلابی صبیح رخساروں والی لڑکی مبہوت ہو کر یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

اس کی گہری آنکھوں میں لمحہ بھر کو تحیر کا رنگ ابھرا۔ لیکن اگلے ہی پل وہ ہولے سے مسکرا دیا۔ یہ دیکھنے والی لڑکی کا سکتہ توڑنے کی ایک کوشش تھی۔ لیکن وہاں رتی بھر بھی فرق پڑنا تو دور، پلک تک نہ جھپکی گئی تھی۔

ابتہاج اٹھا اور آگے والی رو میں جا کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ اس کا وہ دوست آ گیا تھا جس نے اسے یہاں کا دعوتی پاس دیا تھا۔ سامنے کرسی کی پشت پر دونوں ہاتھ سختی سے جمائے زہرہ اتھل پتھل دل اور زیر و زبر ہوتی دنیا کو سنبھالتے ہوئے گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

"یہ کیا ہو گیا تھا مجھے... کیا سوچتا ہو گا وہ... کیسی ہونق لگی ہوں گی میں... اف... میں اتنی بے شرم تو نہیں ہوں۔" اس کی شرمندگی عروج پر پہنچ گئی۔

بس ایک لمحہ لگا تھا۔

ایک اجنبی کی آنکھوں کے ہزار رنگ اسے اپنا اسیر کر چکے تھے۔

✡ ✡ ✡

طائر وقت اپنی پرواز جاری رکھے اڑتا رہا۔ امتحانات کے بعد انٹرن شپ کے لیے اسے ایک ادارہ جوائن کرنا پڑا۔ گرمیوں کے طویل تھکا دینے والے دنوں میں یہ بے جا مشقت اس پہ بہت گراں گزرتی۔ اس روز کے لمحاتی ٹکراؤ نے اس کا دل باقی ہر شے سے اچاٹ کر ڈالا تھا۔ اگر کچھ یاد رہتا تو دو بڑی بڑی دھنک رنگ آنکھیں اور ان کا سحر۔

ایسے ہی ایک گرم دن کسی سہ پہر میں آفس کے ایک کیبن میں اپنی ٹیبل پر دھرے کاغذوں پر تیزی سے قلم چلاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر خوشبوؤں کا ریلا اپنے ارد گرد پھیل کر سانس میں اترتا محسوس کیا اور بے ساختہ نظریں اٹھانے پر ان ہی دھنک رنگ گہری آنکھوں کو خود پر سجے پایا۔

اسے لگا یہ اس کا الوژن ہے۔ پچھلے ایک ماہ میں ایسا اس کے ساتھ کئی بار ہو چکا تھا۔ لیکن آنکھیں پوری وا کیے، پلک جھپک جھپک کر دیکھنے کے بعد بھی وہ ہیولا ہوا میں تحلیل ہوا نہ منظر سے یک دم غائب ہوا... وہ تو مجسم صورت اس کے سامنے تھا۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ فرصت سے ایک بار پھر اس کا انہماک دیکھتے ہوئے محظوظ ہونے لگا۔

اب کی بار ابتہاج کی آنکھوں میں تحیر نہیں ابھرا تھا بلکہ شناسائی کی ایک ہلکی سی چمک ابھری تھی اور ہونٹوں پہ شریر مسکراہٹ۔

کچھ لمحوں بعد از خود ہوش میں آنے پر وہ بری طرح گڑبڑائی اور حواس باختگی میں ہاتھ لگنے سے میز پر دھرا پانی کا گلاس زمین بوس ہو رہا۔

"اف... یہ کیا ہو رہا ہے؟" شرمندگی کا گراف بلند ہونے لگا... وہ زیریں لب دانتوں میں دبائے گھبرا کر کبھی اسے اور کبھی کانچ کے ٹوٹے گلاس کو دیکھنے لگی۔ اس کی بوکھلاہٹ کو ناسمجھی اور قدرے ناگواری سے دیکھ کر وہ پلٹا اور سامنے کے کیبن میں بیٹھی مس

ثیریں سے مطلوبہ معلومات لے کر محسن ربانی کے کیبن کی طرف بڑھ گیا۔

"حماقت کی بھی حد ہوتی ہے یار۔ میں اسے یقیناً ایک نفسیاتی کیس لگی ہوں گی۔"

یہ سب سوچتے سوچتے چھٹی کا وقت ہو گیا۔ بے دلی سے سامان سمیٹ کر وہ فولڈر تھامے' بیگ کندھے پر لٹکائے باہر نکل آئی۔ مگر موسم کے تیور دیکھ کے اس کی پریشانی حد سے سوا ہو گئی۔

آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور بوندیں پڑنے کا آغاز ہو چکا تھا۔

"صبح تک تو مطلع بالکل صاف تھا۔ بلکہ اچھی خاصی گرمی تھی۔ ایک تو اگست کا یہ پل پل بدلتا مزاج..." اسے تشویش ہونے لگی۔

بس اسٹاپ بھی تقریباً" سات' آٹھ منٹ کی پیدل مسافت پر تھا اور ان موٹی ٹپاٹپ برستی بوندوں میں خود کو جھونکنا پاگل پن کے مترادف ہی ہوتا۔ وہ آفس کے کے گیٹ پر شیڈ کے نیچے کھڑی برستی بے رحم بارش کو لب کچلتے ہوئے دیکھ رہی تھی کہ باہر نکلتے ابتہاج نے اسے الجھن میں مبتلا دیکھ کے قدم اس کی جانب موڑ لیے اور قریب آ کر کھنکھارا۔

"بھروسا کریں تو آیئے میں آپ کو ڈراپ کردوں۔" فراخدلی سے آفر کی گئی۔

"نن... نہیں... شکریہ! میں چلی جاؤں گی۔ بارش ابھی رک جائے گی۔"

"دیکھیے! میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

زہرہ نے بڑے غور سے چہرے پر دیکھنے کی کوشش کی۔

"شرافت کا سرٹیفکیٹ میں ماتھے پر لیے نہیں گھومتا محترمہ!" شریر مسکراہٹ کے ساتھ کہے جملے نے اسے خجل سا کردیا۔

"کوئی گارنٹی چاہیے تو میں... ابتہاج یوسف، محسن ربانی کا اکلوتا بھانجا ہوں۔ چاہیں تو یہ میرا شناختی کارڈ رکھ لیں' تاکہ آپ کی میرے دہشت گردوں سے تعلق داری کی سوچ بدل سکے۔" ابتہاج کو حقیقتاً" ساری صورت حال مزا دے رہی تھی۔

زہرہ نے اس کے چہرے پر اک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ گویا فیصلہ کرنے میں دشواری کو حل کرنے کی کوشش کی ہو۔ وہاں متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ آنکھوں کا شرارتی پن اب تک واضح تھا۔

اس کا اثباتی انداز دیکھ کر ابتہاج پلٹا اور اس کی تقلید میں چلتی ہوئی وہ بھی گاڑی میں آ بیٹھی۔ وہ موسم کی خوش گواریت کے باوجود پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ بدحواسی میں ہاتھ کی پشت سے ہی ماتھے اور بالائی ہونٹ کے اوپر نمودار ہوتے پسینے کے ننھے ننھے قطروں کو پونچھتی جارہی تھی۔

ابتہاج نے ونڈ اسکرین پر نظر جمائے جمائے اسٹیرنگ سے ایک ہاتھ اٹھا کر ڈیش بورڈ پر پڑے ٹشو باکس سے دو' تین ٹشو کھینچ کر اس کی طرف بڑھائے' اس نے بے دھیانی میں دائیں ہاتھ کی مٹھی میں دبا تو لیا' مگر بدحواسی میں پسینہ اب بھی بائیں ہاتھ کی پشت سے ہی صاف کیے جارہی تھی۔

"محترمہ! یہ ٹشو استعمال کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔" متبسم لہجے میں کہا گیا۔

"وہ... ہاں... جی اچھا۔" جانے وہ کیا بول رہی تھی۔ اس کی گھبراہٹ محسوس کر کے وہ خاموش ہو رہا۔ پھر گھر کا رستہ بتانے کے سوا زہرہ کچھ نہ بولی۔

"یہ سفید گیٹ کے سامنے..." اس کے نشان دہی کرنے پر ابتہاج نے گھر کے آگے گاڑی روک دی۔ بارش اب تک ہو رہی تھی۔

"اس تیز بارش میں آپ نے میری مدد کی... آپ کا بے حد شکریہ!"

تیز تیز دھڑکتے دل کے ساتھ نگاہیں نیچی کیے اس نے اظہار تشکر کر ڈالا۔

"آپ اندر آئیں۔" سر ربانی کے تعلق سے اس نے محض ازراہ مروت کہہ دیا۔

لیکن یہ کیا۔

وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اترا اور کمال بے نیازی سے چلتا ہوا اس سے پہلے ہی گیٹ پر جا کے ڈور بیل بجادی۔ زہرہ حق دق رہ گئی۔

دروازہ اماں نے کھولا تھا اور سامنے ایک اجنبی وجیہہ نوجوان کو سلام کرتے پا کر حیران ہوئیں۔

"اماں! یہ سر ربانی کے بھانجے ہیں' تیز بارش کی وجہ سے میں بس اسٹاپ تک نہیں جا پا رہی تھی تو انہوں نے میری مدد کی۔" اس نے محتاط ترین الفاظ میں تعارف کروا کے ساتھ آنے کی معقول ترین وجہ بھی گوش گزار کردی' کیونکہ اماں سخت گیر ماؤں میں سے تھیں۔

"اچھا... اچھا آؤ بیٹا! اندر آؤ۔" اماں اسے لیے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئیں۔ جبکہ وہ کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں پہنچی تو وہ اماں اور رومی کے ساتھ پکوڑے اڑانے میں مشغول تھا۔ جو یقیناً" زہرہ کے لیے بنائے گئے ہوں گے۔

اماں اس کا تفصیلی انٹرویو لے چکنے کے بعد اب اس کی شرافت اور متانت سے خاصی مطمئن دکھائی دے رہی تھیں... شاید ابتہاج نے انہیں بھی اپنا گرویدہ کرلیا تھا۔

☼ ☼ ☼

رومی محض تین سال کا تھا اور زہرہ پندرہ برس کی جب اس کے ابا مال سے بھرا ٹرک لے جاتے ہوئے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ سرکاری نوکری کے بعد لیدر کا کاروبار جمانے کی کوشش میں تھے۔ زندگی بڑی مشکل ہو جاتی اگر ابا کی پنشن اور اچھے وقتوں میں خریدی ایک دکان کے کرائے کا سہارا نہ ہوتا۔

اماں نے بہت کم عمری میں بیوگی کی چادر اوڑھ لی تھی۔ مگر اپنے بچوں کی خاطر خود کو مضبوط کرنے میں جتی رہیں اور اب تو حالات کا مقابلہ کرتے کئی سال بیت گئے تھے۔

انٹرن شپ کے بعد اچھی کارکردگی کی بدولت رزلٹ آنے سے قبل ہی اسے وہیں نوکری مل گئی۔ زندگی ڈھب پر آگئی تھی۔ پُر آسائش نہ سہی' بہت سوں سے اچھی گزر رہی تھی۔

اس روز کے بعد ابتہاج اکثر اماں اور رومی سے ملنے آتا رہتا۔ خصوصاً" اس وقت جب زہرہ گھر پر نہ ہوتی۔ اماں کو اس کی یہی شرافت بھا گئی تھی۔ اس میں عام مردوں جیسا چھچھورا پن نہ تھا۔ بلکہ طبیعت میں ایک ٹھہراؤ اور شخصیت میں ایک انوکھا وقار تھا۔ ملنساری اس کی ذات کا خاصا تھا۔ وہ دوسروں کے سکھ کی بہت پروا کرتا تھا۔ زہرہ کے گھر میں تین مکینوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ ابتہاج ذرا دیر کو بھی وہاں جاتا تو اس آدھے ایک گھنٹے میں اماں کے بہت سے ایسے کام کردیتا' جو کسی مرد کے نہ ہونے کی بدولت دنوں تعطل کا شکار رہتے۔

رومی ابھی چھوٹا تھا۔ چھٹی کلاس کا طالب علم تھا۔ سودا سلف لانے کی ذمہ داری تو وہ بخوبی پوری کردیتا تھا۔ مگر دور دراز کے کام وہ کرنے سے قاصر تھا۔

زندگی سبک روی سے پہاڑی ندی کی طرح گنگناتی گزر رہی تھی۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد زہرہ رات کے کھانے میں اماں کا ہاتھ بٹا کر بستر پر آلیٹتی تو چھم سے ابتہاج کا وجود اس کے خیالوں کی نگری کو اجال کر رکھ دیتا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ڈیرہ ڈال لیتی۔

کام کے سلسلے میں ابتہاج کا آفس میں آنا جانا لگا ہی رہتا۔ مگر خلاف توقع اس نے زہرہ سے کوئی بھی بات نہ کی.... ہاں مگر اس کے سلام کے جواب میں بھرپور توجہ سے حال چال دریافت کرتا انداز اسے بہت خاص کر جاتا۔

ابتہاج نے زہرہ سے کچھ نہ کہا تھا۔ مگر اس کی جانب اٹھتی ہر نگاہ زہرہ کو معتبر کردیتی' اسے خاص لوگوں کی صف میں کھڑا کرتی۔ عورت و مرد کی محبت کی داستان تو ازل سے چلی آرہی ہے' لیکن وہ کب اس کا حصہ بنی' اسے خبر ہی نہ ہوئی۔

محبت کی دیوی جب مہرباں ہوتی ہے تو قفل لگے دل یوں ہی وا ہو جاتے ہیں۔ محبت کرنے والا ہر شخص ایک سا ہے.... ان کے چہرے ایک سے ہیں ان کے نقوش جدا نہیں۔ ان کی سانسوں سے ایک سی مہک آتی ہے۔ ان کے دل ایک ہی طرز' ایک ہی لے پر دھڑکتے ہیں۔ ان کے لب ایک ہی دعا مانگتے ہیں.... وصال کی دعا' تکمیل کی دعا.... ملاپ کی دعا۔

ان کے بھیگے تکیے ایک ہی جذبے کی چغلی کھاتے ہیں۔ ان کے نام بھی مختلف نہیں۔ ایک محبوب ہے تو ایک محب.... اور ان کے گرد محبت کا مضبوط حصار.... انہیں یکجان کیے ہوئے.... انہیں مسمرائز کیے ہوئے.... ان کا ہر فرق' ہر امتیاز مٹا کر ایک قالب میں ڈھالتے ہوئے۔

زہرہ بھی خوش بختی کی اس ٹھنڈی میٹھی روشنی میں چلتے ہوئے اس انجانی رہ گزر پر قدم دھر چکی تھی۔

✲ ✲ ✲

محسن ربانی کا منجھلا بیٹا حال ہی میں لندن کے ایک بڑے ادارے سے بزنس مینجمنٹ کی ڈگری لے کر لوٹا تھا۔ آفس میں باقاعدہ طور پر چارج سنبھالنے سے قبل اس کی شان میں ایک عشائیہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جہاں عزیز و اقارب کے علاوہ آفس کے لوگ بھی موجود تھے۔ زہرہ وہاں جانا نہ چاہتی تھی۔ اسے لوگوں کے ہجوم میں گھبراہٹ ہوتی تھی۔ مگر مس شیریں کے اصرار پر ہامی بھرتے ہی بنی۔

چھتوں پر لٹکتے بے شمار قمقموں سے' جگر جگر کرتے فانوسوں سے سجے سجائے ہوٹل میں قدم رکھتے ہی وہ قدرے جھجکی۔ شہر کے پچاس ساٹھ لوگوں کی معزز اور نامی گرامی جینٹری کے گروہ کو دیکھتے ہوئے وہ نروس سی کسی شناسا سے چہرے کو کھوجتے ہوئے داخلی دروازے کے ساتھ دیوار کے قریب کھڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرف جائے۔ لوگ ٹولیوں کی صورت میں ادھر ادھر بکھرے خوش گپیوں میں محو تھے۔

''یہیں کھڑے کھڑے تقریب سے واپسی کا قصد کر کے آئی ہیں کیا؟'' بہت قریب سے کوئی گویا ہوا تو وہ اچھل پڑی۔

ابتہاج زیر لب مسکراہٹ لیے نفیس سے بلیو ٹو پیس میں بہت جاذب نظر لگ رہا تھا۔

''نہیں وہ.... مجھے کوئی شناسا دکھائی نہیں دے رہا تھا تو یہیں رک گئی۔'' وہ نروس سی ہو کر اسی طرح بولی' جس طرح پہلی بار ابتہاج سے بات کرتے ہوئے اٹکی تھی۔

سی گرین اور ڈارک بلیو کے امتزاج میں اس کا روشن چہرہ دمک رہا تھا۔ کچھ کچھ نروس' پریشان سی وہ اطراف میں نظریں دوڑا رہی تھی۔

اس کا چہرہ یوں چمک رہا تھا۔ گویا چاند نے اپنی روشنی کے تھال بھر بھر کے اس پر لٹا دیے ہوں۔ واحد زیور ستواں ناک میں باریک سی بے حد چمک دار لونگ تھی۔ ذرا سا رخ بدلنے پر اس سے کرنیں سی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتیں اور ان چاندنی کے ذروں میں اس کا پرنور چہرہ اور بھی بھلا معلوم ہوتا۔

ابتہاج کچھ لمحے دم بخود سا اس کی جانب دیکھے گیا۔

''اسٹاف کے لوگ اس طرف بیٹھے ہیں۔'' اس نے دائیں جانب لگی ٹیبلز کی جانب اشارہ کیا۔

''شکریہ....'' نظر جھکا کر وہ اس طرف چل پڑی۔ خوش گپیوں میں محو نوجوانوں کے ٹولے سے کوئی ہاتھ ہلاتا کسی کو اپنی جانب متوجہ کرتا تیزی سے آگے بڑھا اور نگاہ جھکا کر چلتی زہرہ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

''اوہ....'' وہ مڑا۔

''معاف کیجیے گا۔'' قدرے بدحواس سی ہچکچاتی ہوئی وہ گویا ہوئی اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

اجنبی کے ''اٹس اوکے'' کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔

اس نے حیرت سے شہر کے معزز افراد اور طرح دار فیشن ایبل کے جھنڈ میں سے گزرتی سادہ ملبوس اور ہلکے نیچرل میک اپ والی لڑکی کی سلکی سیاہ بالوں سے ڈھکی پشت کو گھورا' جو آفس اسٹاف کے پاس ٹیبل تک پہنچ کے مس شیریں کے پاس والی کرسی سنبھال چکی تھی۔

وہ کندھے اچکاتا آگے بڑھ گیا۔

محسن ربانی اس کا تعارف شہر کے جانے مانے بزنس مین ہاشم دانیال سے کروا رہے تھے' جو اس لندن کے تعلیم یافتہ نوجوان سے خاصے متاثر دکھائی دیتے تھے۔ جس کی شخصیت میں چھا جانے والی مقناطیسی کشش تھی اور جس نے آتے ہی سب پر اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔

کھانے کے بعد شیراز ربانی متانت سے مسکراتا ہر کسی سے توصیفی نظریں حق سمجھ کے وصول کرتا ہوا اس کونے کی جانب بڑھ گیا' جہاں اسٹاف کے لوگ بیٹھے تھے۔

''ہیلو سر! کیسے ہیں آپ؟ آج تو آپ کسی اپالو سے کم نہیں لگ رہے۔''

یہ مس شیریں تھیں' جو اس لندن پلٹ باس کے بیٹے کے سامنے بچھی جارہی تھیں۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

تقریب کے آغاز میں ہی محسن ربانی نے شیراز کا تعارف اسٹاف سے کروا دیا تھا۔ چونکہ زہرہ تاخیر سے پہنچی تھی' اس لیے وہ اس سے محروم رہی تھی۔

''سر! یہ ہیں مس زہرہ۔ ہماری اسٹاف ممبر۔''

شیراز نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔

''اور زہرہ! یہ ہیں ہمارے نئے باس' سر محسن ربانی کے صاحبزادے شیراز' جو حال ہی میں لندن سے اپنی ڈگری مکمل کر کے لوٹے ہیں۔''

شیریں کی زبان اس کا ذکر کرتے ہوئے از خود شیرینی میں لپٹی جارہی تھی۔

تعارف کے جواب میں زہرہ نے ہلکی سی مسکراہٹ پر ہی اکتفا کیا اور اپنے گلاس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

جانے کیوں شیراز کو اس کی عدم توجہی اور سرسری سے انداز نے بری طرح چڑا دیا۔ کہاں تو ہال میں موجود ہر لڑکی اس سے بات کرنے کے پاس کھڑے ہونے کی خواہاں تھی اور کہاں یہ عام سی دبو سی لڑکی نخرے دکھا رہی تھی۔

''ایسی لڑکیاں بلاوجہ خود کو ممتاز کرنے کے لیے یوں بے اعتنا دکھائی دینے کی کوششیں کرتی پھرتی ہیں.... ہونہہ!''

اس نے لاپروائی سے سر جھٹکا اور شیریں سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

''کچھ ادھر بھی نظر کرم کرلیں پرنس شیراز!''

ابتہاج نے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر شریر انداز میں کہا۔

''اوہ ڈیر کزن! ہم تو بس یوں ہی اسٹاف ممبرز کے حال احوال دریافت کر رہے تھے۔ آؤ بیٹھو نا۔''

ابتہاج مسکراتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ زہرہ اس کی آواز پر یک دم کسی دھیان سے چونکی تھی۔ نظروں سے نظریں ملیں اور پھر جھک گئیں۔

اس کی آنکھیں بڑی دیر سے دشمن جان کو تلاش رہی تھیں اور اب وہ اس کے بالکل سامنے آبیٹھا تھا۔ کیسا پرکیف احساس تھا جس نے زہرہ کے چہرے کو پل میں گلنار کر ڈالا تھا۔ تمتمائے رخساروں پر جھکی لرزتی

پلکیں دھیرے سے اٹھتیں اور پھر جھک جاتیں۔
بڑی دیر سے گلاس تھامے سر جھکا کر بیٹھی اس لڑکی کا یک دم چونکنا شیراز نے بھی محسوس کیا تھا۔ یوں جیسے نیند سے جاگ گئی ہو۔ اب وہ سر جھکا کر بیٹھنے کے بجائے سر اٹھا کر بیٹھی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً ابتہاج کے چہرے پر نظر ڈالتی' اس کے ہونٹوں پہ بے وجہ کی ایک مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ ابتہاج اس کی بے اختیاری پر محظوظ ہو رہا تھا۔ کسی کے لیے اتنا خاص ہونا کتنی خوب صورت بات تھی۔ یہ ابتہاج پر ابھی منکشف ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

گاڑی پورچ میں پھسلتی ہوئی آرکی۔ ابتہاج نے بریف کیس نکال کے گاڑی لاک کی اور تیز تیز قدموں سے سیدھا ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔
"پاپا نے جلدی آنے کو کہا تھا..... مگر.....'' رسٹ واچ پر نگاہ ڈال کے وہ بڑبڑایا۔
اندر داخل ہو کر اس نے مسکراہٹ کے ساتھ سلام کیا۔
"وعلیکم السلام! گھر آنے کا ارادہ کیونکر بن گیا صاحبزادے؟"
یہ طنزیہ اور قدرے ناراض جملہ پاپا کی جانب سے تھا۔ جبکہ ارمغان حیدر اٹھ کر بڑے پرجوش طریقے سے اس کے گلے ملنے لگے۔
"سوری پاپا! میں تو جلدی آنے والا تھا۔ مگر ایک کلائنٹ سے میٹنگ میں لیٹ ہو گیا۔" پاپا کی مصنوعی سی خفگی بھی اسے بے چین کرنے لگی۔ اس لیے اس نے فوراً وضاحت دی تھی۔
"یہ بہانے اب پرانے ہو چکے ہیں ابتہاج! اپنے وقتوں میں ہم نے بھی ایسی میٹنگز میں لیٹ ہونے کے بہت چکر دیے ہیں سب کو۔"
ارمغان انکل کی بے تکلفی سے کہی بات پر زبردست قہقہہ پڑا تو ابتہاج جھینپ کر ہنس دیا۔
"یہ حقیقی میٹنگ تھی انکل! آپ کو اپنا بیٹا اتنا چکرباز نظر آتا ہے کیا؟" اس نے بھی شرارت سے پوچھا۔
"یہی تو حیرانی ہے کہ ہمارے بیٹے ہو کر بھی تم ان پھیکی میٹنگز میں وقت ضائع کر رہے ہو۔"
ارمغان انکل کی بات پر ایک بار پھر سب ہنس پڑے۔ کھانا لگا دیا گیا تھا۔ شاید ابتہاج کی آمد کا ہی انتظار کیا جا رہا تھا۔ کھانا بے حد خوش گوار ماحول میں کھایا گیا۔ ارمغان انکل اور پاپا کے بیچ کی نوک جھونک سے وہ بھی محفوظ ہو رہا تھا۔ پھر چائے کا دور چل پڑا۔
"نئے پروجیکٹ کا کام کیسا چل رہا ہے ابتہاج۔ وہ جو ٹوکیو سے ڈیلیگیشن آیا تھا اس کا کیا ہوا؟"
"اس کے ساتھ میٹنگ بہت اچھی رہی انکل! اور پروجیکٹ پر بھی کام شروع کر دیا ہے' میں اور شیراز مل کر کر رہے ہیں' جلدی مکمل ہو جانے کی امید ہے۔"
"ارے بھئی! ان خشک باتوں سے ہماری پرنسس صبغہ کو بور مت کرو یار!" یوسف احمد نے ٹوکا۔
صبغہ' ارمغان انکل کی بڑی بیٹی تھی' اس سے چھوٹی رمشہ تھی۔ ارمغان حسن اور یوسف احمد کی یہ دوستی کالج کے زمانے سے تھی اور اب تو وہ فیملی لگنے لگے تھے۔ کچھ برس قبل وہ فیملی سمیت بحرین شفٹ ہو چکے تھے۔ اب جب بھی پاکستان آتے' سب سے پہلے یوسف سے ملتے۔ بہت عرصے بعد صبغہ بھی ساتھ آئی تھی۔ ابتہاج نے اسے سات' آٹھ برس پہلے دیکھا تھا۔
ابتہاج نے پہلی بار اس کا جائزہ لیا۔ سرخ اور سی گرین امتزاج کے لباس میں اس کی سفید رنگت مزید اجلی لگ رہی تھی۔ براؤن کٹے ہوئے سلکی بال شانوں پر بکھرے تھے۔ کانوں میں آویزاں باریک سی جگمگاتی لڑیاں اس کے بولنے کے ساتھ ساتھ لرزتی ہوئی بڑا دلکش تاثر دے رہی تھیں۔
اسٹائلش' طرح دار سی صبغہ اچھی لگ رہی تھی۔
"ٹھیک ہے یوسف! اب ہماری بیٹی واقعی بہت بور ہو گئی ہے' چنانچہ ہم تو چلے۔" ارمغان انکل جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

"میری بیٹی اتنے عرصے بعد میرے گھر آئی ہے' یہ اس کے لیے۔" یوسف احمد نے چھوٹی سی ڈبیہ صبغہ کی جانب بڑھائی۔

"اوہ انکل! تھینک یو سو مچ۔" اتنی چاہ پر جہاں صبغہ بے طرح خوش ہوئی تھی' وہیں ابتہاج حیران سا تھا۔

ان کے جانے کے بعد وہ ہمیشہ کی طرح سونے سے پہلے اسٹڈی روم میں پاپا کے پاس کافی بنا کر لے گیا۔ کرم دین کھانا تو بہت اچھا بناتا تھا۔ مگر کافی اسے صرف اپنی ماما کے ہاتھ کی پسند تھی۔ مگر اب کچھ سالوں سے وہ یہ کام خود کرنے لگا تھا۔

"خیر تو ہے پاپا! آج آپ میرے حصے کا پیار کسی اور پر لٹا رہے تھے۔" ایک مگ انہیں تھما کر وہ کشن پر بیٹھ کے خفگی سے بولا۔

ان میں باپ' بیٹے کے رشتے کی فطری جھجک کے بجائے بڑی اچھی دوستی تھی۔

"ہاہاہا... تمہارے حصے کا پیار میں کیوں لٹانے لگا' ہاں اگر... وہ تمہارا حصہ بن گئی تو یہ ہو سکتا ہے۔" ان کے شریر سے انداز میں کہنے پر ابتہاج نے گھورا۔

"کیا مطلب پاپا؟"

"برخوردار! آپ کے فرض سے سبکدوش میں نے ہی ہونا ہے۔ مجھے تو صبغہ بڑی اچھی لگی ہے' تمہارا کیا خیال ہے؟"

"جی پاپا..." پرسوچ انداز میں وہ سامنے دیکھے گیا۔

عجیب سی بات ہوئی تھی۔ اس ذکر پر تصور کے آئینے میں بوکھلائی ہوئی کبھی انہماک سے اسے دیکھتی ہوئی ایک شبیہہ ابھری تھی۔

"کیا کوئی اور پسند ہے تمہیں؟" مگ خالی کر کے بے تکلف انداز میں انہوں نے پوچھا۔

"پسند... پسند تو کوئی نہیں۔" وہ خود الجھا تھا۔ پھر بستر پر لیٹتے ہی وہ اس کے متعلق سوچے گیا۔

بے حد سادہ' کسی حد تک بے وقوف' مگر کھرے سونے جیسی لڑکی جانے کیوں بار بار اس کی سوچ کے دریا میں کنکر پھینک کر دیر تک ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

"کیا میں اسے پسند کرتا ہوں؟" وہ بڑبڑایا۔ پھر کروٹ بدلی۔

وہ بے ساختہ صبغہ اور زہرہ کا موازنہ کرنے لگا۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا... صبغہ آسمان تھی اور زہرہ زمین۔

ابتہاج کو زہرہ سے پہلی ملاقات یاد آئی۔

اس کا یوں ٹکٹکی باندھے دیکھنا یاد آیا۔ وہ مسکرا دیا۔

دوسری بار کی ملاقات میں اس کی حد سے بڑھی حواس باختگی یاد کر کے وہ دھیمے سے ہنس دیا اور تکیہ منہ پر رکھ کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

آفس میں داخل ہو کر کمرے کی جانب بڑھتے ابتہاج کے قدم سست ہو گئے۔ دائیں جانب کونے میں بنے کیبن' میں میز کے پیچھے بیٹھی زہرہ تیزی سے ٹائپنگ میں مصروف تھی۔

"کیا تمہیں کوئی پسند ہے؟" اس کے ذہن میں پاپا کا پوچھا سوال گونجا۔

آفس میں ایک' دو لوگوں کے علاوہ ابھی کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ زہرہ کو دیکھتا ہوا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ٹیبل کی جانب بڑھ گیا۔ آہٹ پا کر اس نے مڑ کر دیکھا اور ابتہاج کو پا کر خوش گوار سی حیرت میں جھٹ سلام جھاڑا۔

"السلام علیکم۔" زہرہ نے اس کے چہرے پر نظر ڈال کر فوراً" نظریں جھکا لیں۔

تازہ تازہ کی گئی شیو کی نیلاہٹیں اس کی آنکھوں میں مزید چمک پیدا کر رہی تھیں۔ زہرہ کی ساری توانائی جیسے آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ بلیک ٹی شرٹ اور جینز میں وہ خوب جچ رہا تھا۔

"وعلیکم السلام... ٹھیک ہیں آپ۔" یہ پوچھا گیا تھا یا بتایا گیا تھا' زہرہ کی سمجھ میں نہ آیا۔ مگر اثبات میں سر ہلا کر وہ پھر کمپیوٹر کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"اماں کیسی ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے' ٹھیک ہیں۔ وہ... رومی آپ کو بہت مس کر رہا تھا۔" زہرہ نے دانستہ رخ موڑ لیا اور دراز کھول کے کچھ ڈھونڈنے کا بہانہ کرنے لگی' مبادا اتنے دنوں اس کی غیر حاضری پر اس کی بے چینی ابتہاج پر عیاں نہ ہو جائے۔

وہ دونوں سوچ سوچ کر بول رہے تھے۔ گویا کہنے کو کچھ نہ ہو اور بات کرنا بھی مقصود ہو۔

"کام کیسا چل رہا ہے آپ کا؟" پیپر ویٹ پکڑ کر گھماتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"اچھا چل رہا ہے۔ آج سالانہ رپورٹ دینی تھی۔ اس لیے جلدی آ گئی۔"

زہرہ پیپر ویٹ گھماتی اس کی انگلیوں کی حرکت بغور دیکھنے لگی۔ پھر نظریں اس کے مضبوط بازوؤں سے ہوتی ہوئی اس کے چہرے پر ٹک گئیں۔ شفاف آنکھوں پر تنے پپوٹے سوجے ہوئے سے لگ رہے تھے' جیسے پوری نیند نہ لینے کے باعث ہو جاتے ہیں۔

اس نے ایک دم اوپر دیکھا اور زہرہ کی چوری پکڑ لی۔ گڑبڑا کے وہ جلدی جلدی کی بورڈ پر لفظ ٹائپ کرنے لگی۔

ابتہاج نے زہرہ کی اس خجالت مٹانے کی کوشش پر بے ساختہ امڈ آنے والی ہنسی کو ہونٹوں میں دبا کر روکا اور کرسی کی پشت سے کمر ٹکا کر دلچسپی سے اس سادہ اور بے اختیار سی لڑکی کو دیکھنے لگا۔

خود کو کسی دوسرے کی پرشوق نگاہوں سے دیکھنے کا تجربہ کیسا پرکیف تھا۔ سادے لباس پر ہلکی ہلکی سفید کڑھائی تھی۔

ابتہاج نے اس کے چہرے کے جاذب نظر نقوش کو کبھی غور سے نہیں دیکھا تھا۔ بیضوی چہرے کی رنگت کھلتی ہوئی تھی۔ ستواں سی ناک ہمیشہ سرخ ہی رہتی تھی اور اس سرخی مائل ناک میں موجود لونگ خوب چمکتی تھی۔ گلابی رخسار اور ان پر جھکی پلکیں بہت بھلی لگتیں۔ کی بورڈ پر چلتی انگلیوں میں بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں چاندی کا ایک چھلا تھا۔ بس... یہ ابتہاج نے پہلی بار دیکھا تھا۔

اس نے کبھی زہرہ کو آفس کی دوسری لڑکیوں کی طرح میک اپ سے سجے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی سادگی ہی اس کا امتیاز تھا... اس کا خالص پن ہی اس کی خصوصیت۔ ابتہاج کو بے ساختہ صبغہ یاد آئی۔ خوب صورت میک اپ کیے' نفیس جیولری پہنے ماڈرن طرح دار سی صبغہ۔

وہ لاشعوری طور پر پھر دونوں کا موازنہ کرنے لگا۔

"صبغہ آسمان ہے اور زہرہ زمین۔" اس کے دماغ نے پھر وہی بات کہی۔

"بے شک ہو گی... مگر آسمان کی بے پناہ وسعتیں' لا انتہا ہی بلندیاں خواہ کتنی ہی پرکشش کیوں نہ ہوں' انسان کو پاؤں جمانے کے لیے زمین ہی درکار ہوتی ہے۔"

دل کی اس دلیل پر اس کے لب دھیرے سے پھیل کر سمٹے۔

سکوت بھری فضا میں زہرہ کے کی بورڈ پر بے ربط سی ٹکاٹک اور اس کے دھڑ دھڑاتے دل کے علاوہ کوئی آواز نہ تھی۔ ابتہاج کی ہر اٹھتی نگاہ اس کے دل کی لہروں کو متلاطم کر رہی تھی۔

وہ اس کی توجہ کی عادی کب تھی... وہ تو اکیلی ہی محبت کے سفر میں پیادہ پا بہت دور تک جا چکی تھی۔ وہ بس اسے چاہتے رہنا چاہتی تھی۔ چاہے جانے کا خیال تو کبھی بھولے سے بھی نہ آیا تھا۔

جانے ابتہاج کو کیا سوجھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل پر رکھا چائے کا کپ اٹھا کر دو' تین گھونٹ بھر لیے جو اس کے بیٹھنے کے بعد زہرہ پینا بھول گئی تھی۔

زہرہ نے اس کے ہاتھ میں تھمے کپ کا ٹیبل سے اس کے ہونٹوں تک کا سفر بڑے تعجب سے دیکھا اور گنگ ہو گئی۔

اس نے کپ واپس میز پر رکھا اور کمال بے نیازی سے اٹھ کر شیراز کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ دبی دبی سی مسرت کا احساس اسے ہواؤں میں اڑانے لگا۔ اپنے جذبے کو وہ کوئی نام تو نہیں دے پایا تھا۔ مگر کچھ تو تھا جو بہت غیر معمولی تھا' مسرت بخش تھا۔

زہرہ کا ہاتھ مضبوطی سے اس کپ پر ٹھہر گیا۔ یوں لگا جیسے زندگی بھر کی جمع پونجی کسی نے اس کی مٹھی میں تھمادی ہو۔ وہ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں کچھ لمحوں پہلے کے منظر کو تصور کی آنکھ سے دیکھے گئی۔

چمکتی آنکھوں کے ساتھ وہ سامنے راہداری کو دیکھے گئی' جہاں سے کچھ لمحے قبل وہ گزر کے اندر گیا تھا۔ زہرہ کو لگا وہ راہداری پہلے سے زیادہ روشن ہو گئی ہو' پہلے سے زیادہ وسیع..... زیادہ معطر.....!

✲ ✲ ✲

تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے
یہ مانا کہ محفل جواں ہے حسین ہے
وہ آئیں نہ آئیں جمی ہیں نگاہیں
ستاروں نے دیکھی ہیں جھک جھک کے راہیں
یہ دل بد گماں ہے نظر کو یقین ہے
یہ مانا کہ محفل جواں ہے' حسیں ہے

دروازے پر ہوتی ہلکی سی دستک نے اس کے انہماک کو نہیں توڑا تھا۔ ناب گھما کر یوسف احمد کمرے میں داخل ہوئے۔ ابتہاج بیڈ پر ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹا تھا' دوسرا ہاتھ میوزک سسٹم کا ریموٹ تھامے وقفے وقفے سے ہل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔

اس کے ہونٹوں پر بے حد دلفریب سی مسکان نے انگڑائی لی تھی۔

"آہم....." یوسف احمد کی کھنکھار پر اس نے فوراً" آنکھیں کھولیں۔ اور جھٹ سے اٹھ بیٹھا۔

"آئیے پاپا! وہاں کیوں کھڑے ہیں۔"

"ہم تو اپنے صاحبزادے کے نئے روپ کو نظر بھر کے دیکھ رہے تھے۔"

ان کے شرارت سے کہنے پر ابتہاج کھسیا کر ہنسا اور ریموٹ سے سسٹم بند کر دیا۔

آپ بیٹھیں میں اچھی سی کافی بنا کے لاتا ہوں۔"

"نہیں رہنے دو' میں کرم دین سے کہہ چکا ہوں کافی کا' وہ لاتا ہی ہو گا' تم تو اب ناکارہ ہو گئے ہو۔"

"ہیں؟ کیا مطلب پاپا؟" اس کی آنکھیں پھیلیں۔

"ناکارہ ہی ہو گئے نا تم بچے' اب بس بیٹھے رہو تصور جاناں کیے ہوئے۔" ان کے شرارت سے کہنے پر ابتہاج نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"پاپا! آپ اپنے بیٹے کو مجنوں کب سے سمجھنے لگے ہیں؟"

"تم لاکھ چھپالو بیٹا جی! مگر ہماری زیرک نگاہوں سے کچھ نہیں چھپا سکتے' کیونکہ رشتے میں ہم تمہارے باپ لگتے ہیں۔" ان کے ڈائیلاگ پر دونوں کا مشترکہ قہقہہ ابل پڑا۔ کرم دین کافی کے مگ ان کے سامنے ٹیبل پر رکھ کر جا چکا تھا۔

"آپ بھی بس حد کرتے ہیں پاپا! عورتوں کی طرح رائی کا پہاڑ بنانے میں خاص ملکہ حاصل ہے آپ کو۔" سر جھٹک کر اس نے ایک کپ انہیں پکڑایا دوسرا خود پینے لگا۔

"پھر کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟" اب کی بار وہ سنجیدہ تھے۔

"پاپا..... کیا صبغہ اس گھر کے لیے مناسب ہو گی؟" بڑی دیر بعد وہ بولا تھا۔

"کیوں؟ اس میں کیا خرابی ہے؟"

"وہ مغربی ماحول کی پروردہ ہے' کسی اور طرح کا طرز زندگی چاہتی ہو گی۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے' تم نے بھی تو کتنے سال یورپ میں ہی گزارے ہیں اور ہر طرح سے ایک بہتر پر آسائش زندگی اسے دے سکتے ہو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اس گھر کو ایک ایسی عورت کی ضرورت ہے جو اسے پھر سے گھر بنا دے۔ شوپیس سجانا ہے تو کسی سے بھی کر دیں میری شادی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے ناراض لہجے میں کہا۔

اس کی دلیل پر پاپا کی دلیل بھاری پڑنے نے اسے خفا سا کر دیا تھا۔ کافی کا مگ میز پر رکھتے ہوئے انہوں نے بڑی کھوجتی نگاہوں سے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ اس وقت ایسے بچے کی طرح لگ رہا تھا جو اپنی کسی من پسند چیز کے حصول کے لیے باپ کی پسند کی

ہوئی شے میں بلاوجہ کے نقائص ڈھونڈ رہا تھا۔ اور ناکام ہونے پر بری طرح جھنجلا رہا تھا۔ یوسف اس کی صورت دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

"اچھا تو پھر میں ارمغان کو فون کر کے خوش خبری سنا دیتا ہوں کہ شادی کی تیاریاں شروع کرے۔" وہ خوشی خوشی اٹھ کر مڑے۔

"اف..... پاپا! مجھے نہیں کرنی صبغہ سے شادی۔" شدید جھنجلاہٹ میں اس نے صاف جواب دے دیا۔

باپ کے سامنے چوری پکڑے جانے پر خجالت کی سرخی اس کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ وہ شروع سے ہی ماما کی نسبت پاپا کے زیادہ قریب رہا تھا مگر اس موضوع پر اپنی کھسیاہٹ اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"ابتہاج..... اپنے پاپا کو بھی نہیں بتاؤ گے؟" ان کے سنجیدہ انداز میں پوچھنے پر اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا لیں۔

"کیا بتاؤں پاپا..... میں خود بھی نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"وہ بہت اچھی ہے..... بہت سادہ ہے' کوئی چیز ہے جو مجھے اس کی طرف کھینچتی ہے۔"

"کون ہے وہ؟" ان کا اشتیاق حد سے سوا تھا۔

پھر ابتہاج نے زہرہ سے پہلی ملاقات سے لے کر اب تک کی ساری باتیں انہیں بتا دیں۔ کیونکہ اس کے پاپا ہی اس کے بہترین دوست تھے۔ ان سے نہ کہتا تو کس سے کہتا۔

"میں اس کے پاس بیٹھوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے اس کی آنکھیں اور کچھ دیکھ ہی نہیں رہیں' میری باتوں کے سوا اس کے کان کچھ اور سن ہی نہیں رہے' کیا وہ مجھ سے محبت کرتی ہے پاپا!" اس کے سوال پر یوسف نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں۔ یقیناً"..... اور بیٹا جی! آپ بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔" وہ مسکرائے۔

"پتا نہیں پاپا! اس کی سادگی اور پاکیزگی مجھے اپنی جانب کھینچتی ہے۔ تھوڑی بے وقوف ہے مگر ہے بہت اچھی۔" وہ مسکرایا "تم اسے پروپوز کیوں نہیں کر دیتے پھر؟"

"پروپوز..... نہیں پاپا! جو ہو گا صحیح طریقے سے ہو گا' وہ جتنی شفاف ہے میں اسے اسی شفاف پن سمیت اپنانا چاہتا ہوں۔ محبت کا اعتراف ہم مقدس بندھن میں بندھنے تک اٹھا رکھتے ہیں۔"

یوسف کو اپنے ہونہار' فرماں بردار بیٹے پر بے ساختہ پیار آگیا آگے ہو کے اس کا ماتھا چوما اور شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اسے لگا اس کے بند دماغ پر لگی گرہیں خود بخود کھل گئی ہیں۔ جو فیصلہ وہ اکیلے نہیں کر پا رہا تھا۔ پاپا کے سامنے اعتراف نے اس سے کروا دیا تھا۔

✲ ✲ ✲

اس نوکری کے چکر میں زہرہ صبح سے شام تک گھن چکر بنی رہتی۔ شام کو گھر لوٹتی' کام کا بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا' اپنے لیے وقت نکالنا بھی محال لگتا۔ چھٹی والے دن فرصت ملتی تو ہفتہ بھر کے اکٹھے ہوئے کاموں سے فرصت پانے کے بعد پھر سے اس پر تھکن غالب آنے لگتی۔ دن اور رات کا لامتناہی سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ شب و روز کی اسی آنکھ مچولی میں ایک پر بہار مہکتی ہوئی سانولی سلونی سکوت بھری شام میں ابتہاج گھر آگیا۔

عرصہ بعد اس کی آمد پر اماں کِھل سی اٹھیں۔ جھٹ پٹ کھانا تیار ہوا۔ دستر خوان لگایا گیا۔ اس کے ساتھ اماں اور رومی نے کھانا کھایا۔ زہرہ دانستہ کچن میں ہی مقید رہی۔ ابتہاج کی اچانک آمد نے اس کے چہرے کو گلنار کر ڈالا تھا۔

کھانے کے بعد اماں نے اسے چائے بنانے کو کہا۔ جلدی سے بنا کر وہ کمرے میں لے گئی۔ ابتہاج رومی کے ساتھ لڈو کھیلنے میں مشغول تھا۔

"چھ..... تین..... اور یہ میں جیت گیا۔" رومی جیتنے پر خوشی سے کھلکھلایا۔ اور ابتہاج نے ہار جانے پر مصنوعی افسوس خود پر طاری کر لیا پھر خود بھی ہنس

پڑا۔ رومی اپنی لڈو سمیت کر کمرے میں چلا گیا تو زہرہ نے چائے کی ٹرے درمیانی تپائی پر رکھ دی۔

"اماں! اسلام آباد سے میرے بھائی بھابھی آرہے ہیں۔ آپ بھی کسی دن گھر چلیے۔ میرے پاپا سے بھی مل لیجیے گا۔" کپ اٹھا کر یکایک اس نے موضوع چھیڑا۔

"ارے بیٹا ضرور... میں تو خود ان سے ملنا چاہتی ہوں جن کا اتنا سعادت مند بیٹا اور ہیرے جیسا بھائی ہے۔" اماں کی خوشی دیدنی تھی۔

"بس تو پھر اگلے اتوار آپ تیار رہیے گا میں آپ کو لینے آجاؤں گا۔" اس کی بے صبری پر زہرہ حیران سی ہوئی۔ ابتہاج کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کے پیچھے چھپی معنی خیزی اسے کسی بڑی خوشی کی نوید سنا رہی تھی۔

"اگلے اتوار کو تو زہرہ کی پھوپھو کے ہاں قرآن خوانی پر جانا ہے۔" اماں کچھ متفکر سی ہوئیں۔

ابتہاج کے چہرے پر ایک لحظے کے لیے مایوسی کا سایہ سا لہرایا تھا۔ مگر جلد ہی پھر چمکتا ہوا گلابی رنگ حاوی ہو گیا۔

"اچھا... تو پھر اس سے اگلے اتوار کا پکا کریں۔"

"چلو وعدہ!" اماں اس کے اس قدر اصرار پر ہنس پڑیں اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ دل کے کسی کونے میں زہرہ کے لیے انہیں ابتہاج جیسا نیک دل لڑکا ہی مطلوب تھا۔

"زہرہ! جاؤ ذرا... وہ انڈوں کا حلوہ بھی گرم کر کے لے آؤ۔"

زہرہ پھر کچن میں چل دی۔ خوش تو اماں بھی تھیں مگر زہرہ کا دل تو جیسے پنکھ لگا کے اڑ رہا تھا۔

حلوہ گرم کر کے قرینے سے پلیٹ چمچ ٹرے میں رکھ کے وہ ابتہاج کے سامنے والی میز پر رکھ آئی۔ اور دوسرے کونے میں کرسی پر بیٹھ کے ٹی وی میں انہماک ظاہر کرنے لگی جس پر آتا ڈرامہ اماں نہ صرف خود ذوق و شوق سے دیکھ رہی تھیں بلکہ ساتھ ساتھ ابتہاج کو پچھلی اقساط کا خلاصہ مع کرداروں کے تعارف کے گاہے بگاہے سناتی جاتی تھیں اور وہ بھی پورے دھیان سے دیکھتے ہوئے برابر سر ہلائے جا رہا تھا' جیسے سب سمجھ میں آرہا ہو۔

بظاہر ٹی وی دیکھتے ہوئے زہرہ کا سارا دھیان اس کے وجود میں اٹکا تھا وہ کیا کر رہا تھا' کیسے کر رہا تھا' کب کب پلک جھپک رہا تھا' کیسے توقف کر رہا تھا۔ ابتہاج کے آنے سے کچھ دیر قبل وہ عصر کے وقت وضو کے لیے ہاتھ سے چاندی کا چھلا اتار کر صوفے کے ساتھ رکھی چھوٹی تپائی پر رکھ گئی تھی' جو وہ ہمہ وقت اپنے ہاتھ کی انگلی میں پہنے رکھتی۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے ابتہاج نے رخ پھیر کر تپائی پر پڑے چھلے کو ایک نظر دیکھا' پھر کن انکھیوں سے زہرہ اور اماں کو دیکھا اور متوجہ نہ پا کر اس نے چپکے سے چھلا اٹھا کر مٹھی میں بند کر لیا۔

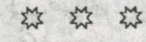
زہرہ کے دل کو یکایک کسی نے بند کر دیا۔ دوبارہ جب وہ دھڑکا تو نئی لے تھی' انوکھا سا احساس تھا۔ خود کو بنا دیکھے بھی زہرہ کو یقین تھا کہ اس کا چہرہ شرم کی حدت سے سرخ ہو گیا ہو گا۔

کتنا مشکل تھا اس وقت اپنے چہرے کو بے تاثر اور سپاٹ رکھنا یہ وہی جانتی تھی۔ اس نے ابتہاج کی چوری پکڑ لی تھی۔

"اچھا اماں! میں چلتا ہوں۔ اب آپ کو گھر لے جانے کے لیے ہی آؤں گا۔" وہ کھڑا ہوا اور جھک کے اماں سے سر پر پیار لے کر زہرہ کی جانب دیکھے بنا تیزی سے باہر نکل گیا۔

"چور کہیں کے۔" انجانی سی مسرت سے زہرہ کھلکھلا کے ہنسی تھی۔

"ہیں؟" اماں نے بے وجہ کی ہنسی پر اسے گھورا اور پھر اس کا دماغ چل جانے پر افسوس کرتی اٹھ گئیں۔



ایک بے حد اہم سہ روزہ ورکشاپ میں شرکت کے لیے آفس کے کچھ لوگوں کو اسلام آباد بھیجا جانا تھا۔ شیراز اس گروپ کے لیڈر کے طور پر ساتھ تھا۔

کام کی نوعیت کے اعتبار سے جن اسٹاف ممبران کی اس ورکشاپ میں شرکت ضروری تھی' ان میں شیریں' حال ہی میں اپائنٹ کی گئی لڑکی ستارہ' پروگرام منیجر عاطف سجاد اور اسسٹنٹ منیجر قمر حمید کے علاوہ زہرہ بھی شامل تھی۔

اسلام آباد میں دن بے حد مصروف گزرے۔ مختلف طرح کی ٹریننگ اور لیکچرز پر مبنی یہ ورکشاپ کافی مفید ثابت ہوئی تھی۔ ایک بے حد خوش گوار بات یہ ہوئی کہ ابتہاج بھی وہاں موجود تھا۔ وہ ان کے ساتھ نہ آیا تھا۔ اس لیے زہرہ اس کی آمد سے بے خبر تھی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ نظریں اس کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ وہ نامحسوس طریقے سے سارا وقت ابتہاج کو نظروں کے حصار میں لیے بیٹھی رہی۔

تیسرے روز سہ پہر کے وقت ورکشاپ اختتام پذیر ہوئی۔ انہیں رات کو واپسی کے لیے نکلنا تھا۔ ہوٹل میں جا کر تھکن اتارنے کے بعد سب لوگ وسیع و عریض لان میں چلے گئے۔

زہرہ کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر شیریں زبردستی اسے بھی اپنے ساتھ لان میں لے گئی۔ شام پڑنے پر پرندوں کے غول کے غول اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ دور' دور تک سر سبز نرم گھاس کا غالیچہ سا بچھا تھا۔

بے حد خوش گوار سی ہوائیں درختوں سے چھیڑ چھاڑ کرتیں' پتوں کو چھوتی' پھولوں سے اٹکھیلیاں کرتی پھر رہی تھیں۔ وہ سب بھی کین کی کرسیوں پر بیٹھے ہلکی پھلکی گفتگو میں مشغول تھے۔ ان سے کچھ دور ابتہاج اور قمر کرکٹ کھیل رہے تھے۔ شیراز اور شیریں کو باتوں میں منہمک چھوڑ کر وہ اسی جانب دیکھے جا رہی تھی۔ کھیلنے کے باعث ابتہاج کا جوش سے تمتمایا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ خوب صورت سیاہ بالوں سے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

اس پر نگاہ جمائے جمائے زہرہ اٹھی اور اس پتھریلی روش پر آگئی جو سبز میدان کے بیچوں بیچ دائرے کی صورت میں دور تک جاتا تھا۔ روش کے دائیں جانب وہ دشمن جان تمام تر حشر سامانیوں سمیت موجود تھا۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بے حد آہستگی سے ٹہلتی ہوئی وہ اس جانب چلنے لگی جہاں سے وہ اسے بہت آسانی سے دیکھ سکتی تھی۔ کھیل میں مگن ابتہاج نے زہرہ کا اٹھ کر اس طرف آنا محسوس کر لیا تھا۔ شاٹ لگا کر لمحوں کی فرصت میں اس نے اچٹتی سی نظر بائیں طرف چلتی اپنی طرف دیکھتی زہرہ پر ڈالی۔

"یہ لڑکی بھی نا..." مسکرا کر اس نے لب دانتوں تلے دبایا اور ایک اور زور سے شاٹ کھیلا۔

زہرہ اس مقام پر پہنچ کر رک گئی۔ جہاں سے ابتہاج بس اس سے کچھ ہی قدم کی دوری پر تھا۔ وہ سامنے ہوتا تو زہرہ یوں ہی بے اختیار اس کی جانب کھنچتی چلی جاتی... مگر اس کی بے اختیاری اسے ایک مخصوص فاصلے پر روک دیتی تھی۔ جیسے ابھی وہ املتاس کے پیڑ کے نیچے کھڑی اسے خود میں سمو رہی تھی۔

کرسی پر بیٹھے شیریں کی لگاوٹ بھری شوخی سے پُر باتوں سے اکتا کر شیراز نے سامنے دیکھا۔ دور پتھریلی روش کے کنارے لگے درخت کے نیچے کھڑی زہرہ نے اس کی تمام تر توجہ سمیٹ لی تھی۔ زرد' زرد نارنجی کرنیں املتاس کے زرد پھولوں سے ٹکرا کر پتوں سے چھن چھن کر تنے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی زہرہ کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ وہ بالکل سادہ سفید براق قمیص شلوار میں ملبوس تھی۔ مگر دوپٹہ مختلف رنگوں سے سجا تھا۔ گلابی' بنفشی' اودے نیلے زرد سرمئی...

سنہری کرنیں اس کے چہرے اور گردن پر پڑ رہی تھیں۔ وہ کوئی موی مجسمہ لگ رہی تھی جو کسی سحر سے پتھر کا ہو گیا ہو۔ ست رنگے دوپٹے کے خوب صورت رنگ اس کے چہرے کی شفاف جلد پر منعکس ہو کر انوکھا تاثر پیدا کر رہے تھے۔ شیراز کچھ لمحے مبہوت ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

شیریں ضروری کام سے اندر ہوٹل میں گئی تو شیراز اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔ مگر اس کی آمد سے بے خبر وہ ابتہاج کو گیم پر گیم جیتتا دیکھ رہی تھی۔ زہرہ کی آنکھیں اس کی جیت کی خوشی سے چمک رہی تھیں۔

ایک پگھلا دینے والی لو دیتی نظر کا نہ ٹوٹنے والا حصار ابتہاج کے گرد کھینچے وہ ارد گرد سے قطعی بے گانہ تھی۔ چند لمحے اس کی محویت دیکھتے رہنے کے بعد وہ دھیرے سے کھنکھارا۔ مگر کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا.... اس کی محویت نہیں ٹوٹی تھی۔ قدرے جھنجلاتے ہوئے اس نے سامنے دیکھا اور پھر اس کی جانب رخ کر کے لہجے میں بشاشت سموتے ہوئے بولا۔

"کیسی رہی یہ ورکشاپ مس زہرہ؟ آپ تو غالباً اس میں پہلی بار شرکت کر رہی ہیں۔"

"جی.... ہاں اچھی تھی' کافی کچھ سیکھنے کو ملا۔ یقیناً آئندہ کے لیے یہ ٹریننگز بہت مفید ثابت ہوں گی۔" ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے مکمل جواب دے کے نظریں پھر وہیں جمالیں۔ شیراز کو بات سے بات نکالنے کے لیے کوئی نکتہ نہ ملا تو اس نے موضوع بدلا۔

"لگتا ہے آپ کو ریکٹ کھیلنا بہت پسند ہے۔"

زہرہ نے چونک کر گردن گھمائی اور بائیں جانب کھڑے شیراز کو حیرت سے دیکھا۔ اس نے کبھی کام کی بات کے سوا زہرہ سے کوئی غیر متعلقہ بات نہ کی تھی۔

"جی نہیں.... بس ایسے ہی دیکھ رہی تھی۔" مختصر سا جواب دے کر وہ پھر سامنے دیکھنے لگی۔ اب اس کی آنکھیں پھر وہی نرم نرم سا تاثر دے رہی تھیں جو شیراز کی جانب دیکھتے ہوئے قطعی اجنبیت کا لبادہ اوڑھ لیتی تھیں۔ ابتہاج دور گری شٹل اٹھانے چل دیا۔ پھر ریکٹ والا ہاتھ ہوا میں بلند کر کے شٹل اچھالی اور زور سے ہٹ کیا۔

"اچھا تو پھر کوئی اور کھیل پسند ہو گا۔ کرکٹ' ٹینس' کیرم وغیرہ وغیرہ میں سے کوئی؟" مسکراتے ہوئے وہ ڈھٹائی سے پوچھنے لگا۔

"نہیں۔ کچھ بھی پسند نہیں۔" اب کی بار بنا اس کی جانب دیکھے زہرہ نے جواب دے دیا۔ شیراز اس کے انہماک میں خلل ڈال رہا تھا۔ اسے چڑ ہونے لگی۔

"ارے کچھ بھی پسند نہیں.... حیرت ہے' کوئی کھیل' کوئی مشغلہ' کوئی شوق تو ہو گا؟"

"نہیں۔" ایک بے حد سرد نگاہ اس پر ڈال کر قطعی انداز میں جواب دیا اور نظر ہٹالی۔ وہ اب ابتہاج کو سامنے کی طرف جاتے اور تولیے سے چہرہ پونچھتے دیکھ رہی تھی۔ گیم ختم ہو گیا تھا۔

شیراز کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ یہ عام سی لڑکی ہر بار اسے یوں نظر انداز کر رہی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی مردانگی جوش مارنے لگی۔ خفت سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ اب کی بار شیراز نے بہت واضح انداز میں زہرہ کی عدم توجہی اور ابتہاج کی جانب وارفتگی نوٹ کی تھی۔ ابتہاج کی نگاہ میں بھی زہرہ کے لیے غیر معمولی پن اسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ وہ اپنے کھولتے خون کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔

"آج تک کسی لڑکی نے میرے سامنے یہ ناز نخرے نہیں دکھائے تو اس دو ٹکے کی لڑکی کی کیا اوقات ہے۔" واپس کین کی کرسی پر جا کر بیٹھتے ہوئے اس میں غصے کا لاوا ابھر ابلنے لگا۔

"اور ابتہاج.... کیا وہ میرے سامنے اتنی متاثر کن شخصیت کا مالک ہے کہ یہ فضول احمق لڑکی مجھ پر اسے فوقیت دے رہی ہے۔" زہر سے نظر ہٹا کر اب اس نے قہر آلود نگاہیں ابتہاج پر مرکوز کیں۔

ابتہاج اور اس کی بچپن اور پھر لڑکپن میں بھی بہت چپقلش رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان ہمیشہ اک مقابلے کی فضا سی رہتی جس میں سبقت ہمیشہ ابتہاج لے جاتا۔ خواہ وہ پڑھائی ہو' کھیل ہو' سب کی توجہ سمیٹنا ہو یا کچھ اور.... اس کی قابلیت کے باوجود اس کے پاپا اب بھی ابتہاج کی خداداد صلاحیتوں اور کاروبار میں معاملہ فہمی کے رطب اللسان رہتے۔

شیراز کے دل میں نفرت و حسد کا پہلا بیج تب پڑا جب میٹرک کے امتحانات میں ابتہاج کی نمایاں کامیابی پر اسے سر آنکھوں پر بٹھایا گیا' جبکہ اسے صرف پاسنگ مارکس لانے پر ہر طرف سے ڈانٹ سننے کے ساتھ ساتھ ابتہاج کی مثالیں سننے کو ملیں۔ پڑھائی میں اس کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ مگر پھر اسے ضد ہو گئی۔ اس نے اسی اسکول اور کالج میں تعلیم حاصل کی جہاں ابتہاج داخلہ لیتا۔ ابتہاج اسکالر شپ پر اعلا تعلیم کے

لیے لندن چلا گیا تو شیراز نے بھی اسی ادارے میں داخلے کی ضد شروع کر دی۔ اسکالر شپ تو اسے نہ مل سکی۔ مگر اس ضد کی بدولت محسن ربانی نے بہت سارا روپیہ لگا کر اسے لندن بھیج دیا۔ دونوں کے پاس ایک ہی نامور ادارے کی ڈگری تھی۔ مگر پھر بھی ابتہاج کو اس پر ترجیح دی جاتی۔ کاروباری معاملات میں اس کی رائے کو فوقیت دی جاتی اور حال میں شروع ہونے والے ایک پروجیکٹ میں بھی ابتہاج کو اس کے سر پہ مسلط کر دیا گیا تھا' جیسے اسے کچھ آتا ہی نہیں تھا۔

شیراز نے کبھی ظاہر تو نہ ہونے دیا۔ مگر اندر ہی اندر وہ اس کی کامیابیوں' خوبیوں پر جی جان سے خائف رہتا اور اب یہ کمتر سی لڑکی غیر ارادی طور پر ہی اس پر ابتہاج کو برتری دے کے اس کے اندر دبی حسد کی چنگاریوں کو ہوا دے کر سلگا رہی تھی۔ ابتہاج شکل و صورت میں اس سے بہتر نہ تھا۔ کم سے کم یہ ایک ایسا پوائنٹ تھا جہاں وہ ابتہاج یوسف سے سبقت لے جاتا تھا۔ نہ تو اس کی آنکھیں شیراز کی طرح شہد رنگ تھیں' نہ ہی سرخ و سفید رنگ ہی اس جیسا تھا۔ اسے لڑکیوں کے دلوں میں گھر کرنا آتا تھا۔ وہ اپنے لب و لہجہ کی چاشنی سے ہر لڑکی کو شیشے میں اتار سکتا تھا۔ ابتہاج میں ان میں سے کوئی ایک بھی خوبی نہ تھی۔ تو پھر زہرہ کا اسے نظر انداز کر کے ابتہاج کو توجہ دینا اسے زہر لگنا فطری امر تھا۔

شیراز لندن میں ملکی و غیر ملکی ہر طرح کی لڑکیوں کے ساتھ رہا تھا۔ بیشتر سے اس کی دوستی تھی اور کچھ سے دوستی سے بھی زیادہ کا رشتہ تھا۔ پھر زہرہ جیسی گھریلو اور دبو سی لڑکی میں پسند کی جانے والی کوئی خوبی نہ تھی کہ وہ شیراز کو متوجہ کر پاتی۔ مگر محض ابتہاج سے ضد کے باعث وہ بار بار زہرہ کو اپنی جانب مائل کرنے کے جتن کرنے لگا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ابتہاج کسی چیز میں ایک فیصد بھی ملاوٹ یا دھوکا دہی برداشت نہیں کرتا تھا۔ چاہے وہ کاروبار ہو یا انمول رشتے۔

✲ ✲ ✲

"مس طوفان میل! کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"

تیزی سے ٹائپ کرتی زہرہ کو دیکھ کے دروازے میں کھڑے شیراز نے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ کے ساتھ بے تکلفی سے استفسار کیا۔

کی بورڈ پر چلتی زہرہ کی انگلیاں ایک لمحہ کو ساکت ہوئیں اور طرز تخاطب کو نظر انداز کر کے سر اثبات میں ہلا کے پھر کام میں مگن ہو گئی۔ شیراز پاس رکھی کرسی گھسیٹ کر پر سکون انداز میں بیٹھ گیا تھا۔

قدرے لاابالی اور بات بات پر چٹکلے چھوڑتے شیراز ربانی کی بدولت آفس کی سنجیدہ فضا میں خوش گواریت سی در آئی تھی۔ مگر زہرہ کو بے وجہ کی بے تکلفی سے چڑ ہوتی تھی۔ شیراز کی گہری نظروں سے الجھ کر اس نے سر اٹھا کر سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"کوئی کام تھا شیراز صاحب؟"

"کام تو ہے محترمہ! مگر یہ صاحب واحب جیسے عمر رسیدہ الفاظ آپ کم سے کم میرے خوب صورت نام کے ساتھ مت لگایا کریں۔" بے فکری سے مسکراتے ہوئے جواب آیا' زہرہ خاموش رہی۔

"یہ فائل دو گھنٹے تک مکمل کر کے آپ مجھے دے دیں! ارجنٹ ہے۔" پچھلی بات کا جواب نہ پا کر خجل سے انداز میں اگلی بات کہی گئی۔

"او کے سر!" اس نے فائل تھام لی۔

"پھر سر....؟" مصنوعی سنجیدگی سے ڈپٹنے والے انداز میں کہا گیا۔

زہرہ نے ازراہ مروت زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر فضول بے تکی سی بے تکلفی پہ بند باندھنے کی سعی کی۔ مگر مسکراہٹ کی لکیر پوری طرح کھنچنے سے پہلے ہی سمٹ گئی۔

دروازے میں ایستادہ وجود اور اس پر بلا کی وحشت لیے گہری آنکھوں میں ایسا کچھ تھا کہ وہ اندر تک لرز گئی۔

"آہا.... بڑے بڑے لوگ آئے ہیں.... آج تو سویرے سویرے ہمارے غریب خانے پر قدم رنجہ فرما کر حیران ہی کر دیا آپ نے۔"

شیراز خوشامد میں لپٹی خوش دلی سے آگے بڑھا۔

ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ ابتہاج نے اس سے مصافحہ کیا۔

"میں تو وقت پر ہی آیا ہوں۔ تم بھی فارغ ہو کے آجاؤ تو ہم پروجیکٹ ڈسکس کرلیں۔" یاددہانی کرواکر وہ تیزی سے پلٹا اور چلا گیا۔

باہر نکلتے ابتہاج کے چہرے پر ناگواری دیکھ کر شیراز فاتحانہ انداز میں مسکرایا اور اس کے پیچھے ہی باہر نکل گیا۔ خالص پن ابتہاج کی کمزوری ہے اور اس میں معمولی سی ملاوٹ پر بھی وہ برافروختہ ہو سکتا ہے' یہ شیراز جانتا تھا۔

ابتہاج کو نیچا دکھانے کے لیے اس کے ہاتھ ترپ کا پتا آگیا تھا۔ بس اسے صحیح موقع پر اس کے استعمال کا انتظار کرنا تھا۔

"کیا ابتہاج نے کچھ غلط سمجھا ہے؟" اندر بیٹھی زہرہ کا دل ایک دم ہی پریشان ہو اٹھا۔

✡ ✡ ✡

وہ میز پر جھکا دھیان سے ایک پریزنٹیشن تیار کررہا تھا۔ اعدادوشمار لکھتے لکھتے وہ رکا۔ اسے کل کا واقعہ یاد آنے لگا۔ جب شیراز کی زہرہ کے کیبن میں موجودگی اور بے تکلفی دیکھ کر اس کی پیشانی سلوٹوں سے بھر گئی تھی اور چاہ کے بھی وہ اپنے سرد رویے کو نارمل نہ کرپایا تھا۔

اسے زہرہ کے چہرے پر ابھرتی پریشانی یاد آنے لگی جو ابتہاج کی سرد مہری دیکھ کے اس کے چہرے پر لمحوں میں پھیلی تھی۔ ابتہاج کو اپنے رویے کا احساس ہونے لگا۔

وہ سوچ میں بیٹھا تھا کہ انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھانے پر محسن انکل نے اسے کسی انٹرن کی آمد کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ انٹرن شپ لیٹر دینے کی ہدایت دی تھی۔

"اوکے۔" کہہ کے اس نے ریسیور رکھ دیا۔

دستک ہوئی اور ایک انیس بیس سالہ لڑکی داخل ہوئی۔ ابتہاج نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ڈیٹا فائل لانے کو کہا اور لڑکی سے چند معلومات لینے لگا۔ فائل آنے پر اس نے مطلوبہ لیٹر نکالا اور سائن کر کے اس کے حوالے کردیا۔ لڑکی کے رخصت ہوجانے کے بعد ابتہاج یوں ہی فائل دیکھنے لگا اور صفحے پلٹتا اس کا ہاتھ اس لیٹر پر رک گیا جس کے ماتھے پر زہرہ آفتاب کا نام جگمگا رہا تھا اور صفحے کے کونے میں لگی پاسپورٹ سائز تصویر میں ہمیشہ کی طرح سادہ چہرہ اسے ہمیشہ سے بڑھ کر اچھا لگا۔ ابتہاج بغور اس کے نقوش دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا نہیں رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھیں بہت چمک رہی تھیں۔ جیسے وہ ایک دم ہنس پڑے گی۔ اس کی پلکیں بہت زیادہ گھنی تو نہ تھیں' مگر ان کا خم دار ہونا آنکھوں کو سجا رہا تھا۔

بے ساختہ اس کا جی چاہا وہ چپکے سے تصویر اتار لے اپنے والٹ میں رکھ لے۔

"کیا بچکانہ حرکت ہے۔" خود کو سرزنش کرکے وہ ہنسا اور سر جھٹک کے صفحہ پر نظر دوڑانے لگا۔ ڈیٹ آف برتھ دیکھتے ہوئے اسے خوش گوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ مندرجات دو دن بعد کی تاریخ بتا رہے تھے۔

"ارے....." حیرت و مسرت کی آمیزش سے اس کے منہ سے نکلا۔ اتفاقیہ طور پر ہی اسے زہرہ کی سالگرہ کا پتا چل گئی تھی۔

"مجھے وش کرنا چاہیے۔" اس کے دل میں کھدبد سی ہونے لگی۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ اسے براہ راست اس کی ذات کے لیے مخاطب کرے گا۔ اسے مبارک باد دے گا' اسے کتنا اچھا لگے گا' یہ سوچ کر ہی ابتہاج محظوظ ہونے لگا۔

"کوئی خاص انداز ہونا چاہیے' کسی خاص تحفے کے ساتھ۔" وہ پرجوش ہوگیا۔ پریزنٹیشن کے پیپر فائل میں لگا کر دراز میں رکھے اور چابیاں اٹھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ ایک بڑے شاپنگ مال میں داخل ہوا تھا۔ آج سے پہلے وہ اندر داخل ہوتے ہی جینٹس کلیکشن کی جانب بڑھ جاتا تھا۔ مگر آج اس کے قدم ہر اس دکان کے آگے رک رہے تھے' جہاں خواتین کے استعمال کی

اشیا دستیاب تھیں۔ مختلف بوتیکس' جیولری' جوتوں' کاسمیٹکس کی کشادہ دکانیں اوپر سے نیچے تک جدید اور قیمتی سامان سے بھری تھیں۔ اس کے لیے انتخاب کرنا مشکل تھا کہ وہ کیا خریدے۔

ابتہاج نے ذہن پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کی کہ زہرہ کس چیز پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔ لباس وہ ہمیشہ سادہ سا پہنتی تھی۔ جیولری کے نام پر صرف لونگ اس کے چہرے کا حصہ تھی اور میک اپ وہ کرتی نہیں تھی۔ "تو پھر کیا خریدوں..... کیا پسند آئے گا اسے؟" وہ الجھنے لگا۔

کسی بھی لڑکی کے لیے یوں خریداری اس کا پہلا تجربہ تھا۔ جو خوش گوار ہونے کے ساتھ ساتھ دشوار بھی تھا۔ اس کے دائیں جانب قطار اندر قطار مختلف بوتیکس تھے۔ جن میں ایک سے بڑھ کے ایک خوب صورت رنگ کے دیدہ زیب ملبوسات لگے تھے۔ جن پر جگمگاتے پتھروں اور نگینوں کا نفیس کام بنا تھا۔ کچھ سادے بھی تھے' مگر بے حد جدید طرز کے سلے ہوئے۔

ابتہاج ایک ہلکے نیلے گھیردار فراک کے آگے جا کھڑا ہوا جو سیاہ رنگ کے اسٹیچو پر لگا تھا۔ رنگ آنکھوں کو اتنا بھلا لگ رہا تھا کہ وہ کچھ دیر سنجیدگی سے اسے خریدنے کے متعلق سوچ گیا۔ فراک کے ساتھ چوڑی دار پاجامہ اور دوپٹے کے بارڈر کے ساتھ ساتھ سیاہ نفیس کڑھائی تھی۔ ویسی ہی کڑھائی فراک کے دامن پر بھی تھی۔ باقی سادہ تھا۔ وہ اسے پیک کرنے کا کہنے ہی والا تھا کہ اس کا دھیان اسٹیچو کے بازوؤں پر چلا گیا۔ فراک سیلولیس تھا۔ ابتہاج ٹھٹک کر رکا۔ "اتنی سردی میں سیلولیس۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

مگر بات سردی کی نہ تھی' بات تو زہرہ کی تھی۔ ابتہاج نے ہمیشہ اسے پوری آستینوں کی قمیص پہنے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ چاہے سردی ہو یا شدید گرمی۔

ابتہاج دقیانوسی سوچ کا مالک نہ تھا۔ مگر جانے کیوں اسے وہ لباس زہرہ کے لیے مناسب نہ لگا..... نفی میں سر ہلاتا وہ باہر نکلنے لگا۔

اسے کوئی بھی چیز زہرہ کے لائق نہیں لگ رہی تھی۔ اسے کوئی بھی تحفہ اس انمول لڑکی کے لیے قیمتی نہیں لگ رہا تھا۔ چلتا ہوا وہ راہ داری عبور کرکے سامنے آگیا۔ روشنیوں کا سمندر سا تھا۔ وہ الجھا ہوا سا پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ڈھیلے قدموں سے چلتا اطراف میں نگاہیں دوڑا رہا تھا۔

"یوں ہی دائیں جانب نگاہ پڑی تو ٹھٹک گئی۔ اس کے قدم رک کر خود بخود اس جانب مڑ گئے۔

ایک معروف ڈیزائنر کے بوتیک میں ڈسپلے پر گئے عروسی لہنگے نے بری طرح اس کی توجہ کھینچی تھی۔

گہرے سرخ رنگ پر براؤن اور سلور خوب صورت سا کام کیا گیا تھا۔ باریک باریک بے حد چمک دار ان گنت نگینے دیکھنے والی آنکھوں کو خیرہ کررہے تھے۔ بلاشبہ لباس بے حد حسین تھا۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر اسے پیش کرنے کا انداز تھا۔ ایک خوب صورت نقشین سیاہ صوفہ نما کرسی پر وہ مجسمہ تمکنت سے بیٹھا تھا اور اس کے گرد شیشوں سے بنی دیواریں تھیں۔ یوں لگتا تھا کوئی ملکہ آئینوں کے محل میں اپنے دربار میں سر اٹھائے بیٹھی ہو۔

جانے کیسے زہرہ اس کے تصور سے نکل کر سامنے آ بیٹھی۔ وہ سوچ گیا۔ زرتار آنچل میں اس کے چہرے پر پھیلی شرم و حیا کی لالی کیسی دلفریب ہوگی۔ گھبرائی گھبرائی سی زہرہ اس کی نظروں کے ارتکاز سے سرخ پڑتی' کبھی پلکیں اٹھائے والہانہ اس کی جانب تکتی اور اسے دیکھتا پا کر تیزی سے نظریں جھکاتی..... کیسا وہ وقت تھم جانے والا منظر ہوگا۔

بڑی بڑی بزنس میٹنگز میں شرکت کرنے والا ابتہاج محبت کی انوکھی لذت سے سرشار گنگ ہوچکا تھا۔ بے حد پریکٹیکل لائف گزارنے والا آج عشق کے پائیدان پہ کھڑا تمکنت سے ایستادہ محبت کے سامنے چاروں شانے چت ہوچکا تھا۔

✡ ✡ ✡

آج اس کی سالگرہ تھی۔ شیریں اور دیگر لیڈیز

اسٹاف کے اصرار پر زہرہ نے آفس کے بیچ آ کر میں کیک کاٹا۔ سربراہی سمیت آفس کے چیدہ چیدہ لوگ اسے نیک تمناؤں سے نواز کر جا چکے تھے۔ چھوٹی سی ایک سیلیبریشن میں خوش باش سی زہرہ نے لیمن کلر پر سیاہ رنگ سے کڑھائی کیے لباس کا انتخاب جس دشمن جان کے لیے کیا تھا وہ نظروں سے اوجھل تھا۔

شاید اسے پتا ہی نہ ہو۔ بھلا ابتہاج کو میری سالگرہ کا کیسے پتا ہو سکتا ہے۔ دماغ تاویلیں دے رہا تھا۔ مگر وہ منتظر تھی۔

گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے وہ اترا۔ اس نے تھپتھپا کے اپنے کوٹ کی جیب میں موجود بریسلٹ کیس کی موجودگی کا تیسری بار یقین کیا۔ بہت گھوم کر وہ یہ تحفہ خرید پایا تھا۔

جیولری شاپ میں سب سے زیادہ اس کی توجہ ایک بے حد نازک مگر ننھے ننھے بے شمار نگینوں سے جڑی ایک انگوٹھی نے کھینچی تھی جو بے تحاشا چمک رہی تھی۔ اس کا دل کیا وہ بنا سوچے سمجھے اسے خرید لے مگر پھر رک گیا۔

کسی خاص فرد کی جانب سے انگوٹھی کا تحفہ کہی ان کہی تمام باتوں کو عیاں کر دیتا ہے۔ ہر راز افشا کر دیتا ہے۔ یہ زیور ایک طرح سے تعلق کی مضبوطی کا امین سمجھا جاتا تھا۔ ابتہاج نے دل چاہنے کے باوجود اسے نہیں خریدا۔ اس کے لیے اسے صحیح وقت کا انتظار کرنا تھا۔ دوسری نظر انتخاب اس بریسلیٹ پر پڑی تھی جس میں ایک نازک باریک سی چین کے ایک طرف چھوٹے چھوٹے سفید موتی لٹک رہے تھے۔ چین پر ساتھ ساتھ ننھے ننھے نگ جڑے تھے۔ وہ مطمئن سا ہوا۔ یہ بریسلیٹ یقیناً" زہرہ کو بہت پسند آئے گا" سوچتا ہوا وہ اندر کی جانب بڑھ رہا تھا۔

اسے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کاوش کرنا ہی زہرہ کے لیے بہت خاص ہو گا' یہ وہ جانتا تھا۔

کوریڈور طے ہو چکا تھا۔ وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے زہرہ کے کیبن کی جانب بڑھا۔

"مس زہرہ! جہاں کھوئی ہوئی ہیں' فی الفور اس دنیا سے باہر آ کر ذرا ادھر بھی نظر کرم کر ڈالیں۔" وجیہہ سراپے کے ساتھ بھرپور مسکراہٹ چہرے پر سجائے شیراز ربانی مقابل تھا۔

وہ مسکرا تک نہ سکی۔ اس وقت وہ شیراز کی صورت تک دیکھنا نہ چاہتی تھی۔

"ارے یہ سنجیدگی کا لبادہ آج تو اتار پھینکیے محترمہ! خیر' سالگرہ بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔"

"شکریہ!" زہرہ نے رسمی مسکراہٹ کے ساتھ یک لفظی جواب دیا۔ جب سے ابتہاج کے دل میں کوئی غلط فہمی پیدا ہونے کا سوچا تھا وہ شیراز سے کترانے لگی تھی۔ شیراز ایک میٹنگ سے واپس لوٹا تھا' ابھی اپنے کمرے میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ اس نے گلاس ونڈو سے ابتہاج کی گاڑی کو پارکنگ کی جانب بڑھتے دیکھا۔

"زہرہ کو برتھ ڈے وش کرنے کا اس سے اچھا موقع کیا ہو گا؟" زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ وہ اٹھا تھا۔ شیریں کی زبانی ہی اسے زہرہ کی سالگرہ پتا چلی تھی۔ وہ بس اسی موقع کی تلاش میں تھا۔

"کیا پاپا نے کھل کے ہنسنے پر پابندی لگائی ہے؟" آہستگی سے رازدانہ انداز میں استفسار کیا گیا۔ "اگر ایسا ہے تو مجھے بتائیے۔ مابدولت خود آپ پر لگائے اس بین کا نوٹس لیں گے۔"

کچھ اس انداز سے کہا گیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ہنسی آ گئی۔

"ہنستی رہا کریں' اچھی لگتی ہیں۔" لفظ تو جانے کیا تھے مگر لہجہ چونکانے کو کافی تھا۔

کوئی کب چپ چاپ دروازے میں آ کھڑا ہوا' اسے خبر نہ ہوئی۔ وہ تو شیراز کے انداز پر دنگ تھی۔ اس نے بے حد حیرت سے شیراز کے چہرے پر نگاہ کی' جو آنکھوں میں کوئی چھلکتا ہوا جذبہ سموئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"زہرہ! یہ میں آپ کے لیے کچھ لایا تھا۔" بہت خوب صورت سیاہ مخملی ادھ کھلی ڈبیہ میں سے نازک سی پلاٹینم کی انگوٹھی نظر آ رہی تھی۔

"آپ اسے پہنیں گی تو یہ انگوٹھی انمول ہو جائے گی۔" بڑے جذب سے کہا گیا۔ "اور.... میری ذات

معتبر!" لمحوں کے توقف سے جملہ پورا کیا گیا۔

زہرہ ششدر سی اس کی جانب دیکھے گئی۔

اس سے زیادہ دیکھنا ابتہاج کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا۔

"ڈسٹرب کرنے کے لیے معذرت چاہوں گا۔"

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو مس زہرہ!"

وہ بری طرح چونکی۔ "ابتہاج...."

اس کے لہجے کی کاٹ نے زہرہ کو خوف زدہ کر دیا۔ اس نے صرف ایک لمحے کے لیے ابتہاج کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ کیا کچھ نہیں تھا وہاں! دکھ.... اذیت.... بے یقینی.... بے اعتباری.... بے مروتی لیے سرد و سپاٹ چہرہ! وہ تیزی سے پلٹا اور باہر نکلتا چلا گیا۔

زہرہ ابھی تک دروازے سے کچھ آگے ٹیبل کے دوسری طرف اس جگہ کو یک ٹک دیکھ رہی تھی جہاں کچھ لمحوں قبل وہ کھڑا تھا۔ کہیں کچھ برا ہو رہا تھا۔ بہت غلط....!

ابتہاج کا لہجہ اور اس پر زہرہ کا یوں گم صم ہو جانا شیراز کے اندر کی کمینگی پر ٹھنڈے چھینٹے ڈال رہا تھا۔ ڈھٹائی اس پر ختم تھی۔ اس نے انگوٹھی نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی۔

"زہرہ آپ اسے پہن لیں۔ میری بھی محنت وصول ہو جائے۔" غم و غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مٹھیاں بھینچ گئیں۔

"مسٹر شیراز ربانی! اپنی یہ عنایتیں آپ کہیں اور صرف کریں تو مہربانی ہو گی۔" غصے کی شدت اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل پا رہے تھے۔

"اور آئندہ بلا ضرورت مجھے مخاطب کرنے کی زحمت مت کیجیے گا۔ ورنہ مجھے سر ربانی سے بات کرنا ہو گی.... اب پلیز جائیے یہاں سے....!" بس نہیں چل رہا تھا وہ اس کی جان لے لے۔ جو اس المناک غلط فہمی کا محرک تھا۔

اتنی بے عزتی پر خفت سے شیراز کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ سختی سے دانت پر دانت جمائے کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

ابتہاج نے جو کچھ آنکھوں سے دیکھا تھا وہ اسے غم و غصہ سے پاگل کر رہا تھا۔ سارے جذبات دھواں ہو گئے تھے۔

کوٹ کی جیب میں موجود بریسلٹ جوں کا توں پڑا اپنی کم مائیگی پر رو رہا تھا۔ دو دن سے اس پر چھائی بے خودی لمحوں میں فنا ہوئی تھی۔ لمحوں میں اس کی خوشی ہواؤں میں تحلیل ہوئی۔

✡ ✡ ✡

ابتہاج اسے بلا ضرورت مخاطب تو پہلے بھی نہ کرتا تھا مگر اس عجب سی غلط فہمی کے باعث اب اور بھی خفا خفا سا پھرتا۔

کیسا کڑا امتحان تھا۔ زہرہ آگے بڑھ کر اسے وضاحت دینے کی جرأت بھی نہ کر سکتی تھی کہ ان میں وفا کے عہد' زندگی سنگ گزارنے کے پیمان بھی نہ ہوئے تھے۔

اس دن بھی ابتہاج کے آفس میں داخل ہوتے ہی زہرہ سے سامنا ہوا' وہ کوریڈور میں کھڑی تھی۔ زہرہ پر نگاہ غلط ڈال کر وہ اندر چلا گیا۔ زہرہ لب کاٹتی آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔

"آپ کی یہ بے رخی مجھے مار ڈالے گی۔" اس کا دل کراہا۔ آج صبح سے ہی شہر دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ اب کی بار سردی بھی شدت کی پڑ رہی تھی۔ زہرہ کو شام سے ہلکا ہلکا بخار محسوس ہو رہا تھا مگر وہ پھر بھی آفس آ گئی۔ اس کے بخار نے زور پکڑ لیا تھا۔ زہرہ کو اپنا جسم درد سے ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

ابتہاج کو شیراز کے کمرے میں گئے گھنٹہ ہو چکا تھا۔ سردیوں کے باعث شام چھ بجے ہی رات کا گمان ہونے لگتا۔ ڈیوٹی آف ہونے کا وقت تھا۔ وہ جلدی جلدی باقی کام نبٹا رہی تھی۔ اسے بس گھر پہنچنا تھا۔ پورا جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ آنکھیں سرخ سرخ سی ہو رہی تھیں۔ جانے کیوں اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔

"مس زہرہ! جن فائلز پر سائن کروانے ہیں' وہ لے آئیے۔" شیراز نے اندر جھانک کر کہا۔

"لیکن اب تو ڈیوٹی آف ہو چکی ہے۔ میں پرسوں صبح آتے ہی سائن کروا لوں گی۔" وہ الجھی۔

"پاپا ارجنٹ میٹنگ کے لیے اسلام آباد جا رہے ہیں' آپ کو یہ کام ابھی نبٹانا پڑے گا۔" کہہ کر وہ پلٹ گیا۔

اچانک اس افتاد پر وہ جھنجلا سی گئی اور متعلقہ فائلز ترتیب دے کر سر ربانی کے کیبن کی طرف چل پڑی۔ اور جان ہی نہ سکی کہ اس کے نکلتے ہی شیراز کمرے میں داخل ہوا۔ زہرہ کا موبائل ہمیشہ کی طرح میز پر لاپروائی سے پڑا تھا۔

اس نے اٹھا کر کچھ ٹائپ کر کے اپنے نمبر پر بھیج دیا۔ بھیجے گئے پیغام کے تمام ثبوت مٹا کر موبائل واپس رکھ کے وہ کمال بے نیازی سے باہر نکل گیا۔ یہ آخری ترپ کا پتا تھا جو وہ کھیل چکا تھا۔ اب بس اسے نتائج کا انتظار کرنا تھا۔ اسی دن کی بے عزتی کا بدلہ نہایت چالاکی سے مکمل سوچ بچار کے بعد لیا گیا تھا۔

آج اس نے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دی تھی۔ ادھر.... شیراز کے کمرے میں بیٹھے ابتاج کی سماعتوں میں پیغام موصول ہونے کی ٹون سنائی دی۔

فائل پڑھتے پڑھتے توجہ کا ارتکاز لحظہ بھر کو ٹوٹا۔ پاس ہی پڑے شیراز کے موبائل پر سرسری سی نظر ڈال کر وہ پھر فائل پڑھنے لگا مگر یکدم ٹھٹک گیا۔ روشن اسکرین پر ابھرتا نام اسے چکرا کر رکھ دینے کو کافی تھا۔ "زہرہ!"

بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر اس نے پیغام کھولا۔ یہ غیر اخلاقی حرکت اس سے غیر ارادی طور پر ہوئی تھی۔ کیونکہ نظر آتے نام نے اس کی "قوت ارادی" کو سن کر دیا تھا۔

"سمیٹ یو ٹومارو مائی لو" (کل ملاقات ہوگی۔ میری محبت)

الفاظ انگارے بن کر اس کی آنکھوں میں چبھے تھے۔ اگلے دن تو اتوار تھا۔

"شاید یہ.... کوئی اور زہرہ ہو۔" دماغ نے لرزتے دل کا ہاتھ تھامنا چاہا۔

وہ زہرہ کے ساتھ شیراز کی بڑھتی بے تکلفی سے بدگمان ضرور ہوا تھا مگر اتنا بھی نہ تھا کہ وہ اس لڑکی کی پاکبازی پر شک کر سکتا جو اس کی محبت میں پور پور ڈوبی نظر آتی تھی۔ بے یقین سی اسکرین پر نظر ڈالی اور نمبر چیک کیا۔

اب.... شک کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ کوئی چیز تھی جو چھنا کے سے اس کے اندر ٹوٹی تھی۔

شاید اعتبار....!

کچھ تھا جس نے اسے تڑخا کے رکھ دیا تھا۔ اس کی ذات میں دراڑیں ڈال دی تھیں۔ وہ گم صم سا سن بیٹھا رہ گیا جیسے کسی نے اس کے جسم سے جان نکال دی ہو۔

شیراز سیٹی بجاتا' مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اپنا موبائل اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔

"آج تو بہت ٹھنڈ ہے یار!" وہ ہونٹ سکیڑ کے دونوں ہاتھوں کو آپس میں ملتے ہوئے بولا۔

"کل تو چھٹی ہے۔ پھر باقی کام پرسوں کریں گے۔ ٹھیک ہے؟"

کہہ کر وہ اس کے چہرے کو کھوجنے لگا جہاں زردی سی کھنڈی تھی۔ اس کا منصوبہ کامیاب ہوا تھا' وہ مسکرا دیا۔

ہر طرح سے اس سے آگے رہنے والا ابتاج کیسا ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔ آج اس نے اسے شکست دے دی تھی۔

ابتاج کی خالی خالی نظریں اس کے چہرے پر گڑی تھیں جو مسکراہٹ سے چمک رہا تھا۔

مگر ابتاج جانتا نہ تھا۔ وہ چمک فتح کی نہ تھی' طمانیت اپنی کمینگی کی کامیابی پر تھی۔

"اللہ حافظ" کہتے ہوئے اور اسی طرح مسکراتے ہوئے بنا جواب لیے وہ باہر نکل گیا تھا۔ ابتاج بت بنا سب کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا یہ لڑکی.... میرے ساتھ محبت کا ناٹک رچا رہی تھی۔

کھیل رہی تھی مجھ سے...."

یہ صورتحال اس کی مردانگی پر تازیانے برسا رہی تھی۔ جانے کتنے پل بیت گئے تھے یوں بیٹھے بیٹھے.... آہستگی سے خود کو سمیٹ کے وہ اٹھا۔

بیگ کندھے پر ڈال کر باہر نکلتی زہرہ پر اس کی نظر پڑی۔ سردی کی شدت سے وہ اپنے سیاہ سوئیٹر کی آستینیں کھینچ کر یخ ہتھیلیاں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آج اسے واپسی میں بہت دیر ہو گئی تھی آفس خالی ہو چکا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ابتاج کے اندر لاوا پھوٹنے لگا۔ ابلتا گرم خون اس کے دماغ پر ٹھوکریں مار رہا تھا۔

"آئندہ میرے سامنے اپنی مکروہ صورت لے کر کبھی مت آنا' ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔" انگلی اٹھاتے ہوئے سخت لہجے میں تنبیہہ کر کے وہ پلٹا۔ ہمیشہ عزت کے ساتھ زہرہ کو "آپ" کہنے والا ہمیشہ چپ رہنے والا ابتاج آج پھٹ پڑا تھا۔

"ابتاج!" لفظ زہرہ کے منہ میں ہی رہ گئے۔ کیونکہ وہ تیز قدموں سے باہر جا چکا تھا۔ وہ گنگ سی کھڑی تھی۔ اس کے حواس ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔

زہرہ کی چھٹی حس کسی انہونی کا پتا دے رہی تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلی۔ ابتاج پارکنگ تک پہنچ چکا تھا۔ آفس کے سب لوگ جا چکے تھے۔ زہرہ تیز قدموں سے تقریباً" بھاگتے ہوئے اس تک پہنچی۔

"ابتاج.... میری بات سنیں پلیز!" وہ رو دینے کو تھی۔

"اب سننے سنانے کو کیا رہ گیا ہے محترمہ؟" وہ پورے قد کے ساتھ پلٹا۔

"کیا ہوا ہے؟ آپ.... ایسے کیوں کر رہے ہیں؟"

"اوہ! اچھا! تو اب یہ اداکاری بھی کرو گی تم؟" ابتاج کے اس لہجے سے تو وہ کبھی واقف نہ ہوئی تھی۔

"پہلے کتنوں کو جھانسے دے چکی ہو اور میں کس نمبر پر آتا ہوں؟" سینے پر ہاتھ باندھ کر بے حد سفاک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا گیا۔ زہرہ کے دل پر جیسے کسی نے آرا چلانا شروع کر دیا۔ ڈبڈبائی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

"میں نے صرف آپ سے محبت کی ہے ابتاج!" بھیگے لہجے میں وہ بمشکل اپنی بات پوری کر پائی۔ آنسوؤں کا گولہ اس کے گلے میں پھنس گیا۔

"محبت....؟" اس نے زوردار قہقہہ لگا کر اس کے اعتراف کا گویا مذاق اڑایا۔

"اپنے مکرو فریب کو محبت کہتی ہو تم؟" وہ پھنکارا۔

"یا جو پارٹی زیادہ اسٹرانگ ہو اس کے لیے چارہ ڈالنے کو محبت کہتی ہو؟" یکے بعد دیگرے لگنے والے کوڑے اسے ادھیڑنے لگے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیوں کہہ رہے ہیں؟ آپ نے کب مجھے محبت کو پامال کرتے دیکھ لیا؟" وہ حیران تھی۔ اس کو حیران ہونا ہی چاہیے تھا۔

"تم کیا سمجھتی تھیں' مجھے کچھ پتا نہیں چلے گا اور اپنی معصوم صورت سے تم مجھے یونہی دھوکے دیتی رہو گی.... بولو.... کیا سمجھتی رہیں تم مجھے؟"

"میں کیوں دوں گی آپ کو دھوکا؟ کیا ملے گا مجھے؟"

"یہ تو تم خود بہتر بتا سکتی ہو کہ اس دھوکے کے بدلے تمہیں کیا کیا مل سکتا ہے۔" زہرہ کی ہر بات پر وہ اسے ایک نیا کوڑا مارنے کو تیار تھا' پوری طاقت سے....

"میں نے پورے خلوص سے تمہیں چاہا' تمہیں خالص سمجھا' خاص سمجھا' تمہاری رسوائی کے ڈر سے کبھی اپنے جذبات تم پر آشکار نہ کیے کہ میں صحیح طریقے سے تم تک پہنچنا چاہتا تھا۔ تمہیں اپنی زندگی بنانا چاہتا تھا لیکن میں غلط تھا۔"

وہ چیخ رہا تھا اور زہرہ اس کے لفظ لفظ پر اپنی جگہ منجمد سی ہوتی جا رہی تھی۔ "میں غلط تھا' بے وقوف تھا۔ تمہاری معصوم صورت کے پیچھے چھپے تمہارے سازشی ذہن کو سمجھ نہ سکا۔ تمہاری سادگی' کم گوئی کو تمہاری حیا سمجھتا رہا جبکہ تم ان اداؤں سے کیا کام لیتی رہیں۔" وہ کیسے گھناؤنے الزام لگا رہا تھا۔ زہرہ کا دل پھٹنے لگا۔

کون سا انکشاف کب ہو رہا تھا' جب محبت کے پیڑ کو بدگمانی کی آندھی نے زمین سے اکھاڑ ڈالا تھا۔ جڑوں سمیت....!

وہ گنگ سی اس کی صورت تکے گئی۔ آج اظہار ہوا

بھی تو اس لمحے میں جب اس کی محبت کا وجود خاک میں مل رہا تھا۔ ہمت مجتمع کر کے اس نے وضاحت دینے کی ایک اور سعی کی۔

"آپ.... آپ کو یقیناً" کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہو رہی ہے ابتہاج! میں نے زندگی میں کبھی کسی مرد کا سایہ بھی خود پر پڑنے نہیں دیا۔" اس کا گلا پھر رندھ گیا۔

ابتہاج نے تنفر سے چہرہ دوسری جانب موڑ لیا۔

"میں نے آپ سے بھی کبھی بے وجہ کی بے تکلفی بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ پھر میں کسی اور کے متعلق کیسے سوچ سکتی ہوں۔"

"خوب!" وہ استہزائیہ ہنسا۔ "مجھ سے بے تکلفی کیونکر ہوتی، جبکہ مقابل زیادہ مال دار آسامی تھی۔" وہ زہر اگل رہا تھا۔

"جھوٹ.... یہ جھوٹ....!" اسے لگا اس کی زبان پتھر ہو گئی ہو۔ ابتہاج نفرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ آنکھیں نہیں تھیں جن سے وہ زہرہ کو دیکھا کرتا تھا۔

"کاش کہ جھوٹ ہوتا...."

سردی یک دم بڑھی تھی یا ابتہاج کے سرد لہجے کا اثر کہ زہرہ کپکپانے لگی۔ اسے لگا، ساری وضاحتیں، ساری صفائیاں، سارے لفظ بے معنی ہو گئے۔ بے توقیر ٹھہرے۔

زہرہ کی ذات پر اس کا اعتبار ریت کی دیوار ثابت ہوا تھا۔

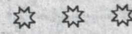
"وہ بے نام سا رشتہ جو ہم میں تھا.... وہ یہیں ختم ہوتا ہے۔"

وہ بولا تو اس کی آواز لرز گئی۔ زہرہ نے پھر نظر اٹھا کر اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے وہم نہیں ہوا تھا۔ نمی صرف اس کے لہجے میں نہیں تھی، آنکھوں میں بھی تھی۔ زہرہ اسے روکنا چاہتی تھی۔ اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہتی تھی۔ مگر وہ وقت اس کا نہیں تھا۔

مٹی کے تودے کی طرح وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ زناٹے سے اس کی گاڑی زہرہ کے بکھرے وجود کے پاس سے گزر گئی۔

آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر دوپٹے میں جذب ہونے لگے۔

یہ آنسو نہیں تھے۔ وہ خون تھا جو ابتہاج کے تابڑ توڑ برسائے پتھروں کی بدولت بہہ رہا تھا۔ زہرہ کا بخار سے تپتا وجود ڈھے گیا۔



اس کی معصوم اور ان کہی محبت یوں اختتام پذیر ہوئی اور وہ بھی اس فرد کے ہاتھوں جس کے ساتھ اس کی سانس کی ڈور بندھ گئی تھی۔ وہ اب تک بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

کتنے ہی دن یقین و بے یقینی کے بیچ ڈولتے گزر گئے۔ زہر میں بجھے تیر اس میں اب تک پیوست تھے۔ مگر وہ دم سادھے تاریک گوشے میں پڑی اس تلخ آب بیتی پر صدمے سے چور بلکتی رہتی، سلگتی رہتی، اماں نے بارہا پوچھا، مگر وہ بول کر نہ دی۔ وہ بوڑھی ناتواں جان اس کے ساتھ ساتھ خود بھی رو پڑتیں۔ جانے کیا ہوا تھا، جانے کیا بیتی تھی۔ انجانے خدشوں میں گھر کر ان کا نقاہت زدہ وجود لرز اٹھتا۔

ان کی پریشانی کا سوچ کر زبردستی اپنے حواس مجتمع کرتی وہ پانچ دن بعد تاریک گوشے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

گھر کی حالت ابتر تھی، صحن مٹی سے اٹا پڑا تھا۔ کچن گندا تھا۔ جیسے تیسے اماں کھانا تیار کرتی رہی تھیں۔ اسے شرمندگی نے آ گھیرا۔ پانچ دنوں میں ہی اس کا رنگ سرسوں کے پھول کی مانند ہو گیا تھا۔ جو بھی ہوا تھا اس میں اس کی اماں اور بھائی کا کیا دوش تھا۔ کیا قصور تھا جو اپنے ساتھ وہ انہیں بھی سزا دے رہی تھی۔ اس نے کمر کس کے جھاڑو اٹھائی اور سارا گھر دھو ڈالا۔ کپڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ وہ بھی نپٹایا۔ اسی میں دوپہر ہو گئی۔ وہ رومی کی کتابیں لیے صحن میں بیٹھی اسے پڑھا رہی تھی۔ اماں ٹوکری میں سبزی لیے اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ بہت دن بعد اسے معمول کے انداز میں کام کرتے دیکھ کر وہ پرسکون ہوئی تھیں۔

"میری بیٹی کی طبیعت ٹھیک ہے اب؟" وہ بخار میں پھنکتی رہی تھی۔ اسی لیے انہوں نے پیار سے پوچھا۔

"جی.... جی اماں! میں تو ٹھیک ہوں، مجھے کیا ہونا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ممتا کی گرمی سے اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ جو اس کے ساتھ ہوا وہ انہیں کیسے بتا سکے گی کبھی۔

"زہرہ! دیکھ بیٹی! جو بھی مسئلہ ہے، اپنی ماں کو بتا، جو بھی پریشانی ہے مجھ سے کہہ چندا!" وہی سوال جو پچھلے کئی روز سے پوچھ پوچھ کر وہ تھک گئی تھیں اور جواب میں بس آنسو مل رہے تھے۔ وہ اب پھر پوچھ بیٹھیں۔

"کوئی بھی پریشانی نہیں ہے اماں! بخار کی وجہ سے چڑچڑی ہو رہی تھی بس۔" نظریں چراتے ہوئے اس نے کہا۔

"تو بیٹا آفس سے چھٹی لی ہے؟"

"آفس.... وہ میں نے چھوڑ دیا اماں۔" وہ کب تک چھپاتی آخر۔

"کیوں؟ سب خیریت تو تھی زہرہ؟ دیکھ اپنی ماں سے کچھ مت چھپا۔ میرا تو کلیجہ منہ کو آ رہا ہے تیری حالت دیکھ دیکھ کر۔" وہ پھر سے پریشان ہو اٹھیں۔ اب زہرہ کو کسی نہ کسی طرح بات سنبھالنی تھی۔

"اماں! جہاں عزت نہیں، وہاں کام کر کے کیا کروں گی۔" تھکے لہجے میں بولی۔

"عزت نہیں.... کیا بول رہی ہے تو زہرہ.... ٹھیک سے بتا۔"

"کچھ نہیں اماں، بس ذرا ذرا سی غلطی پر ڈانٹ ڈپٹ، دوسرے لوگوں کے سامنے مجھ سے نہیں برداشت ہوئی تو چھوڑ دیا بس۔" اپنے جھوٹ پر اسے شرمندگی تو ہوئی، مگر اماں کے چہرے پر ہویدا انہونی کا خوف قدرے کم دیکھ کر اطمینان سا ہوا۔

"اچھا.... جیسے تجھے ٹھیک لگے بیٹی۔" وہ کہہ کر سبزی کاٹنے لگیں۔ پھر ایک دم کچھ یاد آجانے پر بولیں۔

"ابتہاج نے اتنے دنوں سے چکر کیوں نہیں لگایا؟"

کچھ لمحوں تک زہرہ کچھ نہ بول سکی۔

"جب ان کے دفتر میں کام ہی چھوڑ دیا تو اب وہ کیا کرنے آئیں گے ادھر۔" اماں مطمئن تو نہ ہوئیں، مگر خاموش ہو گئیں۔ زہرہ کے چہرے پر چھائی رنجیدگی ان سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔

اگلے دن پہلی فرصت میں اس نے اپنا استعفیٰ پوسٹ کیا اور جواب میں سربراہی کا فون آگیا۔ وہ نوکری چھوڑنے کی وجہ پوچھنا چاہتے تھے۔ زہرہ نے مختصر الفاظ میں والدہ کی خرابیٔ طبیعت کا بتا کے معذرت کرلی۔ وہ اس جگہ اب کبھی نہ جانا چاہتی تھی۔ مگر زندگی یوں کب گزری ہے۔

فکر معاش نے اسے پھر نوکری کی تلاش میں لگا دیا۔ فوری طور پر اور تو کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ مگر ایک انگلش میڈیم اسکول میں اسے ٹیچر رکھ لیا گیا۔ تنخواہ بہت اچھی تو نہ تھی۔ مگر معقول تھی۔ ساتھ ساتھ وہ کسی اچھی نوکری کی تلاش میں مختلف اخبارات بھی کھنگالتی رہتی۔ اسکول سے آکر وہ بچوں کو ٹیوشن دینے لگی تھی۔ زندگی کی گاڑی جیسے تیسے پھر سے رواں ہو گئی تھی۔

ایک جگہ سے اسے انٹرویو کال آئی تھی۔ مگر وہاں سے واپسی پر وہ مایوس لوٹی تھی۔ نوکری تو اچھی تھی۔ مگر رات آٹھ بجے تک کی ڈیوٹی وہ نہ کر سکتی تھی۔ ان ہی سوچوں میں الجھتی وہ بستر پر لیٹی تھی۔

سردیاں اپنے اختتام کی طرف بڑھ کے اب گرمیوں کی طرف جا رہی تھیں۔ اس کی آنکھ لگ گئی۔ دن بہت تھکا دینے والا تھا۔ اس پر یہ مایوسی.... آنکھ بند ہوتے ہی بستر پر پڑا اس کا موبائل بج اٹھا۔

اس نے فون اٹھا کر دیکھا۔ جلتی بجھتی اسکرین پر موجود نمبر کو وہ نہیں جانتی تھی۔ قدرے الجھتے ہوئے کال ریسیو کرنے یا نہ کرنے کی کشمکش میں ہی فون بند ہو گیا۔ ابھی اس نے فون واپس پلنگ پر رکھا ہی تھا کہ وہ پھر سے بجنے لگا۔ اس نے بٹن دبا کر فون کان سے لگایا۔

"ہیلو۔"

"ہیلو مس زہرہ آفتاب.... کیسے مزاج ہیں آپ کے؟" بھاری مردانہ آواز پر اس کا چہکتا ہوا انداز.... زہرہ چونکی۔

"میں تو خیریت سے ہوں، مگر آپ کون؟" وہ واقعی

نہیں پہچانی تھی۔ اس کے استفسار پر فون کے دوسری طرف سے قہقہہ ابھرا۔

"ارے کمال ہے' اتنی جلدی فراموش کر دیا آپ نے تو ہمیں' مجھے تو لگتا تھا' بندۂ ناچیز آپ کو رہتی سانس تک یاد رہے گا۔"

بے حد شوخی بھری مگر بہکی بہکی سی آواز ابھری۔ اب کی بار زہرہ کی چھٹی حس نے اسے پہچان لینے میں مدد کی تھی۔

"اوہ.... تو آپ ہیں۔" اس کے لہجے میں تلخی گھلنے لگی۔

"جی میں ہوں' آپ کا خادم شیراز۔" بہت عامیانہ انداز میں کہا گیا جملہ اسے سلگا گیا۔

"تعارف کی ضرورت نہیں شیراز صاحب! آپ جیسے کمینے انسان کو میں کیسے فراموش کر سکتی ہوں۔" اس کا حلق کڑوا ہونے لگا۔

"نہ نہ.... ایسے بات نہیں کرتے مس' انسان کی زبان اور اخلاق اسے عرش پر بھی بٹھا سکتے ہیں اور زمین کے اندر بھی دھنسا سکتے ہیں۔ اس لیے بولتے ہوئے ذرا دھیان رکھا کیجیے۔ پچھلا تجربہ ابھی تک بھولی تو نہ ہوں گی آپ۔" وہ خاموش رہی۔

"آپ کے فضول ناز نخروں نے ہی آپ کو یہ دن دکھایا ہے۔ اگر ٹھیک سے چلتیں تو ہمیشہ یہیں رہتیں۔ ہمارے آس پاس۔"

"اپنی یہ فضول گوئی سمیٹیے اور مدعا کہیے۔" بہت ضبط کر کے وہ بولی۔

"مدعا کیا ہو گا محترمہ! بس آپ کا احوال دریافت کرنے کا موڈ ہوا تو فون کر لیا.... کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھیں کہ میں آپ کے فراق میں مرا جا رہا ہوں۔" طنزیہ لہجے میں کہہ کر وہ ہنسا۔

"حقیقت تو یہ ہے کہ تم جیسی معمولی لڑکی پر تو میں دوسری نظر بھی نہیں ڈالتا۔" بڑی دیر سے بناوٹی آپ جناب سے وہ اصلیت پر اتر آیا۔

"وہ تو بس ابتہاج کے تمہاری جانب ملتفت ہونے اور تمہاری میرے سامنے سرد مہر اداؤں نے مجھے ضد چڑھا دی اور نتیجہ تم بھگت ہی رہی ہو۔"

زہرہ کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ اس کی گہری خاموشی پر وہ کھلکھلا کر ہنسا۔

"تم یہی سوچ رہی ہو گی کہ مجھے تمہارے اور ابتہاج کے متعلق کیسے پتا چلا' تو سوچنا ترک کر دو اور بس اس بات پر پچھتاؤ کہ تم نے شیراز ربانی کو انکار کیسے کیا۔ مجھے نظر انداز کیسے کیا۔ نہ تم ایسا کرتیں' نہ میں ابتہاج کے دل میں تمہاری طرف سے غلط فہمی کے بیج بوتا۔"

اسے لگا شیراز اس وقت ہوش میں نہیں ہے۔ لڑبڑی سی تھی' اس کی آواز میں نشہ سا تھا' لڑکھڑاہٹ تھی۔

"وہ غلط فہمی...." وہ بول نہیں پا رہی تھی۔

"ہاہاہا.... ہاں' کیسا شاندار پلان تھا نا' ماننی ہو نا پھر شیراز ربانی کے جینئس دماغ کو.... یہی سب کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس ابتہاج کے گن گاتے پھرتے ہیں سارے۔ ہمیشہ ہر کام میں وہ ڈفر سبقت لے جاتا تھا۔ دیکھو میں نے اسے ہرا دیا۔"

بات ختم کر کے وہ پھر ہنسنے لگا۔ زہرہ کی یہ حالت تھی کہ کاٹو بدن تو لہو نہیں۔

"آپ جیسے گھٹیا ذہنیت کے مالک اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اب اپنی بکواس بند کر لیجیے اور آئندہ یہاں فون کرنے کی جرأت نہ کیجیے گا۔"

"آں ہاں.... رکیے تو سہی' میں نے تو آپ کو اپنی منگنی کی اطلاع دینے کے لیے کال کی تھی۔ امید واثق ہے کہ اس پر مسرت موقع پر اپنی آمد کا شرف ضرور بخشیں گی۔" خباثت سے کہہ کے وہ ہنسا تو زہرہ نے بنا کچھ کہے فون کاٹ دیا۔

اس کا سانس پھول رہا تھا۔

"یہ.... کیا کہہ رہا تھا شیراز.... اپنی ضد کی بدولت اس نے...." اس کے ذہن نے کام کرنا بند کر دیا۔

"اس نے محض غلط فہمی کی دیوار کھڑی کرنے کے لیے ایسی صورت حال پیدا کی.... ایسے حالات پیدا کیے کہ ابتہاج مجھے اور اسے...."

"اوہ خدا...." سر ہاتھوں پر گرا کر وہ دو زانو بیٹھی رہی۔ تمام واقعات مکمل جزئیات کے ساتھ اسے یاد

آنے لگے تھے۔

جو بھی تھا، سب ختم ہو چکا تھا۔ مگر اسے اس شخص تک اپنی سچائی پہنچانی تھی جو بنا سوچے سمجھے اس پر رکیک الزامات کے کوڑے برسا گیا تھا۔ جن سے رستا خون اسے اب بھی تڑپاتا تھا۔

✡ ✡ ✡

کمرے کی سامنے والی دیوار میں موجود قد آدم کھڑکی کے قریب رکھی آرام دہ کرسی پر نیم دراز وہ گود میں رکھی کتاب کو کھولے گم صم تھا۔

دروازے پر آہستگی سے دستک ہوئی۔ اس نے جواب نہ دیا۔ اگلی بار دروازہ تھوڑا زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ وہ جھنجھلایا۔

"کرم دین! مجھے نہیں کرنا ابھی ناشتا، کتنی بار کہنا پڑے گا تم سے؟" غصے سے وہ دھاڑا۔

صبح سے اب تک اس کے مسلسل انکار کے باوجود کرم دین تین بار آکر پوچھ چکا تھا۔ اب کی بار اس کی آمد پر اسے غصہ آگیا تھا۔

"نہیں صاحب! ناشتے کا نہیں کہہ رہا، آپ کے نام کچھ آیا ہے۔"

دروازے کے باہر کھڑے کرم دین نے معذرت خواہانہ انداز میں اطلاع دی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور پیکٹ پکڑ کر دروازہ پھر بند کر دیا۔ بہت دن سے اس کی طبیعت میں عجیب سی بے زاری عود آئی تھی۔ چڑچڑاہٹ ہر وقت اس کے مزاج کا حصہ رہتی۔ کرم دین اپنے نرم نرم لہجے میں بات کرنے والے خوش مزاج سے چھوٹے صاحب کے اس بدلاؤ پر بہت حیران تھا۔

کرسی پر بیٹھ کر اس نے خاکی رنگ کے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ بھیجنے والے کا نام پڑھ کر اس کا دماغ سلگنے لگا۔ غصے سے جبڑے بھینچ گئے۔ اس کے اندر لاوا سا ابلنے لگا۔ "گھٹیا پن کی بھی انتہا ہوتی ہے۔" زہرہ کا بھیجا لفافہ بنا کھولے بنا دیکھے اس نے پوری قوت سے دیوار پر دے مارا۔ نفرت کی چنگاریاں اس کی نس نس میں دوڑنے لگیں۔

وہ مرد تھا اور ایک عام سی لڑکی کس شاطرانہ طریقے سے اسے بے وقوف بنا گئی تھی، یہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ لاکھ جھٹکنے کی کوشش کرتا، ذلت کا احساس اس پر حاوی ہوتا چلا جاتا۔

یوسف احمد اس سے بارہا پوچھنے بیٹھے تھے، مگر ابتہاج کے دوٹوک جواب پر حیران و پریشان رہ گئے تھے۔ جس کا کہنا تھا کہ کوئی بھی اسے شادی جیسی خرافات کے لیے مجبور نہ کرے، ورنہ وہ واپس لندن چلا جائے گا۔

اسلام آباد سے آئے بھابھی، بھیا نے اسے کتنا سمجھایا، کتنی بار اس سے اس درشتی کی وجہ دریافت کی۔ مگر نہ تو وہ کچھ سننا چاہتا تھا، نہ بولنا چاہتا تھا۔

دوسری طرف شیراز کے ساتھ کیا جانے والا انٹر نیشنل پروجیکٹ اس نے بنا کسی وجہ کے چھوڑ دیا تھا۔ اس میں سراسر نقصان اس کا خود کا ہوا۔ مگر وہ اب اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا تو کام کیسے کر لیتا۔ پروجیکٹ بیچ میں چھوڑ دینے پر محسن ربانی نے ابتہاج کو سمجھانے کی بہتیری کوشش کی۔ مگر اس کی نہ، ہاں میں نہ بدل سکی۔ وہ بھی اس پر غیر ذمہ داری اور لاپروائی کا لیبل لگا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

شیراز کی تو گویا چاندی ہو گئی۔ ایک تیر سے اس نے تین، تین شکار کیے تھے۔ ایک طرف اپنے پاپا کی نظر میں اس نے ابتہاج کی ساکھ کو بری طرح تباہ کر دیا تھا۔ دوسرا اسے ابتہاج کو نیچا دکھا کر شکست دینے کا یہ نایاب موقع سالوں بعد مل سکا تھا۔ جس نے اس کے اندر جلتی حسد کی آگ کو یک دم ٹھنڈا کر دیا تھا۔ تیسرا فائدہ زہرہ کو سبق سکھانے کا ہوا تھا۔ جو اس کی مردانہ انا پر ضرب لگا رہی تھی۔

وہ بھی ایک بے زار اور زرد، زرد سی شام تھی جب شیراز کی منگنی کا کارڈ اسے موصول ہوا۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں لیٹا چینل سرچنگ میں مصروف تھا۔

"اوہ..." کارڈ کرم دین سے لے کر وہ زہرخند انداز میں مسکرایا۔ "آخر دونوں کی محبت کی ٹرین پٹڑی پر چڑھ ہی گئی۔" لیٹے لیٹے خوب صورت سنہری ربن میں بندھا گلابی کارڈ کھولتے ہوئے اس کے اندر نفرت کا زہر بھر چکا تھا۔

"اریبہ زبیر؟" ایک انجان سا نام اسے ششدر کر گیا۔ ایک دم وہ اٹھ بیٹھا اور کارڈ دوبارہ پڑھا۔ مگر نہ تو نام میں کوئی تبدیلی ہوئی، نہ حیرت میں کمی۔

"یہ کیا ہوا؟" اس کا دماغ اس گتھی کو سلجھا نہیں پا رہا تھا۔ "اریبہ زبیر۔" وہ پھر بڑبڑایا۔

اس کی یادداشت پر ایک الٹرا ماڈرن لڑکی ابھری۔ لندن میں اس سے ایک سال جونیئر تھی اور شیراز کے ساتھ اس کا افیئر مشہور تھا۔ مگر ابتہاج کی براہ راست اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

"اگر منگنی اریبہ زبیر سے ہے تو وہ سب....." اس کی عقل ماؤف ہو رہی تھی۔ وہ چپ چاپ کارڈ تھامے بیٹھا رہا۔ اس کا ذہن اتنی غیر متوقع بات ماننے کو تیار نہ تھا۔

زہرہ اور شیراز کے بیچ تحائف کے تبادلے ہوتے اس نے خود دیکھے تھے۔ اسے زہرہ کی سالگرہ پر شیراز کا جذبے لٹاتے ہوئے انگوٹھی دینا یاد آیا۔ پھر اسے شیراز کے موبائل پر وہ پیغام یاد آیا تو گویا نہ صرف محبت کا اظہار ہو چکا تھا بلکہ ملاقاتیں بھی جاری تھیں۔ پھر اس کارڈ پر زہرہ کے بجائے کسی اور کا نام کیوں تھا۔ اس کے خیال میں تو دونوں نے اس کی لاعلمی میں پیار کی سیڑھی چڑھی۔ زہرہ نے جی بھر کے ابتہاج کو بے وقوف بنایا اور آخر میں بھی اپنی کوتاہی، اپنا دھوکا نہیں مانی۔

اس کے دھیان میں آخری ملاقات پر دو گہری ڈبڈبائی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں ابھریں۔ وہ لب کچلتے ہوئے اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ "کوئی شیراز سے بھی بڑی آسامی ہاتھ لگ گئی ہوگی۔"

گتھی کو اپنے تئیں سلجھا کر اس نے سر جھٹکا اور پھر سے ریموٹ اٹھا لیا۔ مگر جانے کیوں ایک بے سکونی اس کے اندر سرایت کر گئی تھی۔

قدم خود بخود اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ اندر جا کر کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کے اس نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ مگر کیا ڈھونڈ رہا تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ چلتا ہوا ڈریسنگ روم کی طرف آگیا۔ اس کے ادھ کھلے دروازے سے وارڈروب کے نیچے کی طرف وہ خاکی لفافہ نظر آیا تھا جو پھینکنے سے پھٹ چکا تھا اور اس کے اندر سے سفید کاغذ جھانک رہے تھے۔ اس کے قدم بے اختیار اس طرف اٹھ گئے۔ وہ جان چکا تھا کہ وہ کیا ڈھونڈ رہا تھا۔

اس نے پنجوں کے بل بیٹھ کر وہ لفافہ اٹھا لیا اور وہیں کھڑے کھڑے کھولا۔ اس میں سفید کاغذ پر سیاہ موتیوں سے سجی تحریر تھی۔ وہ چلتا ہوا کھڑکی کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اس لڑکی کے سب ڈرامے جان گیا تھا۔ اس کی اصلیت سمجھ گیا تھا۔ پھر کیوں اس کی بھیجی اس تحریر کو پڑھنے بیٹھا تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

تین تہہ میں بند ہوئے کاغذ اس نے سیدھے کیے۔ تحریر، سلام، دعا اور القاب و آداب جیسی رسمی شروعات سے عاری تھی۔ اپنے ذہن میں موجود گنجلک سوچوں کو کچھ لمحوں کے لیے جھٹک کے اس نے صفحے پر نگاہ جما دی۔

"رنگ و خواب اور ریشم مل کر بناتے ہیں ایک دنیا.....

جہاں محبت کاشت ہوتی ہے، محبت پانی بن کر بہتی ہے۔ ہوا بن کر فضا میں گردش کرتی ہے۔

آئیں میں آپ کو ایک کہانی سناؤں۔

یہ کہانی محبت کی ہے اور اس شخص کی جسے میں نے اپنی حیات جانا۔

پہلی محبت کو سینچتا، پالتا، پوستا، پروان چڑھاتا انسان کن پتھروں پر چلتا ہے۔

کیا آپ یہ داستان سنیں گے؟

چلیں کچھ لمحوں کے لیے ہم اپنی جگہیں بدل لیں۔ آپ میری جگہ لے لیں اور پھر محسوس کریں کہ زندگی سے موت تک کا سفر کیسا ہوتا ہے۔"

یقیناً "یہ اسے ٹریپ کرنے کا کوئی حربہ تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا، مگر پھر خود بخود اس کے ہاتھ اگلا صفحہ پلٹ رہے تھے۔

"میں... زہرہ آفتاب' ایک ایسی لڑکی جس نے اپنی زندگی نگاہیں جھکا کے نیند کی سی کیفیت میں تئیس سال بتا دیے' مجھ پر یکایک رحمت کردی گئی' محبت کی صورت مجھے بھی خاص لوگوں کی صف میں شامل کردیا گیا۔

وہ بہاروں کا سا مہکتا ہوا شخص تھا' میں اس کے قابل نہ تھی' لیکن اس نے میرا ہاتھ تھام کر اپنے برابر لا کھڑا کیا۔

اپنے ساتھ... اپنے پاس...

اور میں نے اس کے سنگ خوابوں کی سرزمین پر دھیرے سے قدم دھر دیے...

سرسبز... معطر... پر بہار سی جگہ تھی' میں اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے بڑھتی جارہی تھی اور ایک بھینی سی خوشبو ہمارے گرد حصار باندھے سارے میں پھیل رہی تھی۔

میری ہتھیلی پر اس کے ہاتھ کا لمس' نرم خو لہجے میں میرا نام پکارنا مجھے محبت کے قرب سے آشنا کررہا تھا۔

اس کی آنکھوں نے مجھ سے کہا۔

"آؤ' ایک نئی دنیا بساتے ہیں۔"

میں کچھ نہیں بولی مگر میری آنکھیں مسکرا اٹھی تھیں۔

آنکھیں بول پڑی تھیں!

اس نے ایک ایک کرکے میری آنکھوں میں خواب بھرنے شروع کردیے۔

رنگوں کے خواب...

خواہشوں کے خواب...

حسرتوں کی تکمیل کے خواب...

اس کے ساتھ' اس کے قرب کی حلاوت سے سرشار میں خوابوں کے سفر میں قدم بڑھاتی چلی گئی۔"

صفحہ ختم ہوگیا تھا۔ مگر ابتہاج اب تک لفظ لفظ گن رہا تھا' سب ڈرامہ سمجھنے کے باوجود اس میں گم ہورہا تھا۔ وہ لفظ "اس" استعمال کیے جانے والے کو جانتا تھا۔

"وہ" کہہ کر اس کے ہم سفر کی شناخت اس تحریر میں ابتہاج نہ کرپاتا تو کون کرتا۔

یہ اعتراف پر مبنی لفظ تھے' اقرار پر مبنی جملے تھے' مگر اس کے لیے وہ محض ایک "چارہ" تھا جو زہرہ اسے ڈال رہی تھی۔

"عورت تو سدا محبت کی متلاشی رہی ہے' جو یہ گوہر میری قسمت میں آیا تو یوں لگا اس نے مجھے پر لگادیے ہوں۔

میں اڑ سکتی تھی۔ میں پوری دنیا کے گرد گول گول چکر کاٹتی کسی ننھے پرندے کی مانند چک پھیریاں بھرتی جس نے پہلی ہی پرواز میں دنیا کا چکر کاٹ ڈالا ہو۔

یوں لگنے لگا ہر چیز میری دسترس میں ہے' ہر شے میری مٹھی میں ہے۔ پھر اس کی ہمراہی میں ہمیں آگے بڑھی اور اس سنسان مگر سرسبز خطے پر اپنی دنیا بسانے لگی' محبت ساتھ ہو تو وہاں کی ویرانی اثر رکھتی ہے نہ بیابانی۔

میرے ساتھ تو وہ تھا... میری دنیا مکمل تھی۔

اس انسان نے مجھے یقین دیا' مان دیا' تحفظ دیا' محبت دی اور میں نے ریشم کے رنگ برنگ دھاگوں سے اپنا گھر بنانا شروع کردیا۔ یقین لیے سبز رنگ... مان سے سجا نارنجی رنگ' حفاظت کرتا نیلا' بنفشی رنگ... روشنی کا سا تانے کا چمکتا رنگ... رنگ برنگا ریشم اوپر تلے لپٹتا رہا' ان رنگوں میں سب سے گہرا رنگ اس کی محبت کا تھا۔ سرخ دہکتا رنگ۔

ان رنگوں میں ایک اور رنگ سب سے نمایاں تھا سفید رنگ...

اس کے مقدس وجود کی پاکیزگی کا رنگ۔ شفاف' کھرا' بے داغ...!

ان ہی دو لوازمات کے ساتھ میں اپنے گھر کو سینچتی رہی' ایک ایک تانا بنتے ہوئے اس کی چاہت کی روشنی بھرتی رہی' ہر ٹانکے پر' خم پر مضبوطی سے گرہ لگاتی رہی۔ یقین کی گرہ... جسے کوئی بدگمانی کبھی نہ کھول سکے!

جسے کوئی شک میں ڈوبی تلوار کبھی نہ کاٹ سکے!

جسے زہر میں بجھا کوئی تیر کبھی نہ توڑ سکے!

میں ریشم بنتی رہی۔ ہر خانے میں اپنے خواب ٹانکتی

رہی۔ میں نے بڑی محنت کی اور شاید محبت کرنے والا ہر دل اتنی ہی لگن سے اپنی دنیا سنوارتا ہے۔

"کیا دنیا میں اس سے بڑھ کے بھی کوئی حسین گھر ہوگا؟" دل نے شدومد سے نفی کردی۔

عشق کا مسکن

محبت کا گھر

چاہت کا در

"کیا نام رکھوں اس کا؟" میں الجھ پڑی۔

اتنی کاملیت... جیسے دھنک کے تمام رنگوں نے اس کی چھت پر بسیرا کرلیا ہو۔

ریشم بہت نرم و ملائم دھاگہ ہوتا ہے یہ اس کی خوبی ہے' لیکن اگر یہ الجھ جائے تو سلجھتا نہیں' اسے توڑنا ہی پڑتا ہے۔ اور اگر ریشم کا ایک سرا ادھڑ جائے تو؟

تو پھر سب ادھڑتا ہی چلا جاتا ہے' ریشم کی یہ خوبی کہ وہ ملائم ہے' وہی اس کی تباہی بن جاتی ہے۔

میں نے گھر کی دہلیز سے بچے ریشم کے آخری سرے کو اس کے محفوظ و مامون ہاتھوں میں تھمادیا' وہ ہی تو محافظ تھا' میرا اور اس گھر کا... اسے ڈور تھما کے مطمئن ہوگئی اور اس گھر میں اس کی ہمراہی میں رہنے کے خواب جاگتی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

پھر...؟ پھر کیا ہوا بھلا...؟

طوفان سا اٹھا تھا... ہر شے تہس نہس کرکے محبت کو حادثہ بنا کر انسان کو ہڑپ کر جانے والی آندھی چلی تھی۔ شک کے جھکڑ سے چلے تھے جو ہر شے کو ملیامیٹ کرکے تھے۔"

صفحہ پھر سے ختم ہوگیا مگر جانے کیوں اس میں ہمت نہیں ہورہی تھی کہ وہ صفحہ پلٹ لے۔ اس نے لاپروائی سے ہاتھ بڑھایا اور میز پر پڑی سگریٹ کی ڈبیہ اٹھا کر سگریٹ سلگائی اور اپنے ہی ہاتھوں میں ہونے والی لرزش سے حیران سا رہ گیا۔

اپنی صفائی دیتی زہرہ کی اس کوشش کو وہ سمجھتا تھا' مگر پھر بھی اس کا لفظ لفظ پڑھتے ہوئے وہ خود کو کسی رعشہ زدہ مریض کی طرح کپکپاتا ہوا محسوس کررہا تھا۔

اس نے سگریٹ دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کی اور گہرا کش لے کر خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لمبے لمبے کش لے کر اس نے ادھ جلی سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی اور صفحہ پلٹا۔

"شک کی تیز دھار تلوار اگر محبت کی گردن پر رکھ دی جائے تو اس کی شہ رگ کٹنے لگتی ہے' محبت سسکنے لگتی ہے... مرنے لگتی ہے... اس نے کہا۔

"پہلے کتنوں کو محبت کے جھانسے دے چکی ہو؟" وہ بولا نہیں تھا اس نے کوڑا اٹھا لیا تھا جو وہ میرے وجود پر برسانے کے لیے تیار تھا۔

"تم اپنے مکر و فریب کو محبت کہتی ہو؟" اس نے کوڑا ہوا میں لہرایا۔

"تم جیسی لڑکی تو پارسائی جیسے لفظ سے واقف ہی نہیں' پاک بازی کے مفہوم سے آشنا ہی نہیں۔"

"مقابل زیادہ مال دار آسامی تھی' میل ملاپ تو ان سے ہوتا ہے نا۔" کوڑے برساتا ہاتھ مسلسل حرکت میں تھا اور الزام لگاتی زبان بھی۔

"کاش تم میری محبت کو پاک رہنے دیتیں' اسے بازاری شے نہ بناتیں۔"

اس کے چابک کے وار سے میں ادھ موئی ہوکر گرپڑی۔ کیا کوئی محسوس کرسکتا ہے کہ کوڑے مارے جانے پر بدن سے کھال کیسے ادھڑی ہوگی؟

وہ کیسی آگ ہوگی جس نے کوڑے کھانے والے کے اندر درد کا سمندر انڈیل دیا ہوگا؟

کیا کوئی تصور کرسکتا ہے؟ شاید نہیں

لیکن میں نے محسوس کیا کہ کیسے لفظوں کے کوڑے انسان کو ادھیڑ ڈالتے ہیں' درد کی انتہا پر لے جاتے ہیں۔

محبت کا سفر میرے ساتھ شروع کرنے والے نے اپنے قدم واپسی کے لیے موڑ لیے۔ میں نے اسے بہت روکنا چاہا مگر حلق میں دم توڑتی آواز معدوم ہوگئی۔ وہ پلٹ گیا۔

وہ بھول گیا کہ میرے ریشم سے بنے گھر کی دہلیز کا آخری سرا اس کے ہاتھوں میں ہے' اس کے قدم بڑھاتے ہی گھر بکھرنا شروع ہوگیا' ریشم کا سرا کھنچتے ہی

میری رنگ برنگی دنیا ادھڑنی شروع ہو گئی۔ ایک کے بعد ایک.....

سرخ، نارنجی، سبز، نیلا، بنفشی، سنہری، آن کی آن میں تانا بانا کھلتا چلا گیا۔ درزوں میں ٹکے خواب زمین بوس ہونے لگے۔ ستاروں کی روشنی منڈیروں سے اٹنی شروع ہو گئی وہ اپنے ساتھ وہ اجلا سفید رنگ بھی لے گیا جو اس کے وجود کی بدولت تھا۔

پل میں محبت کا مسکن راکھ کا ڈھیر ہوا تھا۔ سارے رنگ غائب ہو گئے۔ صرف سیاہ رنگ بچا تھا۔ سیاہ رنگ؟ ہاں... شاید یہ نحوست کا رنگ تھا، گھنگھور سیاہ ماتمی رنگ! میں محبت کی اس منہدم عمارت پر بیٹھی ماتم کناں تھی جس کے ملبے کے ڈھیر تلے میرے خواب دفن تھے۔

ہاں مگر میں اب بھی اس شخص کے لیے دعا گو رہتی ہوں کہ سچائی کبھی اس پر آشکار نہ ہو، ورنہ وہ آسمان کی وسعتوں میں پھیلا بلندیوں کو چھوتا شخص شرمندگی کی اس کھائی میں جا گرے گا، جہاں سر اٹھا کر جینے کی ہمت خواب بن کر رہ جاتی ہے۔

میں معاف کرتی ہوں اسے اس خطا کے لیے جو انجانے میں ہوئی۔ وہ بے خبر تھا۔

میں دعا کرتی ہوں کہ اس شخص کا پندار ہمیشہ سلامت رہے، ہاں! وہ بے خبر ہی رہے۔"

لفظ ختم ہو گئے تھے مگر کوئی چیز تھی جو اس کے اندر رینگ رہی تھی۔ کوئی اس کے سینے میں دھڑکتا دل مسلنے لگا۔

اس نے سارے صفحے کارپٹ پر پھینک دیے اور اپنا سینہ مسلتا ہوا پنکھا فل کھول کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس کے دل سے ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔

"کس چیز سے بے خبر رہوں میں .... کس بات سے.... اب اس نے کون سی کہانی گھڑلی ہے۔" فضول لیٹے لیٹے اسے پھر سے اختلاج ہونے لگا۔ وہ اٹھا اور الجھتا ہوا باہر نکل آیا۔ شام ڈھل رہی تھی، سڑک کے اطراف میں لگے سرو اور سفیدے کے درخت ہوا چلنے سے جھوم رہے تھے۔ گرمی اتنی نہ تھی۔

اپنی زندگی میں دیگر نوجوانوں کی طرح اس کا کوئی افیئر نہیں چلا تھا۔ نہ تو اس نے کبھی کسی کے ساتھ فلرٹ کرنے کی کوشش کی تھی حتیٰ کہ لندن کے نامور ادارے میں بھی وہ اپنی اس فطرت کو بدل نہ سکا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ عورت کے نام سے بھی کوسوں دور بھاگتا ہو، مسئلہ تو بس ملاوٹ کا تھا۔

زہرہ اسے اپنے شفاف پن کی بدولت ہی پسند تھی مگر جب سے اتنے بڑے دھوکے کا پردہ چاک ہوا، اسے اس لڑکی کے نام سے نفرت ہو گئی تھی۔

زہرہ نے اس کی زیادتی کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، اسے موردالزام ٹھہرا کے بددعائیں نہیں دی تھیں۔ اس نے بس اپنی محبت اس پر عیاں کردی تھی۔

"اگر شیراز زہرہ میں دلچسپی لے بھی رہا تھا تو زہرہ کو اپنایا کیوں نہیں؟ منگنی کسی اور سے کیوں.....؟"

اسے شیراز سے اس کے متعلق بات کرنی ہی ہو گی۔ چند لمحے بس سوچتے رہنے کے بعد وہ تیزی سے اٹھا اور سیاہ پڑتی رات میں گھر کی جانب بڑھا۔ پورچ میں کھڑی گاڑی کے اگنیشن میں چابی گھما کر گاڑی باہر نکالی اور پوری رفتار سے دوڑاتا ہوا "ربانی ہاؤس" کے باہر رکا۔

بہت عرصے بعد اس نے ادھر کا رخ کیا تھا۔ چوکیدار نے اسے پہچان کر فوراً گیٹ کھولا۔ مگر وہ گاڑی وہیں لاک کر کے خود اندر بڑھ گیا۔

لان میں بائیں جانب رکھی کرسیوں کی طرف سے آتی نسوانی آواز نے اس کی توجہ کھینچ لی تھی۔

"اب بھی تمہاری صورت نہ دکھتی تو یقین کرو تم نے میرے ہاتھوں ضائع ہو جانا تھا۔" وہ جو بھی تھی بہت بے تکلفی سے خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔

"ہاہاہا.....میں جانتا تھا میں جب بھی پاکستان آیا، تم دوڑی دوڑی میرے پیچھے ہی چلی آؤ گی۔" شیراز کی آواز سن کر اس کے اندر آگ سی لگنے لگی۔

"ہونہہ..... جیسی تمہاری حرکتیں ہیں نا، میں کبھی تمہارے پیچھے خوار نہ ہوتی، مگر بس.....دماغ خراب ہے میرا۔"

"اوہ سویٹی.....میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ وہ محض ایک ڈرامہ تھا۔ یو نو اریبہ! اگر مجھے ضد ہو جائے تو میں کسی کے باپ کی بھی نہیں سنتا، کجا کہ وہ دو ٹکے کی لڑکی مجھے نخرے دکھا رہی تھی۔ یہ مڈل کلاس مینٹالیٹی میری سمجھ سے باہر ہے، بھول پن، پاکبازی کے ناٹک رچا کے امیر لڑکوں کو اپنے جال میں پھانستی ہیں جیسے ابتہاج جیسے کم عقل کو ٹریپ کر لیا اس نے۔" شیراز کے لہجے میں نفرت ہی نفرت تھی۔ ابتہاج بری طرح چونکا۔

"ابتہاج.....اوہ ہاں تمہارا وہی کزن ناں جس کی قابلیت اور ذہانت سے تم چڑتے ہو۔" اس نے چھیڑا۔

"اس میں ایسا کچھ ہے ہی نہیں تو میں کیوں مانوں؟ گھمنڈی کہیں کا، اور پاپا کو بھی بس اس کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ آخر ان کا اپنا بیٹا بھی ہے۔ لندن کا ڈگری ہولڈر ہے، پھر بھی اسی لڑکے کو سراہیں گے جیسے میں ان کی سوتیلی اولاد ہوں۔" وہ بھرا بیٹھا تھا۔ اور ابتہاج اس کے لفظ لفظ پر جمتا جا رہا تھا۔

"مگر خیر.....اب سب سیٹ ہو چکا ہے اب تو پاپا کے لیے ابتہاج سے زیادہ غیر ذمہ دار انسان ہی کوئی نہیں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"وہ کیسے؟" اریبہ کو بے وجہ ہی دلچسپی ہوئے جا رہی تھی۔

"اس نے پراجیکٹ چھوڑ دیا ناں، وہ بھی عین وقت پر جب سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا۔"

"اتنا بڑا پراجیکٹ اس نے چھوڑ کیسے دیا؟ بے وقوفی کی اس نے....."

"اسی لڑکی کی خاطر... بے وفا نکلی تو بے چارہ ہر چیز چھوڑ کر مجنوں بن کے صحرا میں نکل گیا۔" وہ پھر خباثت سے ہنسنے لگا۔

"مجھے یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ اتنا ذہین آدمی تمہارے ہاتھوں بے وقوف کیسے بن گیا آخر۔ تم میں تو اتنے گٹس ہیں نہیں!" وہ بولی۔

"کم آن سویٹ ہارٹ! تم مجھے انڈر اسٹیمیٹ کر رہی ہو۔ یہ بہت آسان تھا، ابتہاج کو تو بس یہ ہی یقین دلانا تھا کہ جس کی محبت میں وہ ڈوب رہا ہے، وہ دھوکے باز ہے۔ اس کے ساتھ خیانت کر رہی ہے، میں نے تو بس ایسے حالات پیدا کر دیے جن میں اسے لگا کہ وہ لڑکی مجھ میں انٹرسٹڈ ہے، اور میرے سیل پر اس نے جو پیغام پڑھا اس نے سارا معاملہ ہی سیٹ کر دیا، اسی لیے تو میں ٹیکنالوجی کی اتنی قدر کرتا ہوں۔ بیٹھے بٹھائے مقصد بھی پورا ہو گیا۔"

"بہت ہی کمینے ہو تم شیراز... اتنی چالبازی کی کیا ضرورت تھی، بددعائیں ہی دیتی ہو گی وہ تمہیں۔" اریبہ کو خوف سا محسوس ہوا۔

"یہ میرے لیے کمپلیمنٹ ہے محترمہ! اور جہاں تک رہی بات چالبازی کی تو اگر ان کی محبت اتنی مضبوط ہوتی تو میں کیا کوئی بھی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا تھا، سو اس میں میرا قصور نہیں ہے۔" شیراز کے کہنے پر ابتہاج زمین میں دھنسنے لگا۔

"وہ لڑکی تو تمہارے التفات پر لٹو ہو گئی ہو گی۔" اریبہ ہنستے ہوئے بولی۔ جواب میں شیراز نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"نہیں یار! کوشش تو بہت کی مگر وہ بہت ٹیڑھی کھیر تھی، ہاتھ نہیں آئی خیر... مجھے اس میں دلچسپی تھی بھی نہیں جو مقصد تھا، وہ پورا ہو گیا۔ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔" وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

ابتہاج کو لگا کسی نے پگھلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا ہے۔

"بہت مکار ہو تم شیراز! میں انکل کو بتاؤں گی دیکھنا تم۔"

"اے لڑکی! یہ غضب نہ کرنا، مجھے دولہا بننے سے پہلے موت سے ہمکنار نہیں ہونا، اب چھوڑو ان باتوں کو اور کل شام چل کر میرے ساتھ وہ منگنی کا ڈریس بھی فائنل کر دو یار!"

بعض انکشافات انسان کو ایسے ہی جامد کر دیتے ہیں، بنا ریڑھ کی ہڈی کا بنا دیتے ہیں، رینگنے والا، کمزور کیڑا

جیسے..... وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شیراز اس حد تک اس کے خلاف کدورت پالے بیٹھا ہے اور حسد کی آگ میں دوسروں کی زندگیاں بے دردی سے جلا سکتا ہے۔

اس کا جی چاہا آگے بڑھ کر اس کا منہ نوچ لے۔ چند لمحے بعد وہ تیز تیز چلتا ہوا اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

ابتاج کو سامنے دیکھ کر وہ چونکے پھر بوکھلا گئے۔

سختی سے بھینچی ہوئی مٹھی کھول کر اس نے پوری قوت سے ایک زناٹے دار تھپڑ اسے دے مارا۔ اُلٹے ہاتھ کا دوسرا تھپڑ اس کے چہرے پر انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا' اریبہ کے منہ سے چیخ بلند ہوئی۔

اچانک اس صورتحال پر شیراز پتھر کا ہو گیا تھا' ابتاج کے چہرے سے پڑھنا بہت آسان تھا کہ وہ سب سن چکا ہے۔

"اگر مجھے انکل کا خیال نہ ہوتا تو اس وقت میرے ہاتھ تمہارے ناپاک خون سے رنگ چکے ہوتے۔" سختی سے کہہ کر وہ مڑا۔ جاتے جاتے وہ پلٹا اور بولا۔

"زہرہ جیسی لڑکی کے کردار کو تم جیسا شیطان کبھی داغ دار نہیں کر سکتا..... آئندہ کبھی میرے سامنے بھی آئے تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔ یہ ذہن میں رکھنا!" شعلہ بار نگاہوں سے دیکھ کر وہ تیز تیز چلتا باہر نکل آیا۔

کچھ دیر پہلے آئے غصے کے طوفان نے پہلے دکھ کی صورت ڈھلنے کے بعد اب شرمندگی و تاسف کی شکل اختیار کر لی تھی۔ وہ گنہگار تھا اس لڑکی کا۔ وہ قصوروار تھا اس کے درد کے ایک ایک لمحے کا۔ وہ مجرم تھا زہرہ کے ریشم سے سجے گھر کو تار تار کرنے کا۔

"کیا وہ اب کبھی زہرہ کا سامنا کر پائے گا؟"

"نہیں۔ کبھی نہیں۔ شاید کبھی بھی نہیں۔"

زہرہ نے دعا کی تھی کہ اسے حقیقت سے بے خبر ہی رکھا جائے مگر اسے باخبر کر دیا گیا تھا۔ یہ ابتاج جیسے شخص کے لیے کڑی ترین سزا تھی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی شے چبھنے لگی' بڑی بڑی کشادہ آنکھوں میں نمی سی پھیل گئی۔



وہ تھکی ہاری اسکول سے لوٹی تھی۔ شدید گرمی اور دھوپ میں چل کر آنے کے سبب اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ بیرونی دروازے سے داخل ہوتے ہی معمول کی طرح زور سے سلام کر کے وہ سیدھی کمرے میں چلی گئی اور بیگ تقریباً" پھینکتے ہوئے پنکھا چلا کے بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔ اسکول سے گھر تک کا فاصلہ تیس منٹ کی پیدل مسافت پر تھا اور تپتی گلیوں سے گزر کر گھر پہنچتے پہنچتے وہ ایسے ہی بے حال ہو جایا کرتی تھی۔

پردہ اٹھا کر اماں اس کے کمرے میں داخل ہوئیں' ان کی چال میں معمول سے زیادہ تیزی اور چہرے پر دبے دبے جوش کی سرخی تھی۔ یہ زہرہ محسوس نہ کر سکی۔

"آج تو بہت تھکا دینے والا دن تھا۔" کروٹ لیے آنکھیں موندے ہی وہ بے زاری سے بولی۔

"ہاں! گرمی تو بہت ہے' چل کر ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدل لے زہرہ۔

تیرے نصیب جاگ اٹھے ہیں میری بچی۔" پاس بیٹھ کر وہ جذبات سے پُر لہجے میں بولیں تو ایک دم اس نے آنکھیں کھول کر حیرانی سے اماں کی صورت تکی۔

"کیوں، کیا ہوا ہے ایسا؟ کیا آج کھانے میں بریانی بنائی ہے؟" مسکراتے ہوئے اس نے نیم سنجیدہ انداز میں پوچھا۔

"بریانی بھی بنی ہے اور کوفتے بھی۔ تو جلدی سے اٹھ کر تیار ہو جا بس' رب نے میری سن لی' تیرے فرض سے سبکدوش ہونے کا وقت بھی آ گیا۔" اب کی بار کچھ غیر معمولی پن محسوس کر کے وہ اٹھ بیٹھی۔

"مطلب؟؟"

"تیرے لیے بہت اچھا رشتہ آیا ہے' میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی زہرہ کہ تیرے نصیب اس طرح چمک اٹھیں گے' آج تیرے بابا ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔" ان کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

"رشتہ... اماں آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں' میں نے آپ کو منع بھی کیا ہے کہ مجھے نہیں کرنی ابھی شادی۔"

"زہرہ! میں کیسے منع کردوں اب۔ وہ لوگ تو۔ بیٹھک میں آئے بیٹھے ہیں۔"

"کیا؟؟؟" وہ تقریباً حیرت سے چیخی۔

"ہاں! اتنے اچھے شریف لوگوں نے تجھے جتنی عاجزی اور محبت سے مانگا ہے' میں انکار نہیں کرسکتی۔"

"مگر اماں! آپ یوں اچانک کیسے۔" وہ ششدر سی غم سے نڈھال ہو رہی تھی۔

"بس زہرہ! بہت ہوگئی تمہاری من مانی۔ آگے میں ایک لفظ نہیں سنوں گی۔ اٹھ کر تیار ہو جاؤ۔ وہ لوگ رسم کرنے آئے ہیں۔"

قطعی لہجے میں کہہ کر وہ باہر نکل گئیں اور زہرہ حق دق سی بیٹھی رہ گئی۔ پہلے بھی اس کے لیے کچھ رشتے آئے تھے مگر زہرہ کے انکار کے آگے اماں نے بے بسی سے ہتھیار ڈال دیے تھے مگر آج کیا ہوا تھا انہیں۔ اتنی سخت تو وہ کبھی نہ ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ اتنی غیر متوقع صورت حال میں اس کا بوکھلا جانا فطری بات تھی۔ اس اچانک افتاد پر وہ حواس باختہ ہو رہی تھی اور اماں کے ڈٹ جانے پر حیران!

پلنگ سے اتر کر ساتھ والی میز پر رکھا دوپٹہ جھک کر اٹھانے لگی' جب کوئی کمرے میں داخل ہوا۔ زہرہ کی پشت اس کی طرف تھی وہ دوپٹے سے آنکھیں پونچھنے کے ساتھ ساتھ وہ جھکی پلنگ کے نیچے چپل پہن رہی تھی۔

"زہرہ۔" اس کی آنکھ سے ٹوٹ کر گرتا آنسو یکدم ساکت ہو گیا' وہ اپنی جگہ جم سی گئی۔ سانس روکے وہ اس آواز کو دل و دماغ میں گونجتا محسوس کرنے لگی' جسے اس نے تصور میں ہزار بار اپنی یادداشت میں کھنگالا تھا' جو اس کے لیے حیات بخش ہوا کرتی تھی۔

وہ ایک ساکن بے جان شے کی طرح کھڑی تھی جس پر کسی طلسم کے زور سے زندگی رک گئی ہو۔ وہ اس کا خیال تھا۔ وہم تھا یا کچھ اور۔

ابتہاج چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے قریب چلا گیا۔ اس سے محض دو قدم کے فاصلے پر رک کر وہ ان تمام لفظوں کو یکجا کرنے لگا جو اسے اپنی صفائی میں کہنے تھے۔ وہ اپنی تمام ہمتوں کو سمیٹنے لگا جو اسے بولنے کے لیے درکار تھیں۔ کمرے میں موجود دو نفوس گہری خاموشی کی لپیٹ میں تھے۔

"آپ نے دعا کی تھی نا زہرہ! کہ مجھ پر سچائی کبھی آشکار نہ ہو۔ میں... میں ہمیشہ بے خبر ہی رہوں۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بول رہا تھا۔ کچھ لمحوں کا توقف کرنے کے بعد وہ پھر گویا ہوا۔

"آپ کی دعا قبول نہیں ہوئی۔ میں سچائی جان گیا ہوں۔"

زہرہ کی آہستہ آہستہ چلتی سانس بھی کچھ دیر کے لیے بالکل تھم گئی۔

"بہت تلخ، بہت کڑی حقیقت مجھ پر کھول دی گئی ہے۔" آج اسے خاموش نہیں رہنا تھا۔

"آپ نے صحیح کہا تھا۔ شرمندگی کی کھائی میں گر کر کوئی بھی سر اٹھا کر جینے کے قابل نہیں رہتا۔ ندامت کا طوق کسی خوددار آدمی کو کس طرح جکڑ سکتا ہے' زیاں کا احساس کس طرح پل پل روح کو ڈستا ہے۔ مجھے دیکھ کر آپ بخوبی اندازہ لگا سکتی ہیں۔"

ابتہاج کا لفظ لفظ زہرہ کو جیسے کسی خواب سے جگانے لگا' سہم کر رک جانے والے آنسو پھر سے رواں ہو گئے۔

"شیراز نے کیا کیا' میں اسے موردِ الزام نہیں ٹھہراؤں گا' آپ کا قصوروار تو میں ہوں' میں نے آپ کی محبت پر سوال اٹھایا۔ ایک سچے رشتے کو شک کے عدسے سے دیکھ کر حقیر کر دیا' بے مول کر دیا۔" اس کی آواز میں ٹوٹے کانچ کا سا درد در آیا۔

زہرہ سختی سے لب بھینچے اس آواز کو اپنی سماعتوں میں اترتا محسوس کر رہی تھی۔

"میں آپ کا گنہگار ہوں زہرہ۔ آپ مجھے سزا دے لیں' مجھے برا بھلا کہہ لیں مگر بولیں پلیز۔ کچھ تو بولیں۔ یوں خاموش رہ کر مجھے اذیت و شرمندگی کی اس دلدل

میں اور مت دھکیلیں۔"

ابتہاج نے آہستگی سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیے۔ اس نے سختی سے آنکھیں بھینچ لیں' اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ ستواں ناک سرخ ہو رہی تھی' وہ اس لمحے اتنی کمزور اور پریشان حال لگ رہی تھی کہ ابتہاج کا بے اختیار جی چاہا وہ اسے اپنے سینے میں چھپا لے۔

"آپ بہت ظرف والی لڑکی ہیں زہرہ۔ کیا مجھے معاف نہ کریں گی؟ مجھے ایک موقع دیں' اس ریشم کے گھر کو پھر سے بنانے میں' میں آپ کا ساتھ دوں گا.... اس کی حفاظت کروں گا۔"

ابتہاج کو اس کے یوں رونے سے شدید اذیت ہو رہی تھی۔

زہرہ آنسو ہاتھ کی پشت سے پونچھتے ہوئے بہت دھیرے سے بولی۔

"میں تو... آپ کو کب کا معاف کر چکی ہوں۔"

ہچکیوں کے بیچ یہ چھوٹا سا جملہ وہ بمشکل ادا کر پائی تھی۔

ابتہاج چپ چاپ اسے دیکھے گیا' کتنا وسیع دل تھا اس کا' شاید محبت کرنے والوں کا دل اتنا ہی وسیع ہوتا ہے۔ نظروں کے حصار میں لیے وہ اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھے گیا جو اپنے بلند ظرف کی بدولت بہت بلند دکھائی دے رہی تھی۔

"تو پھر پاپا سے کہہ کر منگنی کے بجائے نکاح کروا لوں؟" زہرہ کے ایک جملے سے اس کے دل کا بوجھ یکدم سرکا تو وہ شرارت سے بولا۔

"جی...؟" بھیگی آنکھیں اوپر اٹھائے وہ اس کی بات سمجھی نہیں تھی۔

"جی..." اسی کے انداز میں کہہ کر اس تمام عرصے میں وہ پہلی بار مسکرایا۔

زہرہ نے دیکھا ان گہری بھنورا سی آنکھوں میں پھر سے قوس و قزح کے رنگ کھلنے لگے تھے۔ وہ یک ٹک دیکھنے لگی۔

ابتہاج جی بھر کے خوش ہوا... اس نے چاہا کہ ان بے اختیار نگاہوں کو خود پر سے ہٹنے دے۔ ایک بار پھر وہ اس کا بے خود ہو جانا نوٹ کر رہا تھا۔

وہ دھیرے سے کھنکھارا تو ہوش کی دنیا میں لوٹ کر وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ ابتہاج کو اس پر ٹوٹ کے پیار آیا۔

"ڈرائنگ روم میں بیٹھے کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں' اب دیر نہ کریں زہرہ! چلیں... میرا ہاتھ تھام کر اس رستے پر قدم رکھ دیں' جو ہماری منزل کی طرف جاتا ہے۔" جذب سے کہہ کر ابتہاج نے ہاتھ پھیلایا اور زہرہ نے اپنا لرزتا کپکپاتا ہاتھ اس کی مضبوط ہتھیلی پر رکھ دیا۔

ابتہاج نے اس کا ہاتھ تھام کر دائیں ہاتھ سے اپنی جیب سے چاندی کا وہ چھلا نکالا' جسے وہ سینت سینت کر رکھتا آیا تھا' اور آہستگی سے زہرہ کی انگلی میں پہنا دیا۔ زہرہ نے دیکھا تو اس نے شرمسار سا ہو کر سر جھکا لیا۔

"یہ... آپ کا چھلا میں نے چوری کر لیا تھا۔" سر جھکا کر اس نے اعتراف کیا تو زہرہ جذبات سے پُر ہنسی ہنس دی۔ "میں جانتی ہوں۔" ابتہاج نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ نظریں ملیں اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

محبت کی ہر داستان میں وصل نہیں ہوتا' محبت کی ہر کتھا شک کی دودھاری تلوار سے بچ نہیں پاتی۔ مگر ابتہاج اور زہرہ "حاصل" کر لینے کے نشاط انگیز سرور سے آشنا ہو رہے تھے۔ وہ پا لینے کے احساس سے مسرور تھے۔

خوش رنگ محبت فضا میں چکراتی پھر رہی تھی اور محبوب اور محب ایک بے حد مقدس بندھن میں بندھ کر آسمان کی بے کراں وسعتوں میں پرواز کرنے کو تیار تھے۔



اسیہ ماہا مسکان

فیصلہ

"یہ وقت ہے کوئی اٹھنے کا۔" اسے صبح دس بجے کے قریب آنکھیں ملتے اٹھتے دیکھ کر خالہ بی نے سختی سے ٹوکا، لیکن وہ بجائے اثر لینے کے دانت نکالنے لگی۔

"ابھی بھی کہاں اٹھنے والی تھی خالہ بی! اگر آپ نے اپنی پالتو بلی کو مجھے اٹھانے کے لیے نہ بھیج دیا ہوتا۔"

اس نے دانت نکالتے ہوئے خالہ بی کی لے پالک بیٹی مانو کا نام لیا۔ خالہ بی کے ماتھے پر پالتو بلی کے نام پر حسب معمول تیوری چڑھی اور انہوں نے گھور کر اسے دیکھا۔

"دیکھو سعدیہ! میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے۔ اسے پالتو بلی مت کہا کرو۔ میں نے اسے گود لیا ہے تو اس کا مطلب نہیں ہے کہ تم بار بار اسے پالتو کہہ کر احساس دلاؤ۔ بیٹی تو تم بھی میری نہیں ہو، پالا تو میں نے تمہیں بھی ہے بچپن سے، اس نے تو تمہیں کبھی اس حوالے سے کوئی نام دینے کی کوشش نہیں کی تم کیوں اس معصوم کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔"

خالہ بی نے صبح صبح اس کو لتاڑ کر اچھا خاصا کرارا ناشتہ کرا دیا تھا۔ اب اسے مزید کسی ناشتے کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ ڈھیٹ بنی دانت نکالتی رہی اور پھر جمائی روک کر بولی۔

"اچھا خالہ بی! آج صبح اٹھتے ہی بہت عزت افزائی کردی آپ نے اور آپ کی باتوں سے بجائے میرا پیٹ بھرنے کے اور خالی ہو گیا ہے۔ اب پلیز مانو سے کہہ کر ناشتہ منگوادیں۔"

اس کی ڈھٹائی دیکھ کر خالہ بی کو پتنگے لگ گئے۔

"ہاتھ پیر ٹوٹے نہیں ہیں تیرے۔ خود جا کر ناشتہ بنا لے۔ دیکھ نہیں رہی مانو کام کر رہی ہے۔ اس بے چاری نے صبح ہی اٹھ کر ناشتہ بنایا، پھر کچن کی صفائی کی۔ اب گھر کی صفائی کر رہی ہے، مشین بھی لگائی ہوئی ہے۔ اور تو مہارانی صبح دس بجے سو کر اٹھ رہی ہے اور اب اپنے لیے ناشتہ بھی نہیں بنا سکتی۔"

خالہ بی آج سخت غصے میں تھیں، اس لیے سعدیہ کو باتوں پر باتیں سنائے جا رہی تھیں، حالانکہ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ صبح لیٹ اٹھنا اور پھر مانو یا خالہ کا اسے ناشتہ بنا کر دینا اس لیے آج بھی سعدیہ یہی توقع کر رہی تھی لیکن آج خالہ بی کی بے وجہ کی باتیں اسے حیران کر رہی تھیں۔

"افوہ خالہ بی! اب بس بھی کریں۔ ایک تو ابھی ابھی سعدی آپی اپنی اتنی پیاری نیند لے کر اٹھی ہیں، اوپر سے آپ خالی پیٹ انہیں باتیں سنائے جا رہی ہیں۔"

مانو نے ناشتہ سعدیہ کے آگے رکھتے ہوئے خالہ بی سے کہا تو سعدیہ کی باچھیں ایک بار پھر پھیلنے لگیں، جو خالہ بی کی باتوں سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئی تھیں۔

اس نے مسکراتے ہوئے پہلا نوالہ لینا چاہا کہ خالہ بی کی اگلی بات نے اس کا ہاتھ روک دیا۔ "اگر یہی لچھن رہے تو جس گھر میں جائے گی، خالہ بی کو جوتیاں ہی پڑوائے گی۔"

ویسے تو یہ ان کا ہر روز کا جملہ تھا لیکن آج ان کے لہجے میں کچھ ایسا تو تھا جس نے سعدیہ کو اثر لینے پر مجبور کر دیا۔ وہ ناشتہ ادھورا چھوڑ کر اٹھ گئی، مانو اسے پکارتی ہی رہ گئی۔

خالہ بی نے مانو کا رشتہ طے کر دیا۔ لڑکا بینک میں کیشیر تھا۔ سعدیہ کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ خالہ بی اس سے پہلے مانو کے لیے سوچیں گی، مانو سعدیہ سے تین سال چھوٹی تھی۔

یوں تو خالہ کی دونوں بیٹیاں ہی لے پالک تھیں لیکن خالہ بی مانو سے زیادہ سعدیہ پر فریفتہ تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مانو سے پہلے سعدیہ نے ان کی سونی گود کو آباد کیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی سعدیہ ان کی بیوہ بہن کی بیٹی تھی، وہ سعدیہ سے اپنی جان سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔

خالہ بی کی قسمت بھی عجیب تھی۔ پینتیس سال کی عمر تک بھی ان کی شادی نہیں ہوئی تھی اور جب اس سے اگلے سال ان کی شادی ہوئی تو اولاد کی نعمت سے محرومی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ انہوں نے چپ چاپ صبر اور چپ کی بکل اوڑھی اور دوسروں کی خوشیوں میں اپنی خوشیاں ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگیں۔

بہن سے ان کا دکھ دیکھا نہ گیا۔ یوں بھی بیوگی کے بعد چار بیٹیوں کی ذمہ داری ان کے سر پر آپڑی تھی۔ انہوں نے سعدیہ کو بہن کی جھولی میں ڈال دیا اور یہ حسن اتفاق تھا کہ سعدیہ کی کلکاریاں اس گھر میں گونجیں تو قدرت نے گھر میں ایک اور پھول کھلا دیا۔

مانو ان کی بچپن کی دوست کی بیٹی تھی۔ ایک حادثہ میں ان کی دوست اور اس کا شوہر دنیا سے رخصت ہوئے تو کوئی بھی اس لاوارث بچی کی ذمہ داری لینے کو تیار نہ تھا۔ خالہ بی نے مانو کی ذمہ داری بخوشی قبول کر لی۔ اب شوہر کی وفات کے بعد مانو اور سعدیہ ہی ان کے جینے کا سہارا اور ان کی کل کائنات تھیں۔

یوں تو سعدیہ مانو سے بڑی تھی لیکن عقل اور ہنر کے لحاظ سے مانو اس سے کہیں آگے تھی۔

سعدیہ کچھ اپنے بڑے ہونے کی وجہ سے اور کچھ خالہ بی کے لاڈ پیار کی وجہ سے مانو کو ہمیشہ اپنے رعب میں رکھتی تھی، جبکہ مانو سعدیہ کو بڑی بہن سمجھ کر مان اور عزت دیتی تھی۔

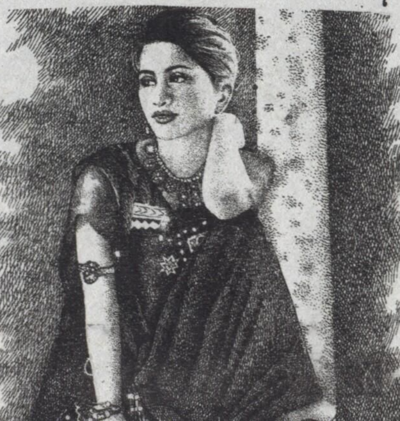
پھر بھی کبھی خالہ بی سعدیہ کے ساتھ حد درجہ التفات کی وجہ سے مانو کے ساتھ زیادتی ــــ کر جاتی تھیں سعدیہ کو ایک ہزار کا سوٹ لے کر دیا ہے تو، مانو کو پانچ سو کا۔ سعدیہ کا جوتا پانچ سو کا ہے، تو مانو کا اڑھائی سو کا۔

ایسے کئی چھوٹے چھوٹے معاملات میں خالہ بی انجانے میں مانو کے ساتھ اکثر زیادتی کر جاتی تھیں وہ محسوس کرتی تھی لیکن اثر نہیں لیتی تھی۔

جوں جوں وہ دونوں بڑی ہوتی جا رہی تھیں، دونوں کا فرق نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ مانو نہ صرف پڑھائی میں ذہین تھی بلکہ گھر کے کاموں میں بھی اس کا سلیقہ نظر آتا تھا۔ جبکہ خالہ کی طرف سے ڈھیل پا کر سعدیہ دن بدن کاہل ہوتی جا رہی تھی۔ سارا دن ٹی وی دیکھنا یا دوستوں سے گپ شپ ہی اس کا مشغلہ تھا۔

خالہ بی پہلے تو محسوس نہیں کرتی تھیں لیکن ان کے جوان ہوتے ہی جب ان کے رشتے کی بات چلنے لگی تو خالہ بی کو سعدیہ کے پھوہڑپن کا شدت سے احساس ہوا اور ساتھ ساتھ اپنی کوتاہیوں کا بھی۔ اب وہ سعدیہ کو روک ٹوک کرنے لگی تھیں لیکن عادتیں پختہ ہو جائیں تو اتنی جلد کہاں اثر ہوتا ہے۔ سعدیہ کے اطوار دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ سعدیہ کے بگاڑ کی ذمہ دار وہ خود ہیں۔ اس کے ساتھ حد درجہ التفات اور بے جا لاڈ نے سعدیہ کی شخصیت کو مسخ کر دیا تھا۔

اب انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ مانو کی شادی پہلے کر کے سعدیہ کو راہ راست پر لائیں گی اور جب سعدیہ نے ان سے ان کے فیصلہ کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے اپنے فیصلہ کی وجہ صاف صاف بتا دی اور سعدیہ محض سوچ کر ہی رہ گئی کہ اس کی زندگی کے بائیسویں سال میں جا کر خالہ بی نے اس کے لیے صحیح فیصلہ کیا ہے.....



فائزہ افتخار

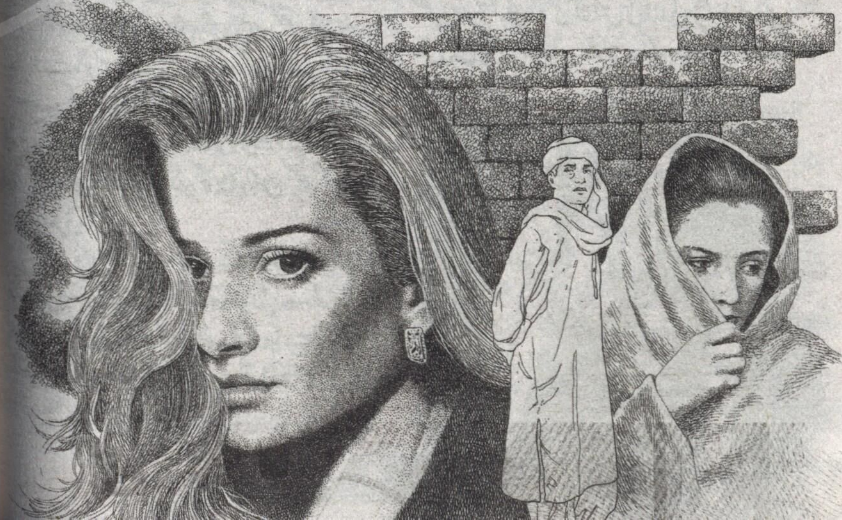
اک گئی سیدھ طلا

سیف اللہ کاروبار کے سلسلے میں اکثر بیرون ملک جاتے رہتے تھے۔ وہ نیپال کے دورے پر گئے تو واپسی پر میشا ان کے ساتھ تھی۔ وہ ان کے دوست کی بیٹی تھی۔ اس کے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تو سیف اللہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ سیف اللہ کی والدہ پر شکوہ خانم نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا مگر ان کی بیوی مہر نے اسے قبول نہ کیا۔ وہ ناراض ہو گئی اور دونوں بیٹیوں، زینی اور ایمی کو ساتھ لے کر میکے چلی گئی۔ سیف اللہ نے اپنی منگیتر کارا کو چھوڑ کر مہر سے پسند کی شادی کی تھی۔ وہ مہر کی جدائی میں راتوں کو جاگنے لگا۔ دو سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کے انتقال پر مہر واپس آگئی مگر وہ میشا کو اس گھر سے نکال نہیں سکی کیونکہ وہ مکان پر شکوہ خانم کے نام تھا۔ اور وہ میشا کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھیں۔ مہر نے میشا کی تعلیم چھڑا دی۔ کیونکہ کاروبار مہر کے نام تھا۔ وہ میشا پر پیسہ خرچ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پر شکوہ خانم میشا کو گھر ہی میں پڑھانے لگیں۔ انہیں میشا کے خوابوں سے ڈر لگتا تھا کیونکہ اس کے خواب پراسرار ہوتے تھے اور اکثر سچے بھی ہوتے تھے۔

علاقے میں میلہ لگا تو مہر، ایمی اور زینی جوش و خروش کے ساتھ وہاں جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ میشا بھی جانا چاہتی تھی۔ مگر مہر اور زینی نے اسے روک دیا۔

ناولٹ



یشانے تہیہ کرلیا کہ خواہ سب سے چھپ کر سہی، میلے میں ضرور جائے گی۔ یشانے پُرشکوہ خانم کی پرانی ساڑھی اور مہر کے کمرے کے پردے کاٹ کر ایک خوب صورت لباس تیار کیا اور چہرے پر بھونڈے انداز میں میک اپ تھوپ لیا تاکہ کوئی اسے دیکھے بھی تو پہچان نہ سکے۔ کانوں میں اس نے زینی کے بُندے پہن لیے۔

یشا میلے میں گئی تو اسے وہاں دیر ہوگئی۔ اسے مائر نامی ایک نوجوان ملا۔ یشانے اسے گھر تک ساتھ چلنے کا کہا، مگر اسے اپنا نام، پتا نہیں بتایا۔ وہ مائر کو اپنے ساتھ کشتی میں لے گئی۔ یشا کشتی سے اتری تو اس کا ایک بندا کشتی میں گر گیا۔ اس کے جانے کے بعد مائر نے وہ بُندا سنبھال کر رکھ لیا۔ یشانے اپنی بے ساختہ باتوں سے اسے متاثر کیا تھا۔

۳ — تیسری قسط

صبح کے دھند لکے میں وہ سفید لباس میں دھند کا ہی ایک حصہ لگ رہی تھی۔۔۔ اور اس کے اترے ہوئے چہرے پہ افسردگی کی چھاپ خاصی نمایاں تھی۔۔۔ ہاتھوں سے ۔۔۔ کھڑکی کے شیشے کو صاف کرتے ہوئے اس کی نظر سامنے سے وہیل چیئر گھسیٹ کے لاتی گرینی پہ گئی۔۔۔ تو افسردگی پہ خفگی غالب آگئی اور ہاتھ بہت تیزی سے شیشوں کی دھند اور نمی کو کھرچنے لگے۔۔۔ اس کی پھرتیاں دیکھ کے گرینی کے لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"ناراض ہو اپنی گرینی سے۔"

"آپ بھی تو ناراض ہوتی ہیں مجھ سے، جب آپ کو میری کوئی بات بری لگتی ہے۔"

"تمہیں میری کیا بات بری لگی؟ کیا یہ کہ میں نے تمہارے جھوٹ بولنے پہ تمہیں سزا نہیں دی۔۔۔ تمہارے چوری کرنے پہ تمہیں مارا نہیں؟ میں ایسا کرتی تو تم خوش ہوتیں؟"

ان کے پوچھنے پہ یشانے لاجواب ہو کر نظر ہی چرالی۔ جس پہ پرشکوہ خانم نے لوہا گرم دیکھ کے ایک نازک سی ضرب اور لگائی۔

"تمہیں خود احساس ہونا چاہیے یشا! کہ تم نے کتنی غلط حرکت کی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ مگر کی تو آپ کی وجہ سے ہے نا۔" وہ پھر سے ڈھٹائی پہ اتر آئی۔ "اگر آپ مجھے جانے کی پرمیشن دے دیتیں تو مجھے یہ سب نہ کرنا پڑتا۔"

"وہ تو میں تمہیں نہیں دے سکتی تھی۔"

"مگر کیوں؟"

"بس۔۔۔ میری مرضی۔" پرشکوہ خانم کا بھی جب جی چاہتا اس کے مقابلے پہ آ کے بچپنا دکھا لیتیں۔

"تو ٹھیک ہے۔۔۔ میں بھی ناراض ہی رہوں گی۔۔۔ میری مرضی۔" اس نے مزید منہ پھلا لیا۔ انہیں ہنسی تو بہت آئی۔ مگر دبا کے اس کے جذبات میں چٹکی سی کاٹنی چاہی۔

"تمہیں میری ذرا سی بھی پروا نہیں ہے یشا۔"

"آپ کو ہے؟" ۔۔۔ ترکی بہ ترکی جواب دینا تو جیسے اس کی سرشت میں تھا۔

"کیوں نہیں۔۔۔ تمہارے علاوہ اور کون ہے میری زندگی میں۔"

"بس رہنے دیں گرینی! زبانی زبانی پیار۔۔۔ ایک بھی بات نہیں مانتیں آپ میری۔۔۔ سب لوگ ہر جگہ آتے جاتے ہیں۔ جس کا جو دل چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ پھر آخر میں ہی کیوں؟"

وہ روہانسی ہوگئی۔ جھاگ سے بھرے ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ رکھ کے وہیں کھڑکی کے پاس ٹھس سی بیٹھ گئی۔

"وہ اس لیے میری جان! کہ تم میں اور دوسروں میں بہت فرق ہے۔"

"کیسا فرق۔"

"فرق یہ ہے کہ تم اپنی گرینی کو بہت پیاری ہو اور وہ تمہاری بہت پروا کرتی ہیں، جبکہ باقی لوگوں کی مجھے پروا نہیں ہے۔ میری بلا سے 'وہ جو جی چاہے کریں۔ ایک

دن تم خود سب سمجھ جاؤ گی کہ میں جو کرتی ہوں تمہارے بھلے کے لیے کرتی ہوں۔"



مائر مٹھی میں رکھے بُندے کو مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ کارا کی آواز پہ چونک کر اس نے مٹھی کو زور سے بند کیا اور اپنے ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ گھساتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیسے ہو مائر! رات کو اتنی دیر سے واپس کیوں آئے تھے۔۔۔ تم تو کہہ رہے تھے فون پہ۔۔۔ کہ بہت بور ہو رہے ہو۔"

"بورنگ تو واقعی بہت تھا وہ سب۔۔۔ اور میں اسی لیے جلدی نکل آیا تھا۔۔۔ مگر راستے میں دیر ہوگئی۔۔۔ بلکہ راستہ بھول گیا تھا میں۔"

"اوہ۔۔۔ کہیں کسی غلط جگہ تو نہیں جا نکلے؟"

کارا پریشان سی ہوگئی۔۔۔ اپنے ہوش میں پہلی بار تو آیا تھا مائر یہاں۔

"نہیں۔ غلط تو نہیں۔" وہ مبہم سا مسکرایا۔۔۔ مگر اس ابہام میں بھی بہت تفصیل تھی۔

"جو تھا کافی صحیح تھا۔ مجھے تو اچھا لگا اس راستے پہ بھٹکنا۔"

"عجیب باتیں کرتے ہو تم۔۔۔ لگتا ہے فیسٹول میں جا کے تم واقعی اتنے بور ہوگئے تھے کہ اس کے مقابلے میں تمہیں راستوں میں بھٹکنا زیادہ اچھا لگا۔ ویسے میں نے تو تمہیں اسی لیے وہاں بھیجا تھا کہ تم یہ جگہ اچھی طرح دیکھ لو۔ جہاں تم پیدا ہوئے، جہاں تم نے اپنی زندگی کے ابتدائی دن گزارے اور جو تمہارے والدین کا آبائی وطن ہے۔"

"میں آپ کی فیلنگز سمجھ سکتا ہوں مام۔ آپ نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارا ہے یہاں۔ مگر میں اپنے اندر زبردستی یہ لگاؤ پیدا نہیں کر سکتا۔ مجھے تو وہیں جانا ہے جہاں سے میں آیا ہوں اور جہاں کے فاسٹ لائف اسٹائل کا عادی ہوں۔"

"میں تمہیں یہاں رکنے کا نہیں کہہ رہی۔ مگر میں اتنا ضرور چاہوں گی کہ تم جاتے جاتے یہاں سے ایک نیا رشتہ ضرور ساتھ لے جاؤ۔" کارا نے معنی خیز انداز میں اس کے کالر کی گرد جھاڑتے ہوئے کہا۔

"نیا رشتہ؟"

"ہاں۔۔۔ میں تمہاری شادی یہاں کرانا چاہتی ہوں۔ اپنے ملنے جلنے والوں میں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے اگر تمہیں کوئی پسند ہے تو بتا سکتے ہو؟"

"پسند۔" مائر کے کانوں کے قریب یشا کی سرگوشی نے گدگداہٹ سی کی۔

"جادوگرنیاں کوئی اتنی حسین ہوتی ہیں؟"

اس کی مسکراہٹ دیکھ کے کارا نے اندازہ لگایا۔

"اوہ۔۔۔ تمہاری مسکراہٹ بتا رہی ہے کہ کوئی ہے جسے تم پسند کرتے ہو۔۔۔ کون ہے وہ۔"

"ہے ایک۔۔۔ جادوگرنی۔" مائر کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔

"جادوگرنی؟" وہ پہلے حیران ہوئی، پھر سر جھٹک کے مسکرا دی۔۔۔ کہ شاید بات کو ٹالنے کا یہ بھی کوئی طریقہ ہو مائر کے نزدیک۔۔۔

"تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے، اگر میں یہاں تمہارے لیے کوئی لڑکی دیکھوں تو؟"

"دیکھیں۔۔۔ ضرور دیکھیں۔۔۔ دیکھنے پہ اعتراض نہیں ہے۔۔۔ مگر میری مرضی کے بغیر آپ کوئی فیصلہ کریں گی تو ضرور ہوگا اعتراض۔"

"ہاں ہاں۔۔۔ سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق ہوگا ڈیر۔"



"تم بڑی لکی ہو مہر۔" سمارا نے بلیک ٹی کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔۔۔ واقعی؟" مہر ابھی اترانے کی تیاری کر رہی تھی کہ سمارا کے اگلے فقرے نے اس کے ماتھے پہ ان گنت شکنیں ڈال دیں۔

"ہاں۔۔۔ کیونکہ تمہارے پاس یشا ہے۔"

"کیا..... یہ میری خوش قسمتی نہیں' بد قسمتی ہے سمارا۔"

"تم سمجھ نہیں رہیں مہر۔ مجھے دیکھو..... تھک جاتی ہوں ملازمائیں بدل بدل کے..... کوئی ہڈ حرام..... تو کوئی چور اور تم..... تمہاری دو' دو بیٹیاں ہیں..... مگر ہل کے پانی تک نہیں پیتیں۔ یشا نے ہی سارا گھر سنبھالا ہوا ہے۔ کاش میری بھی کوئی سوتیلی بیٹی ہوتی۔" اس کے لہجے میں اتنی حسرت تھی کہ مہر کو شدید غصے کے باوجود ہنسی آگئی۔

"تم ابھی یشا سے واقف نہیں ہو۔ کوئی میڈ کیا اتنا تنگ کرے گی جتنا یہ لڑکی کرتی ہے۔"

"پھول کے ساتھ کانٹے تو ہوتے ہی ہیں دوست۔"

"ماما! کیا آپ جھیل کے دوسری طرف سے آنے والے لوگوں کو جانتی ہیں؟"

زینی نے کالج سے آتے ہی بڑی بے تابی سے ماں سے پوچھا تھا۔ اس کے چہرے کی تمتماہٹ بتا رہی تھی کہ اس کے پاس کوئی ہیجان خیز خبر ہے۔

"جھیل کے اس پار....." مہر نے کچھ سوچتے ہوئے ذہن پہ زور دیا۔

"تم کارا مینشن کی بات کر رہی ہو؟" سمارا نے مشکل آسان کی۔

"ہاں..... ہاں..... وہی۔" زینی نے زور و شور سے سر ہلایا۔

"تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی ان کے بارے میں جاننے کی۔" مہر کا موڈ پھر سے غارت ہو گیا۔

"ماما..... میں نے سنا ہے' وہ بہت امیر کبیر لوگ ہیں۔"

"کوئی ایسے ویسے..... بلکہ اب تو کارا کی دولت کا کوئی شمار ہی نہیں' شاہانہ زندگی گزار رہی ہے پیرس میں۔"

"ہوتا رہے' ہمیں کیا۔" مہر نے بڑی مشکل سے دل کی جلن پہ چھینٹے مار کر کہا۔

"پورے علاقے میں ان کے قصے پھیلے ہوئے ہیں۔ اسپیشلی ان کے بیٹے کے۔"

"ہاں مہر..... بڑا ہی ہینڈسم ہے کارا کا اکلوتا بیٹا۔" سمارا نے کہا۔ زہر لگی وہ اس وقت مہر کو.....

"سنا ہے وہ یہاں آئی ہی اس لیے ہے کہ اپنے لیے بہو تلاش کر سکے۔"

"بہو۔" اس بار زینی کے ساتھ ساتھ مہر بھی کچھ چونکی۔

"ہاں..... اور سوچو..... کروڑ پتی اکلوتے لڑکے کی بیوی ہونا کسی بھی لڑکی کے لیے کتنی خوش قسمتی کی بات ہے۔ تم تو بے وقوف ہو' مہر! جو کارا جیسی عورت سے رشتے داری ہونے کے باوجود اس سے نہیں ملتیں۔"

"کیا؟" زینی چلا اٹھی۔ "ہماری رشتے داری ہے ان سے۔"

وہ سوالیہ حیران نظروں سے ماں کو دیکھ رہی تھی جو سمارا کی بات ان سنی کرنے کی بھرپور کوشش میں مصروف تھی۔ مگر اب کر نہیں پا رہی تھی۔

"تمہاری جگہ میں ہوتی تو یہ موقع کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتی مہر۔"

"کیسا موقع۔"

"اپنی بیٹی کو کارا کی بہو بنانے کا سنہرا موقع۔"

مہر نے پرسوچ انداز میں زینی کو دیکھا۔ جس کے چہرے پہ سمارا کی بات نے کئی رنگ پھیلا دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس نے دودھیا جھاگ جیسا ریشمی لبادہ پہن رکھا تھا جو اس کے پیروں سے بھی نیچے آرہا تھا۔

تلوؤں کے نیچے مخملیں گھاس کی نمی محسوس ہو رہی تھی جو مزاج میں عجیب سی سرشاری پیدا کر رہی تھی۔ تاحد نظر ایک تراوٹ اتار دینے والا سبزہ تھا..... فضا میں گنگناہٹ بھری اٹکھیلیاں تھیں اور قدم جما جما کے چلتی تب ٹھٹک کے رک گئی جب دور بادلوں کے جھرمٹ میں سے ایک بادل ہوا کے دوش پہ سوار اس کی جانب بڑھتا محسوس ہوا..... ہوا کی گنگناہٹ اس کی رفتار سے بھنکار میں بدل گئی تھی۔ ذرا قریب آنے پہ یشا کا تعجب کم ہوا۔ کیونکہ وہ بادل کا کوئی گولہ نہیں' بلکہ ان ہی بادلوں کے رنگ کا ایک سفید گھوڑا تھا۔ جس پہ بیٹھا سفید چست لباس والا وہ اجنبی اسے سرپٹ دوڑاتا یشا کی جانب آرہا تھا۔ یشا کے لبوں پہ خیر مقدمی مسکراہٹ آئی اور اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ ہلا کے اسے اپنی جانب متوجہ کرتی۔ عقب سے کچھ اور نامانوس آہٹیں اس کی سماعتوں سے ٹکرا گئیں۔ اس نے پلٹ کے دیکھا۔

وہ بہت سے تھے۔

اور بہت وحشیانہ انداز میں بھاگتے اس طرف آرہے تھے۔ ان کے قدموں کی بے ہنگم رفتار نے دھول اڑا کے ایک غبار سا اٹھا رکھا تھا اور اس غبار میں وہ ہیولے سے نظر آرہے تھے..... یشا کی مسکراہٹ کی جگہ ایک ہراس نے لے لی اور اس نے مدد طلب انداز میں سامنے سے آتے گھڑ سوار اجنبی کو دیکھنا چاہا..... مگر اب وہاں سوائے بادل کی ٹکڑیوں کے اور کچھ نہ تھا۔ جو تتر بتر ہو کے لاوارث انداز میں گھوم رہی تھیں۔ یشا نے ریشمی لبادے کو مٹھیوں میں بھر کے اوپر اٹھایا اور ان ہیولوں کے مخالف سمت بھاگنے لگی۔

غبار بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ آگے بھاگتے بھاگتے وہ کئی بار مڑ کے پیچھے دیکھتی اور ہیولوں کے جم غفیر سے ڈر کے اپنی رفتار بڑھا دیتی..... کبھی اس کا ریشمی لبادہ کسی جھاڑی سے اٹک جاتا' جسے کھینچ کے وہ تار' تار کر ڈالتی' تو کبھی پیچھے مڑ کے دیکھنے کی وجہ سے اس کا سر سامنے کسی پیڑ کے تناور شاخ سے ٹکرا جاتا۔

نہ جانے وہ کتنا دوڑی تھی..... کتنے پہر بیتے تھے بھاگتے بھاگتے..... دن کا اجالا تاریکی میں اور آسمان کی نیلگوں ٹھنڈک سفاک اندھیرے میں ڈھل چکی تھی..... ہیولے اب اور بھی دہشت ناک لگ رہے تھے اور ان کے حلق سے گونجتے وہ اجنبی زبان کے منتر' جو سارے جنگل میں پھیلے ہوئے تھے۔

یشا کی سانس بری طرح پھول چکی تھی..... اس کا دل جیسے ہر رگ..... ہر شریان میں دھڑک رہا تھا..... پاؤں چل کے جو مجنون ہو رہے تھے۔ اچانک اپنے پیر کے نیچے کچھ لجلجا پن محسوس کر کے وہ لمحہ بھر کو ٹھٹکی۔

اس کا پاؤں کسی پھنیر ناگ پہ تھا۔

ایک چیخ مارتے ہوئے اس نے اپنا پاؤں اس پہ سے اٹھایا اور پھنیر نے اپنا پھن پھلاتے ہوئے بڑے غیض و غضب کے ساتھ اسے گھورا۔

☼ ☼ ☼

پرشکوہ خانم نے ضخیم کتاب ایک جانب رکھتے ہوئے چشمہ اتارا اور ابھی لیمپ بجھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مہر کو اندر داخل ہوتے دیکھ کے اچنبھے کے ساتھ وہیں رک گئیں..... مہر کے تاثرات کسی غیر معمولی تمہید کے آثار دے رہے تھے۔

"تم رات کے اس پہر کون سے نشتر چبھونے آئی ہو مجھے؟"

انہوں نے تیکھے لہجے میں پوچھا..... مگر دوسری جانب سے غیر متوقع اور حیرت انگیز طور پر ترشی کا مظاہرہ نہ ہوا..... بلکہ ایک تصنع میں بھیگی مسکراہٹ نے ان کے صبر کا امتحان لینا چاہا۔

آپ [illegible] میرے بارے میں کچھ اچھا سوچا ہی نہیں..... ہمیشہ بدگمان ہی رہتی ہیں۔ مگر مجھے پھر بھی آپ کا خیال ہے۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اس دن کارا والی بات پہ میں نے آپ کے ساتھ کچھ مس بی ہیو کر دیا تھا۔"

"تمہیں ایسے احساس کب سے ہونے لگے؟"

"مجھے آپ کو اس سے ملنے کے لیے منع نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

مہر نے ان کے طنز کو نظر انداز کرنے کا ریکارڈ قائم کرنا چاہا۔ مگر دوسری جانب سے بھی نظر اندازی کی ادا برقرار تھی۔

"تمہارے منع کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں اور اس سے ملنے پر ضرور جاؤں گی۔"

"آپ بڑی ہیں..... وہ آپ کی بھانجی ہے..... اسے چاہیے کہ وہ آپ سے ملنے آئے۔ آپ اس عمر اور معذوری کے ساتھ کیوں زحمت کریں گی۔ آپ اسے ڈنر پہ کیوں نہیں انوائیٹ کرتیں۔"

اس بار پر شکوہ خانم خود کو حیرت کے بے ساختہ اظہار سے روک نہ پائیں۔

"ڈنر پہ؟ کارا کو؟ یہاں؟"

"ہاں..... آخر وہ اتنے عرصے بعد لوٹی ہے، ہمیں اسے ویلکم ڈنر دینا چاہیے۔ میں نے سب پرانی باتیں بھلا دی ہیں۔"

ابھی اتنا کافی نہیں تھا کہ مہر نے انہیں حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا دیتے ہوئے مسکرا کے اپنی بات مکمل کی۔

"صرف اور صرف آپ کے لیے۔"

✵ ✵ ✵

میشا شاید اپنی ہی چیخ سے ڈر کے جاگی تھی..... مگر کمرے کا سناٹا..... خشک ہوتا حلق..... اور سوکھ کے آپس میں پیوست ہوئے لب بتا رہے تھے یہ چیخ اس کے خواب میں گونجی تھی..... حقیقت میں تو وہ اس

[illegible] کہ چلا کے اپنے خوف کا اظہار کر سکتی۔

اس نے اپنے دونوں پیر آپس میں رگڑ کے اس لجلجے خوف زدہ لمس کے احساس سے نجات حاصل کرنا چاہی۔ مگر اب وہ لمس اسے پورے بدن پہ سرسراہٹ کے ساتھ رینگتا محسوس ہو رہا تھا۔ بیڈ سے چھلانگ مار کے اترتے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح باہر کا رخ کرنا چاہا۔ تاکہ گرینی کی آغوش میں پناہ لے سکے۔ مگر بڑے ہی برے وقت میں یاد آگیا کہ وہ تو گرینی سے ناراض ہے۔

وہ وہیں دروازے کے پاس دھم سے بیٹھ گئی اور کانپتے وجود کو سمیٹ سیکڑ کے ساتھ لگا لیا..... گھٹنوں میں چہرہ دے کر نہ جانے کتنی دیر تک وہ روتی رہی۔

✵ ✵ ✵

وہاں پر شکوہ خانم بھی رات بھر جاگتی مہر کی کایا پلٹ پہ ہی سوچ و بچار کرتی رہیں۔

"اس کی کوئی بھی بات بغیر غرض یا مطلب کے نہیں ہوتی۔ ضرور اس کے پیچھے بھی کوئی....."

تب ان کی نظر دیوار پہ گھڑی کی جانب گئی۔

"آٹھ بجنے والے ہیں اور میشا ابھی تک میرا ناشتا نہیں لائی۔ وہ مجھ سے کتنی بھی ناراض ہو۔ مگر میری ضروریات سے کبھی غافل نہیں ہوتی۔"

یہ بے چینی انہیں وہیل چیئر دھکیل کے میشا کے کمرے کی جانب لے جانے پہ مجبور کر گئی اور وہاں میشا کو بخار میں بے سدھ دیکھ کے ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

"میشا..... میشا..... آنکھیں کھولو بیٹا..... یا اللہ اتنا تیز بخار..... میشا..... بچے! تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"گرینی.....!" اس نے بمشکل اپنی متورم آنکھیں کھول کے انہیں دیکھا۔ "میں نے..... رات کو..... وہی..... خواب دیکھا تھا..... گرینی..... مم..... میں..... تو..... ڈر گئی تھی۔"

انہوں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

"تو میرے پاس آجاتیں نا گرینی کی جان..... ہمیشہ تو آتی ہو۔"

"کیسے آتی..... میں ناراض جو تھی۔"

"دیکھا..... زیادہ دیر ناراض رہنے کا نتیجہ..... اکیلے میں ڈر ڈر کے بخار چڑھا لیا..... اب اتنی صبح ڈاکٹر کہاں سے ملے گا..... میں دیکھتی ہوں..... شاید گھر میں کوئی دوا ہو۔"

وہ وہیل چیئر ابھی دروازے تک ہی لے کے گئی تھیں کہ میشا کی نیم خوابیدہ آواز سن کے ٹھٹک کر رکیں۔

"کچن میں شہد ہو گا اور باہر سبز گیٹ والے گھر کی کیاری میں جو تکونے پتوں والی بیل ہے اس کے دو پتے پیس کر شہد میں ملا کے دے دیں مجھے..... بخار اتر جائے گا۔"

"تمہیں کیسے پتا میشا؟" گرینی کے سوال نے اس کے خوابیدہ ذہن کو ذرا سا جھنجھوڑا۔

"ہاں..... بھلا..... مجھے کیسے پتا۔" وہ سوچنے لگی۔

"کسی نے بتایا تمہیں میشا یا کسی کتاب میں پڑھا؟"

"پتا نہیں۔" وہ پھر سے بے سدھ ہو گئی۔

✵ ✵ ✵

اور حیرت انگیز طور پہ واقعی شہد میں ملائی اس جڑی بوٹی کی تاثیر سے میشا منٹوں میں بھلی چنگی ہو گئی..... مگر پر شکوہ خانم کی تشویش ابھی برقرار تھی۔

"آپ نے کارا کو فون کر دیا؟"

وہ ریسیور کان سے لگائے ڈاکٹر کا نمبر ملا رہی تھیں، جب مہر نے آ کے دریافت کیا۔ فوری طور پر تو انہیں کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا۔

"کارا کو فون کس لیے؟"

میشا کے بخار نے ان کے ذہن سے رات والی بات یکسر بھلا دی تھی۔

"اوفوہ..... بتایا تو تھا۔ رات کو کھانے پہ بلانا ہے۔ میں نے تو تیاری بھی شروع کر دی ہے۔"

"ہاں..... مگر....." وہ کریدتے کریدتے رک گئیں کہ

کون سا مہر نے ان سے دریافت کرنے پہ اصل بات اگل دینی ہے..... بہتر ہے کہ کارا کو بلا ہی لیا جائے۔ تاکہ تھیلے سے بلی باہر آجائے۔

"ٹھیک ہے..... میں کرتی ہوں فون۔"

انہوں نے ڈاکٹر کے بجائے کارا کے گھر کا نمبر ملانا شروع کیا اور مہر اطمینان سے منظر سے غائب ہو گئی۔

"آنٹی آپ؟ کیسی ہیں؟ میں کتنا مس کر رہی تھی آپ کو۔" کارا حسب توقع ان کی آواز سنتے ہی گرم جوش ہو گئی۔

"مس کر رہی تھیں تو ملنے کیوں نہیں آئیں.....؟ کتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں آئے ہوئے۔ کافی انتظار کے بعد میں نے خود فون کر لیا۔"

"آنٹی..... دل تو بہت چاہ رہا تھا آپ سے ملنے کے لیے آنے کو..... مگر..... آپ کو تو پتا ہی ہے۔" وہ جھجک کے چپ ہو گئی۔

"مہر کی وجہ سے ہچکچاتی رہیں؟"

"جی..... ظاہر ہے۔"

"یہ تمہاری آنٹی کا گھر ہے کارا..... یہاں آنے کے لیے تمہیں کسی سے ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جب جی چاہے آسکتی ہو، بلکہ مہر نے خود کہا ہے کہ میں تمہیں آج رات ڈنر پہ انوائیٹ کروں۔"

"مہر نے کہا ہے؟ حیرت ہے۔"

"اب حیران ہونا چھوڑو..... اور آنے کی تیاری کرو..... بہت اداس ہوں میں تمہارے لیے۔"

✵ ✵ ✵

"سب بہانے سمجھتی ہوں تمہارے..... جب بھی کام کا موقع ہو، تم بیمار پڑ جاتی ہو۔"

مہر اندر میشا پہ برس رہی تھی۔

"ماما! مجھے واقعی رات بھر بخار تھا۔"

"تھا..... ہے تو نہیں..... ذرا سے بخار سے تم مر نہیں جاؤ گی۔ رات کو مہمان آرہے ہیں..... پہلے سارا گھر چمکاؤ، پھر میرے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹاؤ۔"

"میشا بخار میں کوئی کام نہیں کرے گی۔" گرینی نے

دخل دیا۔ وہ مہر کو کارا کی آمد کی اطلاع دینے آئی تھیں۔

"آپ اسے شہہ مت دیں۔ ڈرامے کررہی ہے یہ کام سے بچنے کے لیے۔ اگر یہ آرام فرماتی رہے گی تو دعوت کا انتظام کون کرے گا؟"

"تم اور تمہاری بیٹیاں... اور اگر میشا کی مدد کے بغیر یہ کام اتنا مشکل لگ رہا ہے تو ٹھیک ہے' میں منع کردیتی ہوں کارا کو... آخر میرے ہی بلانے پہ آرہی ہے نا وہ... میری مہمان ہے۔ اگر میری مہمان کی وجہ سے میشا کو تکلیف ہوتی ہے تو میں..."

"نہیں' نہیں۔" مہر گھبرا اٹھی۔ "مہمانوں کو منع کرنا تو تہذیب اور روایت کے خلاف ہے۔ میں سب سنبھال لوں گی۔ ٹھیک ہے میشا! تم آرام کرو۔ میں تمہارے لیے سوپ بھی بھیج دوں گی۔"

میشا نے مسکراتے ہوئے گرینی کو آنکھ ماری۔

✵ ✵ ✵

"پلیز مام... مجھے فورس مت کریں... میں کیا کروں گا وہاں جاکر۔ آپ کی بورنگ سی آنٹیز کی کمپنی میں۔"

"مائر... انہوں نے مجھے بیٹی کہا تھا۔ اس طرح وہ تمہاری بھی نانی ہوئیں۔ گرینڈ مدر... ان کو بہت شوق ہے تم سے ملنے کا۔"

کارا نے اسے محبت سے پچکارا... مگر اس کے تاثرات ہنوز اکتائے ہوئے تھے۔

"اوکے... میں آپ کو لینے آجاؤں گا اور گرینڈ مدر سے بھی مل لوں گا... مگر پلیز... ڈنر نہیں... اتنا زیادہ ٹائم نہیں گزار سکتا میں وہاں۔"

"ٹھیک ہے... اتنا ہی بہت ہے' مگر آنا ضرور۔"

"ایڈریس تو بتا دیں... میں کوشش کروں گا ڈھونڈنے کی۔"

"اتنا چھوٹا سا تو ٹاؤن ہے' بیس پچیس منٹ میں سارا گھوما جاسکتا ہے' یہاں کسی کو تلاش کرنا بہت آسان ہے۔ تم نے جھیل تو دیکھی ہے نا؟"

جھیل کے ذکر پہ مائر کے چہرے پہ مسکراہٹ دھنک کی طرح پھیل گئی۔ "جی... دیکھی ہے۔"

"اس کے پار جو روڈ ہے... اس میں سے تیسری والی اسٹریٹ میں آجانا... سفید پتھروں اور سفید پھولوں سے بھری ہوگی وہ۔ وہاں پہ ہے سیف کاٹیج۔"

"یہ تو تقریباً" وہی جگہ ہے... جہاں اس رات وہ... مطلب کہ وہاں اس کے ملنے کے بھی چانسز ہیں۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"نہیں... ماما... مجھے ایسے کچھ پتا نہیں چل رہا... میں سوچ رہا ہوں آپ کے ساتھ ہی چلا جاؤں۔"

✵ ✵ ✵

"کیا مصیبت ہے... مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب۔"

زینی نے پیالہ پٹخ کر رکھا... اسے آج ماں کے ساتھ کھانے کی تیاری کرنا پڑ رہی تھی... ایک کونے میں کھڑی امی سلاد بنانے میں کم اور ٹونگنے میں زیادہ مصروف تھی۔

"زینی! میں بتاتی تو جارہی ہوں کہ کیسے کرنا ہے۔ اتنا تو آسان ہے اور جب یہ پڈنگ تم کارا کے سامنے یہ کہہ کر رکھو گی کہ یہ تم نے بنائی ہے تو اس پہ کتنا اچھا امپریشن پڑے گا۔"

"ماما... اب وہ زمانے نہیں رہے' جب پڈنگ بنانے سے اچھے امپریشن پڑتے ہوں اور ان کے ہاں تو ایک سے ایک اچھا شیف ہوگا۔ ان کو میری اس کوالٹی سے کیا لینا دینا... مجھے اس وقت اپنے روم میں جاکے اچھا سا فیس پیک لگانا چاہیے اور اپنے بال آئرن کرنا چاہیے۔"

"کھانا بنانے میں میری مدد کون کرے گا پھر؟" مہر تپ گئی' زینی کے نخروں سے۔

"امی سے کہیں..." اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

"اس سے کہوں؟ یہ تو بناتے بناتے آدھے سے زیادہ چٹ کر جائے گی۔" مہر نے خونخوار نظروں سے امی کو گھورا' جس کا منہ تیزی سے چل رہا تھا۔

"آخر آپ نے میشا کو اتنی چھوٹ دی ہی کیوں ہے؟" زینی چڑ کے بولی۔

دبہانے بنا کے اندر پڑی آرام فرمارہی ہے۔"

"میں جانتی ہوں' کوئی بیمار ویمار نہیں ہے وہ... سب کام سے بچنے کے گڑ ہیں... لیکن آج کا دن مجھے تمہاری گرینی کو ناراض نہیں کرنا... اس لیے اس کے نخرے برداشت کرنے پڑیں گے۔"

✵ ✵ ✵

اور نخرے تو مہر نے واقعی خوب برداشت کیے۔ یہاں تک کہ اس کی برداشت کا امتحان لیتے لیتے پُرشکوہ خانم خود بھی حیران رہ گئیں اور کارا کا استقبال تو اس نے ایسی گرم جوشی کے ساتھ کیا کہ خود کارا سٹپٹا کے رہ گئی۔

"ویلکم کارا... ویلکم بیک... تم کیا واپس لوٹیں... یہاں کی رونق ہی لوٹ آئی۔"

پُرشکوہ خانم نے خاصی ٹٹولتی نظروں سے اسے دیکھا' جو ان کی نظروں کو ٹالتی اب مائر کو گلے لگارہی تھی۔

"یہ بیٹا ہے تمہارا... مائر؟ ماشاء اللہ کتنا بڑا ہوگیا ہے۔ بالکل تم پہ گیا ہے۔"

"تھینکس۔" کارا نے اس کی ساری ڈرامے بازی کا جواب ایک ٹھنڈی سی "تھینکس" کے ساتھ دیا اور پُرشکوہ خانم کے آگے جھک گئی۔

"اوہ آنٹی... آپ کتنی ویک ہوگئی ہیں۔"

"عمر بھی تو ہوگئی ہے کارا... اور نت نئی بیماریاں۔"

"مائر... یہ تمہاری بھی گرینی ہیں... میری ماں جیسی۔"

مائر بھی ماں کی دیکھا دیکھی ان کے سامنے جھکا۔

"جیتے رہو... بچوں کے بڑے ہونے سے پتا چلتا ہے کہ وقت کتنا گزر گیا ہے۔"

کارا پُرشکوہ خانم کی وہیل چیئر لے کر مائر کے ساتھ اندر بڑھنے لگی۔ مہر کو یکسر نظر انداز کیے جانا کھلا تو بہت... مگر ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگی۔

"صحیح کہہ رہی ہو... ابھی تو تم میری امی' زینی سے ملنا... وہ بھی بڑی ہوگئی ہیں... تم ان کو پہچان نہیں

پر شکوہ خانم کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

"اوہ... زینی... ایمی... تو یہ وجہ ہے مہر کے بدلنے کی۔"

✲ ✲ ✲

اندر ایمی اور زینی کی تیاریاں ہی مکمل نہیں ہو پا رہی تھیں۔

"بس بھی کرو زینی... کتنا میک اپ تھوپو گی۔ دیکھو! میں نے سوائے کاجل اور لپ اسٹک کے کچھ نہیں لگایا۔"

"لگاؤ نہ لگاؤ... کیا فرق پڑتا ہے... کون سا میک اپ ہے جو تمہاری چربی چھپا سکتا ہے۔"

زینی نے تحقیر اور تمسخر بھرے انداز میں کہا اور پھر جیولری باکس کھولا۔

"کون سے ایر رنگز پہنوں اس کے ساتھ؟"

"سارے ہی پہن لو نا... اوور..." ایمی نے بھی دل کی بھڑاس نکالی۔

"تم ہو گی اوور... بلکہ اوور ویٹ۔" زینی نے جوابی حملہ کرتے ہوئے اپنے سب سے پسندیدہ بُندے نکالے۔

"ہاں... زبردست... یہ میچنگ ہیں... ہائے... مگر اس کے ساتھ کا دوسرا کہاں ہے؟ موٹی... تم نے تو نہیں لیا تھا؟"

"مجھے کوئی شوق نہیں اپنے کانوں کو ہینگر بنانے کا۔"

"تو کہاں گیا؟"

وہ جلدی جلدی ہاتھ مار کے اسے تلاش کرنے لگی۔ اس کوشش میں ایک اور ٹاپس کی جوڑی مل گئی۔

"چلو... یہ پہن لیتی ہوں۔ یہ زیادہ اچھے لگیں گے۔"

"یہ بھی پہن لو... بلکہ سارے ہی پہن لو... کوئی کسر رہ نہ جائے باقی۔"

"ٹھیک ہے... تمہاری بات مان لیتی ہوں۔"

زینی نے ایمی کو چڑانے کے لیے وہ اکلوتا بُندہ واپس اٹھا لیا اور اپنے کاندھے پہ ٹانکنے لگی۔

"اسے میں دوپٹا سیٹ کرنے کے لیے بروچ کے طور پہ استعمال کر لوں گی۔"

✲ ✲ ✲

کھانے کی میز پہ وہی ماحول تھا۔

وہی مہر کا تصنع اور لگاوٹ سے بھرپور انداز۔

وہی کارا کی کیے دیے انداز میں بے نیازی برتنے کی ادا۔

وہی پر شکوہ خانم کی مہر کی باتوں پہ ناگواری۔

وہی مائر کا زبردستی خود کو روکے ہوئے بیٹھنا۔

اس کا بس نہ چل رہا تھا، ابھی اٹھ کے یہاں سے چلا جائے اور پوری گلی کوچے کو اس انجان حسینہ کی تلاش میں چھان مارے۔ وہ ابھی یہاں سے کھسک جانے کا بہانہ تلاش ہی کر رہا تھا کہ سامنے سے آتی زینی اور ایمی پہ اس کی نگاہ اٹک گئی۔

بلکہ... ایمی اور زینی پہ نہیں... صرف زینی پہ۔

یا یوں کہیں کہ... زینی پہ بھی نہیں... اس کے لباس پہ آویزاں اس چاندی کے بُندے پہ جس کا سبز نگ دور سے ہی لشکارے مار رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

میشا کا بھوک کے مارے برا حال تھا۔ اوپر سے باہر سے آتی طرح طرح کے کھانوں کی اشتہا انگیز مہک اس کو اور بھی بے چین کر رہی تھی۔ وہ بے تابی سے کمرے کے چکر کاٹ رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی ٹانگیں بری طرح دکھنے لگیں... رات بھر کے بخار نے ویسے بھی نقاہت طاری کر دی تھی۔

"اوں ہوں... سوپ ہی رہ گیا ہے میرے لیے۔ وہ بھی اتنا بدمزا... پھیکا... اور باہر سب پتا نہیں کیا کیا کھا رہے ہوں گے۔ میشا... کچھ کر... کچھ کر... ورنہ تیرے حصے کچھ نہیں آئے گا۔"

باہر جانے سے وہ اس لیے کترا رہی تھی کہ کہیں

اس کے سر پہ کوئی کام نہ تھوپ دے۔ اب جو کرنا تھا، چھپ چھپا کے ہی کرنا تھا۔

✲ ✲ ✲

اسے اکیلے میں زینی سے بات کرنی تھی۔ اس لیے کھانے کے فوراً" بعد تازہ ہوا اور چہل قدمی کے بہانے اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

اور باہر آنے کے بعد اسے اپنی حماقت اور جلد بازی پہ تاؤ سا آگیا... باہر ایک اجڑا ہوا... خودرو گھاس اور جھاڑ جھنکار سے بھرا لان تھا جو رات کے اندھیرے میں اور بھی بے کشش لگ رہا تھا اور مچھر تھے جو تاک تاک کے اس کو نشانہ بنا رہے تھے اور سب سے بڑھ کے ایمی کی سنگت تھی جو مسلسل ان دونوں کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ جتنا مائر اس سے چڑ رہا تھا، اتنا ہی زینی بھی خار کھا رہی تھی۔ اس نے مائر کی پہلی نظر سے ہی یہ بات محسوس کر لی تھی کہ وہ اس کی جانب ملتفت ہے۔ یہ غلط فہمی یا خوش فہمی دراصل اسے مائر کی ان متلاشی نظروں سے ہو گئی تھی جو اس کے شانے پہ لگے بُندے پہ گاہے بہ گاہے اٹک رہی تھی۔

"تم کبھی دن میں مجھے ملو۔ میں تمہیں اس جگہ کی ساری خوب صورتی دکھاؤں گی۔"

"میں ساری دنیا گھوم چکا ہوں... بہت خوب صورتی دیکھ رکھی ہے میں نے۔" وہ مسکرایا۔

"مگر یہاں کی خوب صورتی تمہیں جکڑ لے گی۔ واپس نہیں جانے دے گی۔" زینی نے اترا کے ذومعنی انداز میں کہا۔

"مجھے خوب صورتی نہیں جکڑتی... کچھ اور ہے جس کے سامنے میں بے بس ہو جاتا ہوں۔"

اس کی بے قرار نظر ایک بار پھر بُندے میں الجھی تھی۔

"یہاں کی ہی فوڈ؟"

اس سے پہلے کہ زینی اس کی بات کو کوئی اور مفہوم پہناتی... ایمی نے دخل دیا۔ جس پہ اسے زینی کی جھاڑ بھی کھانی پڑی۔

"تم کیا ہر وقت اپنی فضول باتیں کرتی رہتی ہو۔"

"اور وہ چیز جو مجھے یہاں رکنے پہ اکسا رہی ہے، ہو سکتا ہے میں اس کے پاس رکنے کے بجائے اسے ہی اپنے ساتھ لے جاؤں؟"

پھر اچانک ہی مائر نے اس پہ ایسا سوال داغ دیا کہ وہ سٹپٹا اٹھی۔

"اچھا... یہ بتاؤ پرسوں رات تم نے فیسٹول میں سب سے زیادہ کس چیز کو انجوائے کیا تھا؟"

"فیسٹول میں... مگر تمہیں کیسے پتا ہم وہاں آئے تھے؟"

"تمہیں تو پتا ہے نا! میں وہاں آیا تھا۔" وہ اسے گڑبڑاتا دیکھ کے مسکراتا چلا گیا۔

"ہاں... میں نے سنا تو تھا۔"

"اوہ... سنا تھا۔" مائر نے اس بار اپنی مسکراہٹ روک لی۔ "ظاہر ہے جو اس دن اپنی شناخت چھپانے میں مصروف تھی۔ وہ اب اچانک کیسے اگل دے... یا شاید اپنی بہن سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتی ہو۔"

"ویسے اس رات تمہارے ساتھ پرابلم کیا تھی؟ تم نے بتایا نہیں؟"

"پرابلم؟" اب اسے حیرانی کے بجائے پریشانی سی ہونے لگی... آخر یہ وہ کیوں نہیں کہتا جو وہ سننے آئی تھی... پتا نہیں کیا انٹ شنٹ ہانکے جا رہا ہے۔

"ارے... وہی پرابلم... ایک ہی تو پرانا پرابلم ہے ہمارا میشا... اور کون؟" ایمی نے ناک چڑھا کے کہا۔

"میشا... کون میشا؟"

✲ ✲ ✲

"آخر یہ میشا ہے کون؟" کارا نے پر شکوہ خانم سے مسلسل اس کا ذکر سننے کے بعد اکتا کے کہا۔ "بتاؤں گی... ضرور بتاؤں گی... مجھے لگتا ہے تم ہی ہو جو میری بات سمجھ سکتی ہو۔"

"جب مجھے وہاں خبر ملی تھی کہ سیف اللہ نے نہ صرف دوسری شادی کر لی ہے، بلکہ اس کی ایک بیٹی بھی ہے، تو مجھے بہت حیرت ہوئی تھی... یہ وہی سیف اللہ

تھا آنٹی! جس نے مہر کے عشق میں مجھ سے رشتہ توڑا تھا اور بعد میں میرے بیوہ ہونے پہ جب آپ نے اسے ہلکا سا اشارتاً "مجھے سہارا دینے کا" کہا تھا تو وہ کیسے بدک گیا تھا کہ میں مہر کو دھوکا دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا... پھر کیسے اس نے مہر کے مقابلے پہ کسی اور کو...."

"ہاں... حالات کے سامنے انسان کی سوچ اور ارادے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔" انہوں نے گہری سانس بھری۔

"مہر نے تو بہت شدید ری ایکٹ کیا ہو گا۔"

کارا کو مہر کے رد عمل کا تصور ہی مزا دے گیا... اور یہ مزا وہ گزرے کئی سالوں میں اکثر لے چکی تھی۔

"کوئی ایسا ویسا... تم تو جانتی ہو اس کی فطرت... یہی بات سیف اللہ کو زندگی سے منہ موڑنے پہ مجبور کر گئی۔ ورنہ ابھی کوئی اس کی عمر تھی؟"

"ویسے معاف کیجئے گا آنٹی... اس میں مہر کے ساتھ ساتھ سیف اللہ کی اپنی غلطی بھی ہے... دو بیٹیاں اور ایک بیوی کے ہوتے ہوئے اسے یہ قدم اٹھانے کی ضرورت کیا تھی اور وہ عورت... میشا کی ماں... وہ نہ جانے کس قماش کی ہو گی، جس نے ایک ہنستا بستا گھر اجاڑا... آپ تو جانتی ہیں، آپ نے اپنے طور پہ سیف اللہ سے مجھ سے شادی کی بات کی تھی... جب مجھے پتا چلا تھا تو میں نے سیف اللہ سے پہلے خود انکار کر دیا تھا... کہ بے شک مہر نے مجھ پہ شب خون مارا تھا۔ مگر اب وہ سیف اللہ کی بیوی اور اس کے بچوں کی ماں ہے۔ میں اس کا حق نہیں چھینوں گی... پھر وہ کیسی عورت تھی بھلا؟"

"وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے... نہ ہی سیف اللہ سو ہمیں زیب نہیں دیتا کہ ان کا ذکر ان الفاظ میں کریں۔"

پرشکوہ خانم کو اس کے الفاظ سخت تکلیف دے رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے موضوع بدلنا چاہا۔

✡ ✡ ✡

اب مائر کو الجھن سی ہو رہی تھی۔ آخر یہ کھل کے کچھ بتاتی کیوں نہیں۔

دراصل قدو قامت اور جسامت تو زینی اور میشا کی ایک سی تھی... نقوش میں بے شک رتی بھر بھی مماثلت نہ تھی... مگر اس رات میشا کے نقوش عیاں ہی کہاں تھے۔

"تمہیں مجھے کشتی چلانا سکھا دینا چاہیے تھا... اس رات مجھے بہت پرابلم ہوئی تھی۔"

اس نے زینی کو ٹٹولنے کی ایک اور کوشش کی۔

"کس رات کو اور مجھے تو کشتی چلانا..." زینی الجھن بھرے انداز میں کہتے کہتے چونکی۔

(اوہ... شاید یہ امی کی موجودگی کی وجہ سے کھل کے بات نہیں کر پا رہا اور یہاں وہاں کی تمہید باندھ رہا ہے۔)

"امی... ذرا چیک کریں... ماما نے کافی اور کیک سرد کر دیا؟ ہمارے لیے کافی یہیں لے آؤ۔"

"ہاں... اور کیک بھی... ابھی لائی۔"

وہ قلانچیں بھرتی وہاں سے گئی تو زینی نے بڑی ادا کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں... اب جو کہنا ہے کہو... اور کھل کے کہو۔"

"کھل کے تو تم کہو... کہ تم نے مجھے پہچان تو لیا ہو گا... کیونکہ چہرہ تم نے چھپایا تھا... میں نے نہیں... پھر انجان کیوں بن رہی ہو؟"

"انجان؟"

"ہاں... دیکھ لو... تم تو اس رات اپنا نام پتا بتائے بغیر وہاں سے چلی گئی تھیں... مگر آخر میں نے ڈھونڈ ہی نکالا۔"

"کس رات؟" وہ حیران پہ حیران ہوئے جا رہی تھی۔

"کم آن... اس رات تم اپنا نام اور پتا چھپا رہی تھیں... جو آج مجھے پتا چل گیا ہے۔ تم اس حسین ملاقات کو ہی چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"کون سی رات؟ کیسی حسین ملاقات؟"

اس پہ مائر نے چونک کے اسے دیکھا... وہاں سوائے حیرت اور الجھن کے کچھ نہ تھا... وہ مایوس سا ہو گیا۔

"کچھ نہیں..." آئی واز جسٹ جوکنگ (میں مذاق کر رہا تھا۔)

✡ ✡ ✡

"شونو! آج تو مزا آگیا... آج تو مہر ماما کو ہوش ہی نہیں ہے کہ میں کیا کر رہی ہوں، کیا نہیں... وہ تو بس مہمان میں مگن ہیں۔"

وہ پلیٹ میں کھانے کی مختلف چیزوں کا پہاڑ سا بنا کے لائی تھی اور اب فخر سے اپنے بھالو شونو کو دکھا رہی تھی۔

"دیکھو! کیا، کیا لائی ہوں میں... اتنے دنوں کے بعد پیٹ بھر کھانا ملے گا۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کے ٹھونسنے لگی۔

عین اسی وقت کارا، پرشکوہ خانم کی سنگت میں اس کے کمرے کی جانب آرہی تھی۔ جو کہ مسلسل اس کی تعریفوں میں مگن تھیں۔

"بہت پیاری... بہت بھولی... بہت سیدھی ہے میری میشا۔ میری بے رونق زندگی میں بہار کا پہلا پھول ہے وہ... تمہیں بھی بہت اچھی لگے گی۔"

ان کے اشارے پہ کارا نے ہینڈل گھما کے دروازہ کھولا اور وہیں ساکت ہو گئی۔ دروازے کے عین سامنے زمین پہ پھسکڑا مار کے بیٹھی میشا کے دونوں ہاتھ کھانے کی پلیٹ میں ڈوبے تھے اور منہ بری طرح سے بھرا تھا۔ گالوں تک پہ کیچپ لگا تھا... بالوں میں چاول اٹکے تھے۔

"یہ سب کیا ہے میشا؟"

پرشکوہ خانم نے کارا کے سامنے ازحد شرمندگی محسوس کی، جو ناگواری اور تحیر سے ناک سکوڑ سکوڑ کے دیکھ رہی تھی۔

میشا نے بولنے کی کوشش کی۔ مگر حلق تک کھانا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے اس سے ایک لفظ تک نہیں بولا گیا۔ وہ صرف سر ہلا کے رہ گئی... نین کٹورے پانی سے بھر گئے۔

"میں تو کارا کو تم سے ملوانے لائی تھی۔ کارا! یہ ہے میری میشا... میری لاڈلی۔"

کارا نے بڑے تکلف اور بڑی دقت کے ساتھ مسکرانا چاہا۔ مگر جیسے ہی میشا نے اپنے گندے سنے ہوئے ہاتھ اس سے ملانے کے لیے آگے کیے تو کارا نے گھبرا کے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے سرسری سا کہا۔

"نائس ٹو میٹ یو۔"

میشا نے ایک بار پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔ جس سے اسے اچھو لگ گیا... اور کھانستے کھانستے اس کے منہ سے کئی چھینٹے سے اڑ کے کارا کے اوپر جا گرے، جس سے وہ بدک اٹھی۔

"اوہ گاڈ...."

رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتے اور لباس کو جھاڑتے ہوئے وہ بڑبڑا کے باہر نکل گئی اور پرشکوہ خانم نے خاصی ناراضی اور غصے کے عالم میں میشا کو گھورا جو بڑی بے نیازی کے ساتھ اپنی انگلیاں چوس کے صاف کر رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

کارا کا موڈ ایسا آف ہوا کہ جاتے جاتے بھی اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔

اور گرینی ایسی شرمندہ ہوئیں کہ مارے خجالت کے اسے رخصت کرنے باہر تک نہ آئیں۔

اور مائر، زینی کی وجہ سے ایسا الجھا کہ اس کی چپ ہی نہ ٹوٹ رہی تھی۔ بس ایک مہر تھی جو بلاوجہ چہکے جا رہی تھی۔

"بہت خوشی ہوئی کارا! تمہارے آنے سے۔"

"میں تو پہلے بھی اکثر آیا کرتی تھی مہر... مگر تم نے کبھی بتایا نہیں کہ تمہیں میرے آنے سے اتنی خوشی ہوتی ہے۔" کارا کے نفیس سے طنز پہ مہر نے کھسیاہٹ چھپاتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

"اس بار بہت عرصے بعد آئی ہو نا... اس لیے۔"

"ہاں! اور اگر میرے سالوں بعد آنے پہ ہی تمہیں

خوشی ہوتی ہے تو ٹھیک ہے.... میں اگلی بار بھی دس سال بعد آؤں گی۔"

"ارے.... میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" مہر کا رنگ اڑ گیا۔ وہ دس سالوں تک زینی کو گھر بٹھانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

"کم آن ماما.... دیر ہو رہی ہے۔" مائر اس طویل الوداعی گفتگو سے اکتا سا گیا اور ٹھیک اس لمحے اوپر کھڑکی میں پردے کو ذرا اٹھا کر جھانکتی ییشا بری طرح چونک اٹھی۔

"ارے.... یہ تو وہی ہے.... اس رات والا.... کشتی میں ساتھ آیا تھا جو.... شکر ہے! میں نیچے نہیں گئی۔ ورنہ یہ مجھے پہچان کے منہ سے کچھ پھوٹ دیتا تو سب کو پتا چل جاتا.... شامت آجاتی۔"

✲ ✲ ✲

سارے راستے مائر کا ذہن اسی نہج پہ تھا۔

"آخر کیا وجہ ہے جو وہ اپنا آپ مجھ سے چھپا رہی ہے اور کیا وہ واقعی اتنی زبردست اداکارہ ہے کہ اس کے تاثرات قطعاً" یہ اشارہ نہیں دے رہے کہ وہ مجھ سے آشنا ہے.... یا.... یا پھر زینی سرے سے وہ لڑکی ہے ہی نہیں۔"

یہ خیال اس کے دل کو خاصا لگا۔

"ہاں.... ہو سکتا ہے' یہ وہ نہ ہو.... اس کی الجھی الجھی بے ربط.... مگر بے ساختہ باتیں جس طرح دل میں گھر کرتی ہیں.... یہ ادا اس میں نہیں.... مگر.... مگر پھر وہ بندا۔"

✲ ✲ ✲

رات بھر پر شکوہ خانم کھولتی رہی تھیں کہ ییشا نے کارا کے سامنے انہیں سخت شرمندہ کیا تھا۔ وہ صبح کے انتظار میں تھیں کہ کب ییشا ان کا ناشتا لائے اور وہ اسے آڑے ہاتھوں لیں.... مگر خلاف توقع اور خلاف معمول ناشتا لے کر مہر آئی۔

"تم نے کیسے زحمت کرلی آج؟"

موڈ تو ان کا پہلے سے خراب تھا۔ بڑے ہی برے موقع پہ آئی تھی مہر اپنا مدعا لے کر۔

"مجھے آپ کا خیال ہے۔ تب ہی تو میں نے آپ کی.... صرف اور صرف آپ کی خاطر کارا کو انوائیٹ کیا' بلکہ اس کی مہمان نوازی میں کسی قسم کی کمی بھی نہ رہنے دی۔ ورنہ آپ نے تو نوٹ کیا ہی ہوگا کہ اس کے دل میں ابھی تک ماضی کی کڑواہٹ ہے۔ جو اس کی زبان تک بھی بار بار آجاتی ہے۔ پھر بھی میں نے اس کی ہر بات کو نظر انداز کیا۔ ماننا پڑے گا آپ کو۔"

اس کی لگاوٹ بھری باتوں کا ان پہ ذرا سا بھی اثر نہ ہوا۔

"میرے لیے؟ تمہیں کیا لگتا ہے' میں تمہاری باتوں کا یقین کرلوں گی؟ تم نے زندگی میں جو کیا ہے اپنے اور صرف اپنے لیے کیا ہے۔ مائر کو آتے دیکھ کے اور تمہاری بیٹیوں کو اس پہ مکھی کی طرح گرتے دیکھ کے مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ کارا کے بارے میں تمہارے خیالات کیسے بدلے۔"

جب سب عیاں ہو ہی گیا تو اب مصلحت کا نقاب لگائے رکھنے کی کیا حاجت تھی بھلا.... سو مہر نے بھی فوراً" پینترا بدل کے کہا۔

"اگر پتا ہے آپ کو تو اس میں غلط کیا ہے۔ اگر میں اپنی بیٹی کے حوالے سے کچھ سوچ رہی ہوں۔"

"سوچو.... ضرور سوچو.... مگر اس کے لیے میرے ساتھ اتنے ڈرامے کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

ان کا حد سے زیادہ برا مزاج ایک بار پھر مہر کو جھکنے پہ مجبور کر گیا۔

"کیونکہ زینی آپ کی بھی کچھ لگتی ہے۔ آپ کو بھی اس کے بارے میں کچھ سوچنا ہے۔ آپ کے تعاون کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں؟ اتنے سال تم نے ان کی تربیت کرنے میں ضائع کردیے' مگر ان کو کسی قابل نہ بنایا۔ میں راتوں رات ان میں کون سے سرخاب لگا سکتی ہوں' جو کارا اور مائر' زینی پہ لٹو ہو جائیں۔"

"کارا آپ کی بہت مانتی ہے۔ آپ اسے زور دے کر کہیں۔"

"یہ میں نہیں کر سکتی۔"

"مگر کیوں؟ وہ آپ کی پوتی ہے۔"

"مت بھولو کہ میری پوتی سیف اللہ کی بیٹی ہے۔ وہ سیف اللہ جس نے کارا سے منگنی توڑی تھی۔ صرف اور صرف تمہارے لیے۔ کارا کے دل میں آج تک یہ غم تازہ ہے.... تم یہ توقع کیسے کر سکتی ہو کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی تمہاری بیٹی سے کرے؟"

ان کی زبان پہ سچ تھا.... مگر مہر کو یہ سچ ہضم نہ ہوا۔

"جب میں نے سب بھلا دیا ہے تو اسے بھی سب بھلا دینا چاہیے۔ آپ اسے کہیں تو سہی۔"

"نہیں.... جب میں سیف اللہ کو مجبور نہیں کر سکی کہ وہ تم سے نہیں' کارا سے شادی کرے تو میں کارا کو بھی مجبور نہیں کروں گی۔"

ان کے دوٹوک جواب نے مہر کو مشتعل کر دیا۔

"یوں کہیں کہ آپ ایسا کرنا ہی نہیں چاہتیں' کیونکہ آپ نے کبھی امی اور زینی کو اپنا ہی نہیں سمجھا۔"

✲ ✲ ✲

"کیا؟ مام یہ کس قسم کا آئیڈیا ہے۔" مائر کارا کی بات سن کر جھنجلا اٹھا۔

"آئیڈیا نہیں.... ہماری خاندانی روایت ہے' ایسا ہی ہوتا آیا ہے سالوں سے۔ تمہارے ڈیڈ نے بھی مجھے ایسے ہی پسند کیا تھا۔"

کارا نے دھیرج سے سمجھانا چاہا۔ مگر اسے یہ روایت یا طریقہ کار بہت عجیب.... بلکہ سراسر بے تکا لگ رہا تھا۔

"مگر مجھے یہ سب بہت عجیب لگ رہا ہے.... ایسے سب کو گھر بلانا.... پھر ان میں سے کسی ایک کو پسند کرنا' نو مام!"

"تمہیں عجیب کیوں لگ رہا ہے.... عجیب تو ان لڑکیوں کو لگنا چاہیے.... مگر ان کو نہیں لگے گا۔ وہ تو اسے اپنی خوش قسمتی ہی سمجھیں گی۔"

"لیکن شادی تو مجھے اس ایک لڑکی سے ہی کرنا ہے.... یہ تو طے ہے.... پھر اس سارے جھنجھٹ کی کیا ضرورت ہے مام۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو وہ چونک اٹھی۔

"اس ایک لڑکی سے؟ کس لڑکی سے؟"

"وہ.... وہ.... ہے ایک۔"

"مگر تم نے تو کہا تھا' تم کسی کو پسند نہیں کرتے۔"

"پسند کرتا ہوں.... مگر اسے جانتا نہیں ہوں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"یا شاید جانتا ہوں.... مگر پہچان نہیں پا رہا۔"

"کھل کے بتاؤ.... مجھے ایسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

تب مائر نے مختصراً" صرف اتنا بتایا کہ وہ کسی لڑکی کی صرف ہلکی سی جھلک پہ اسے زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کر چکا ہے' مگر اس کے نام سے واقف ہے اور نہ پتے سے۔ یہ سن کے کارا نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ جانتی تھی کہ حد سے زیادہ سنجیدہ مائر اس وقت اس ہنسی سے خائف ہو جائے گا۔

"میں نے اپنی فیملی کی سب لڑکیوں کو انوائیٹ کرنے کے ساتھ ساتھ ٹاؤن کے سب ہی اچھے گھرانوں کو بلایا ہے۔ اگر وہ ان میں سے ایک ہوئی تو اچھا ہے۔ تمہیں اسے جگہ جگہ تلاش کرنے کی زحمت نہیں کرنی پڑے گی۔"

اس نے مائر کو اس رسم یا فنکشن کے لیے قائل کرنا چاہا.... مگر اس نے ہچکچا کے سوال کیا تھا۔

"اور.... اگر.... وہ ان میں سے ایک نہ ہوئی تو.... میرا مطلب ہے.... آپ کی فیملی سے.... یا کسی اچھے گھرانے سے.... تو؟"

جواب میں کارا نے ایک معنی خیز چپ سادھ لی۔

✲ ✲ ✲

پر شکوہ خانم کو اب موقع ملا تھا ییشا کو جھاڑنے کا اور وہ ہمیشہ کی طرح شکل پہ دنیا جہان کی مسکینی' معصومیت اور بے چارگی طاری کیے چپ چاپ سر جھکائے سن رہی تھی یا شاید ان کے تھک جانے کا انتظار کر رہی

تھی۔ آخر وہ زچ ہو اٹھیں۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا.... تم ایسے کیوں کرتی ہو؟"
"میں نے کیا کیا ہے گرینی! بھوک لگے تو کھانا کھانا بری بات ہے کیا؟"
"چوری کرکے کھانا بری بات ہے یشا!"
"اپنے گھر میں کھانا' کھانا.... چوری کرکے کھانا ہوتا ہے گرینی؟" وہ یشا ہی کیا جو سوال پہ سوال نہ دے مارے۔ آخر اس سوال نے لمحہ بھر کے لیے پرشکوہ خانم کو لاجواب کردیا تو وہ اس کا فائدہ اٹھا کے شروع ہی ہو گئی۔
"کیا یہ گھر میرا نہیں ہے گرینی؟ کیا میں زینی اور امی کی طرح اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتی؟"
وہ اس کی معصومیت بھری ڈرامے بازی کے آگے ہار ہی گئیں۔
"پوری نوٹنکی ہو تم.... سارا غصہ بھلا دیتی ہو۔"
"میں بہت کیوٹ اور سویٹ ہوں نا.... اس لیے۔"
انہیں نرم پڑتا دیکھ کے وہ جھٹ سے ان سے لپٹ گئی۔

✡ ✡ ✡

امی اور زینی کالج سے آنے کے بعد صوفوں پہ ڈھیر تھیں۔ دونوں میں کاہلی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔
"فریج سامنے تو ہے.... اٹھ کے نکال نہیں سکتیں جوس؟"
"تم بھی تو نکال سکتی ہو.... تمہارے پیر ٹوٹے ہیں؟"
"یشا کہاں ہے.... یشا۔" آخر یشا کو صدا دی گئی۔
"یشا.... آکے جوس دو ہمیں۔"
"میرے ہاتھ گندے ہیں.... میں پوچا لگا رہی ہوں۔" یشا نے سیڑھیاں چمکا کے صاف کرتے ہوئے ٹکا سا جواب دیا۔
"تو دھو کے آؤ.... " زینی نے گھرکا۔
"گندے ہیں تو کیا ہوا.... پیکٹ ہی تو نکالنے ہیں.... پیکٹ تھوڑا ہی گندا ہو جائے گا باہر سے۔" امی نے ایک اور حل نکالا۔
"امی.... زینی! پتا ہے ابھی کس کا فون آیا تھا.... کارا کا۔" مہر نے جوش سے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ آکے اعلان کیا۔
"کیا؟" ان دونوں کی ہنسی بھک سے اڑ گئی۔
"اس نے ہمیں کل شام پارٹی میں انوائیٹ کیا ہے۔ ایک گرینڈ پارٹی میں۔"
"ضرور مائر نے کہا ہوگا۔" زینی نے خوش فہمی میں گھرتے ہوئے اترا کے کہا۔
"ہاں.... ویسے یہ پارٹی ہے تو مائر کے لیے ہی۔"
"مینیو کیا ہوگا ماما؟"
امی نے جیسے ہی منہ کھولا۔ ان ماں' بیٹی نے یک زبان ہو کر اسے چپ کروایا۔
"شٹ اپ امی!"
"صرف ایک دن ہے تیاری کے لیے.... میں چاہتی ہوں ہم سب پارٹی میں کسی سے کم نہ لگیں۔ مائر اور کارا کو بس تم ہی تم نظر آؤ.... باقی سب کی چھٹی ہو جائے۔"
"باقی سب....؟ اور کسی کو بھی بلایا ہے؟" وہ چونکی۔
"ہاں.... فیملی کی سب ہی لڑکیوں کو.... دراصل مائر ان میں سے اپنے لیے دلہن چنے گا۔ کارا کی خاندانی روایت کے مطابق۔"
"کیا۔" زینی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یشا بھی ہاتھ روک کر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پہ مرکوز تھیں۔

✡ ✡ ✡

وہاں سے خبر لیتے ہی یشا اب پرشکوہ خانم کے گھٹنے تھامے ان کی منت کر رہی تھی۔
"پلیز.... گرینی.... مجھے بھی جانا ہے پارٹی میں۔"
"یشا.... تم کیوں نہیں سمجھتیں' یہ بے تکی رسم ان کی ہے' ہماری نہیں۔ تم میرے لیے بہت قیمتی.... بہت انمول ہو' میں تمہیں اتنا ارزاں نہیں دیکھ

سکتی.... کہ تم دوسری لڑکیوں کی طرح اس گھٹیا مقابلے میں حصہ لو۔"
"امی اور زینی بھی تو جا رہی ہیں۔"
"میرا ان پہ کوئی بس نہیں۔ وہ میری پوتیاں ہیں۔ میں نہیں چاہتی وہ ایسے اپنے خاندان کا نام نیچا کریں۔ خود کو پلیٹ میں رکھ کے پیش کرتے ہوئے.... مگر مہر کے آگے میرا زور نہیں چلتا.... مجھے شروع سے ہی کارا کی فیملی کا یہ طریقہ پسند نہیں ہے کہ لڑکیوں کو بھیڑ' بکریوں کی طرح جمع کرکے ان میں سے کسی ایک کو چھان پھٹک کے پسند کیا جائے۔"
"مگر میں تو صرف پارٹی میں جانا چاہتی ہوں۔ میں نے کب سے کوئی پارٹی اٹینڈ نہیں کی۔ عرصہ ہو گیا ہے اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ انجوائے کیے ہوئے.... بنے سنورے ہوئے اور کارا آنٹی کے گھر تو پارٹی بھی بڑی زبردست ہوگی.... پلیز گرینی.... میں اس فضول مقابلے کا حصہ نہیں بن رہی.... قسم سے.... صرف اور صرف پارٹی دیکھنا چاہتی ہوں۔"
"ٹھیک ہے.... اگر صرف اتنی سی بات ہے تو میں تمہیں لے جاتی ہوں اور کارا سے صاف کہہ دوں گی کہ میری یشا کو اس بھیڑ' بکریوں کے ریوڑ میں سے نہ سمجھنا۔"
"سچ.... اور مہر ماما؟"
"جب میں تمہیں لے کر جا رہی ہوں تو کسی کی کیا مجال کہ میرے سامنے دم مار سکے۔"
انہوں نے دعوا کیا اور واقعی مہر یہ سنتے ہی آپے سے باہر ہو گئی۔
"وہ کیوں جائے گی ہمارے ساتھ؟"
"کیونکہ انویٹیشن سیف اللہ کی فیملی کے لیے آیا ہے اور یشا بھی اس فیملی کا ایک حصہ ہے۔" انہوں نے تحمل سے کہا۔ مگر وہ اور بھی مشتعل ہو گئی۔
"آپ اسے میری بیٹیوں کے مقابلے پہ لا رہی ہیں؟"
"نہیں.... کیونکہ یشا کا ان سے کوئی مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔"
ان کی مسکراہٹ نے نہ صرف مہر کو تپا دیا' بلکہ زینی جو ٹی وی سے نظر ہٹا کے اس گفتگو کو سن رہی تھی' فوراً" اٹھی اور دھپ دھپ کرتی سیدھی یشا کے کمرے کی طرف گئی۔
"ابھی دیکھتی ہوں' کیسے جاتی ہے یہ ہمارے ساتھ۔"

✡ ✡ ✡

یشا اپنی خوشی پو اور شونو کے ساتھ بانٹ رہی تھی۔
"شونو.... یشا' گرینی کے ساتھ جا رہی ہے۔ یشا نے تھوڑا سا جھوٹ بھی بولا ہے گرینی سے' کہ مجھے تو صرف پارٹی انجوائے کرنی ہے۔ مگر پتا ہے پو.... یہ پارٹی وہی ہے جو سنڈریلا کے لیے پرنس نے رکھی تھی.... یاد آیا....؟ میں تمہیں کہتی تھی نا کہ میں بالکل سنڈریلا ہوں.... وہی اسٹیپ مام.... وہی موٹی اور سڑیل بہنیں.... اور جیسے سنڈریلا کی اسٹیپ ماما نے اسے پارٹی میں نہیں جانے دیا تھا' ایسے ہی مہر ماما بھی مجھے روک رہی ہیں۔ مگر سنڈریلا کے پاس میری گرینی جیسی گرینی نہیں تھیں اور نہ میرے جتنی عقل....."
وہ اپنی ہوشیاری کا مزا لیتے ہوئے خود ہی ہنس دی' کھلکھلا کے۔
اور یہ کھلکھلاہٹ زینی کو دروازے کے پار رکنے پہ مجبور کر گئی' جو تلملاتے ہوئے وہاں آرہی تھی۔
"ہونہہ.... یہ جائے گی ہمارے ساتھ۔ ہماری برابری کرے گی۔ شکل دیکھی ہے اس نے۔ آئی بڑی' ارے.... یہ کون ہے اس کے ساتھ اندر۔"
اس نے ذرا سا جھانک کے دیکھا.... یشا گود میں کمی ماؤس کو بھینچے اسے بتا رہی تھی۔
"مگر یار.... ایک پرابلم ہے چھوٹی سی.... وہاں وہ بھی تو ہوگا.... کارا آنٹی کا بیٹا.... وہی اس رات والا' جو مجھے کشتی میں جھیل کے پار چھوڑنے آیا تھا.... کہیں وہ مجھے پہچان نہ لے' گڑبڑ ہو جائے گی۔"
"اوہ.... تو وہ یشا ہے جس کو مائر مجھ میں تلاش کر رہا تھا۔ اب تو اس کو بالکل بھی نہیں جانا چاہیے وہاں۔"

زینی نے آہستگی سے ہینڈل چھوڑ دیا۔

☼ ☼ ☼

پر شکوہ خانم عرصے بعد خریداری کے لیے بازار نکلی تھیں۔ وہ بھی صرف اور صرف بیشا کی خاطر... مگر ان سے زیادہ بیشا پرجوش تھی۔

"گرینی... یہ دیکھیں... ریڈ والا۔" وہ ہر دکان کے باہر بچوں کی طرح مچل جاتی۔

"اوں ہوں۔ سرخ رنگ بہت اوور لگے گا۔"

"اس میں ایک اور کلر بھی ہے۔ براؤن والا لے دیں۔"

"نہیں! وہ تو بوڑھوں والا رنگ ہے۔ آگے چلو۔"

بیشا نے منہ بسور کے ان کی وہیل چیئر آگے دھکیلی مگر اگلے ہی پل وہ کسی اور دکان کے باہر جم گئی۔

"ہائے گرینی! وہ سی گرین کلر... اف کتنا پیارا ہے۔"

"ہاں رنگ تو اچھا ہے مگر تم پہ..."

"ہے ناں۔" وہ کھل اٹھی کہ گرینی کسی بات پہ متفق تو ہوئیں۔

"مگر کپڑا بہت گھٹیا ہے۔ اور گرم موسم کے لحاظ سے قطعی نامناسب۔"

"مہر ماما آپ کے بارے میں ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ آپ ہر بات پہ ان کی مخالفت کرتی ہیں۔" اس نے بڑبڑا کے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

"اچھا... یہ پنک اور گرے والا؟"

"کیسی بات کر رہی ہو۔ یہ تو سرے سے کسی تقریب والا لباس ہے ہی نہیں۔"

"کیا ہے گرینی۔" آخر وہ تنتنا کے بول اٹھی۔ "آپ کب سے ایسے ہی کر رہی ہیں۔ آپ نے مجھے کچھ لے کر دینا بھی ہے یا نہیں؟"

"کیوں نہیں! مگر میں چاہ رہی تھی۔ کوئی بہت ہی خوب صورت گلابی رنگ کا لباس لے کر دوں تمہیں۔ تم پہ یہ رنگ بہت...؟"

کہتے کہتے وہ رک گئیں... سامنے ایک ٹھیلے سے مالائیں خریدتے کچھ بھکشوؤں پہ ان کی نظر پڑی تھی، ان کا سفید رنگ اور بھی زیادہ سفید پڑ گیا۔

"بیشا! واپس چلو... جلدی۔"

"کیا ہوا گرینی؟"

"میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ واپس چلو۔"

"طبیعت نہیں، آپ کی نیت خراب ہو رہی ہے۔ آپ مجھے کچھ لے کر دینا ہی نہیں چاہتیں۔ وہ دیکھیں سامنے پنک ڈریس۔"

"بیشا۔" وہ چلائیں۔ "سنا نہیں، میں کہہ رہی ہوں فوراً" یہاں سے چلو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ اچھا! ٹھیک ہے۔ نہیں جانا۔ تو میں کوئی تمہاری محتاج نہیں ہوں۔ جا سکتی ہوں۔"

ان کی بے چین مضطرب نظریں ان بھکشوؤں سے ہٹ نہیں پا رہی تھی اور وہ وہیل چیئر دھکیلتی آگے جا رہی تھیں۔ آخر بیشا ناراضی کے باوجود ان کے پیچھے پیچھے جانے پر مجبور ہو گئی۔

سارے رستے دونوں نے کلام تک نہ کیا۔ بیشا کا تو خفگی سے منہ پھولا ہوا تھا اور گرینی اپنی سوچوں میں غلطاں تھیں۔ گھر آتے ہی بیشا پھٹ پڑی۔

"اب بتائیے... کیا ہوا ہے آپ کی طبیعت کو؟ کیا جلدی تھی گھر آنے کی؟ بس مجھے ڈریس نہیں لے کر دینا تھا آپ نے۔" وہ منہ پھلا کر بولی۔

"ایسی ہی بات ہے۔ اب میں اتنی دور اکیلی نہیں جا سکتی۔ نہ کوئی اور ہے مجھے لے جانے والا۔ کیسے آئیں گے میرے کپڑے؟ وقت بھی اتنا کم ہے۔" اس نے پیر پٹخے۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے، بازار جانے کی نہ پارٹی میں... گھر سے باہر قدم نکالنے کا سوچنا بھی مت۔"

"کیا؟ مگر آپ نے تو کہا تھا۔" وہ حق دق رہ گئی۔

"اب بھی میں ہی کہہ رہی ہوں۔ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ اب بحث مت کرنا مجھ سے۔"

ان کا مزاج حد سے زیادہ برہم تھا اور آنکھوں میں اس قدر سختی تھی کہ وہ اپنی فطرت کے برخلاف واقعی چپ کر گئی۔

☆ ☆ ☆

"پلیز آنٹی! ایسا تو نہ کریں۔ آپ نہیں آئیں گی تو میں خود کو بہت تنہا فیل کروں گی۔"

انہوں نے کارا سے معذرت کرنے کے لیے فون کیا تھا کہ وہ تقریب میں شرکت نہیں کر سکیں گی مگر وہ مسلسل اصرار کیے جا رہی تھی۔

"آپ ہی تو میری بڑی ہیں۔ آپ نہیں ہوں گی تو کون مجھے گائیڈ کرے گا ہو چننے میں؟ ویسے بھی اتنے سال یہاں سے دور رہنے کی وجہ سے میں اب بہت سے لوگوں کو جانتی بھی نہیں ہوں۔ آپ ہوں گی تو ہیلپ رہے گی۔"

"ہاں! مگر کارا میری بھی مجبوری ہے۔ طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ شاید موسم کا اثر۔۔۔"

"نہیں! میں آپ کی ایک نہیں سنوں گی۔ میں آپ کو ماں کی جگہ دیتی ہوں تو آپ کو بھی مجھے بیٹی سمجھ کے اس موقع پہ میرے پاس ہونا چاہیے۔"

آخر وہ اس کے محبت بھرے اصرار کے آگے ہار مان گئیں۔

"ٹھیک ہے! تمہارا مان بھی تو رکھنا ہے۔ آجاؤں گی۔"

وہ ہامی بھر تو بیٹھیں مگر فون بند کرنے کے بعد پریشان ہو گئیں۔ بیشا کو وہ ہرگز ساتھ نہیں لے جانا چاہتی تھیں اور اسے گھر پہ اکیلے چھوڑنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہ اس کی خود سری سے واقف تھیں اور ابھی میلے میں چوری چھپے جانے والا کارنامہ بھی تازہ تھا۔ وہ کوئی اور حل نکالنے کا سوچنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

"آپ گندی ہیں گرینی۔۔۔ بہت گندی۔۔۔ پہلے وعدہ کرتی ہیں پھر توڑ دیتی ہیں۔"

وہ تکیے میں منہ دے کر سسک سسک کر رو رہی تھی اور پتا نہیں کیا بات تھی۔ آنسوؤں کا اس کی نیند سے ایسا کون سا ناتا تھا کہ ادھر آنسو بہتے۔ ادھر آنکھوں میں نیند بھر جاتی۔ وہیں گالوں پہ پھیلے آنسوؤں کے ساتھ وہ غنودگی میں چلی گئی۔ اپنے ان ہی سپنوں میں جو اس کے ساتھ بچپن سے کھیل کے جوان ہوئے تھے۔

جہاں چیتھڑوں سے بھرے جا بجا پیوندوں سے سجے میلے لباس میں بھی اس کا حسن دمک رہا تھا۔ اس کی کالی کجراری سی آنکھیں اس سپنے میں زہر رنگی تھیں اور سیاہ گھنیرے گھنگھریالے بال اس وقت اخروٹی رنگ کے گچھوں کی صورت اس کے شانوں پہ بکھرے تھے۔ وہ یہاں بھی گھٹنوں میں سر دیے سسک سسک کے رو رہی تھی۔ جب ایک بجلی سی کوندنے پہ اس نے چونک کے سر اٹھایا۔ آسمان پہ جگمگاتے ستارے سے ایک کرن سیدھی اس کے آنگن میں اتر رہی تھی اور کرن کے اس زینے سے قدم بہ قدم نیچے آتی۔ پریوں کی رانی۔۔۔ فیری گاڈ مدر۔۔۔

"فیری مدر۔۔۔؟" وہ پہچان اٹھی۔

"نہیں گرینی؟"

وہ فیصلہ نہ کر پائی کہ یہ فیری مدر تھیں سنڈریلا والی یا اس کی گرینی۔ شکل و صورت گرینی والی اور لباس فیری مدر والا۔ سر پہ ہیروں کا تاج، ہاتھ میں نقرئی جادو کی چھڑی۔

"میں گرینی بھی ہوں اور تمہاری فیری مدر بھی۔۔۔ بالکل جیسے تم بیشا بھی ہو اور سنڈریلا بھی۔"

"کیا آپ مجھے وہاں بھیج سکتی ہیں جہاں امی اور زینی گئی ہیں مہرماما کے ساتھ؟"

"ہاں بالکل۔ اسی لیے تو آئی ہوں۔"

"مگر میرے یہ پھٹے پرانے کپڑے۔" اس نے منہ بسورا۔۔۔

"یہ بھی لو۔"

انہوں نے اپنی جادو کی چھڑی گھمائی اور بیشا کا نہیں۔ سنڈریلا کا پھٹا پرانا لباس پلک جھپکتے میں ایک خوب صورت سفید میکسی میں تبدیل ہو گیا۔ پھولی پھولی نفیس جالی کی میکسی۔

"میری گرینی۔ میری فیری مدر۔۔۔"

وہ چلائی اور اسی وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔ باہر سے آتے ہارن کی آواز پہ وہ گھبرا کے کھڑکی کی جانب لپکی۔ مہر کی پرانی کھٹارا موٹر گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔

"مہرماما جا رہی ہیں۔ گرینی۔۔۔ گرینی۔"

وہ سرپٹ باہر کی جانب بھاگی اور گرینی کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہی دھک سے رہ گئی۔ گرینی بھی وہاں نہیں تھیں۔

"گرینی بھی چلی گئیں مجھے چھوڑ کے۔۔۔"

اب وہ دیوانوں کی طرح باہر بھاگی۔ جہاں امی پر شکوہ خانم کے کہنے پہ گیٹ پہ تالا لگا رہی تھی۔ انہیں خدشہ تھا ان کے جانے کے بعد بیشا اپنے طور پہ وہاں آنے کی کوشش نہ کرے یا پھر اپنی ناراضی جتانے یا ان سے بدلہ لینے کی خاطر۔ انہیں تنگ کرنے کے لیے کہیں نکل نہ جائے۔ اس طرح باہر سے تالا لگا کے اسے اندر اکیلے بند کر کے جاتے ہوئے دل تو دکھ رہا تھا مگر۔۔۔۔

"چلو آبھی جاؤ امی۔۔۔ دیر ہو رہی ہے؟"

مہر کے چلانے پہ امی جیسے ہی آکے بیٹھی۔ زینی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اور جب تک بیشا بھاگتے ہوئے لان عبور کر کے گیٹ تک پہنچی گاڑی گلی کا موڑ مڑ رہی تھی۔ وہ اونچی آواز میں پکارتے ہوئے گیٹ کو کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔

"گرینی۔۔۔ گرینی پلیز، مجھے چھوڑ کے نہ جائیں۔ گرینی! آپ تو رک جائیں میرے پاس۔"

مگر اس وقت اس کی آواز تک صدمے سے بند ہو گئی، جب اسے احساس ہوا کہ گیٹ باہر سے مقفل ہے۔

"نہیں۔۔۔ گرینی ایسا کیسے کر سکتی ہیں میرے ساتھ۔" وہ وہیں گیٹ کے پاس بے دم سی ہو کر زمین پہ بیٹھ گئی اور بلند آواز کے ساتھ رونے لگی۔ ساتھ ساتھ شکوے بھی جاری تھے۔

"کیوں اللہ جی! آپ نے کیوں میری قسمت ایسی بنائی ہے کیوں مجھ سے سب کچھ چھین لیا ہے۔ میرے بابا۔۔۔ میری ماما۔۔۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں دیا مجھے۔۔۔ سوائے گرینی کے اور پھر گرینی کے دل سے بھی میری محبت چھین لی۔ پہلے انہوں نے میرے جانے پہ پابندی لگائی تاکہ انہیں میرے کپڑوں کے لیے پیسے خرچ نہ کرنے پڑیں اور اب وہ مجھے گھر میں اکیلے لاک کر کے چلی گئیں۔"

رات کے سناٹے میں اس کی سسکیاں اور فریاد گونج رہی تھی۔ جھینگر تک سہم کے دبک کے خاموش ہو گئے تھے۔ جیسے دم سادھے اس کا واویلا سن رہے ہوں۔

"گرینی کہتی ہیں۔ میرے جیسے بچے گاڈ کے لیے اسپیشل ہوتے ہیں۔ وہ ان سے پیرنٹس لیتے ہیں تو بدلے میں اور بہت کچھ دے دیتے ہیں۔ جیسے سنڈریلا کے لیے آپ نے فیری مدر بھیج دی تھی۔ مگر اللہ جی۔ مجھ سے تو آپ نے صرف لیا ہی لیا ہے۔ دیا کچھ نہیں۔۔۔ کیا میں آپ کے لیے اسپیشل نہیں ہوں۔ کیا آپ کو میری پروا نہیں ہے؟ مجھ سے محبت نہیں ہے۔ اگر ہے تو بھیجیے ے لیے بھی کوئی فیری مدر ورنہ مجھے لگے گا باقی سب کی طرح آپ کے لیے بھی بیشا کچھ نہیں ہے۔"

آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں نیند سمانے لگی تھی۔ مگر وہ تیزی سے پلکیں جھپکتے ہوئے اسے بھگانے لگی۔ جانتی تھی۔ آج اسے اگر کوئی خواب دکھائی بھی دیا تو بے حد بھیانک اور ڈراونا ہو گا۔ اس سیاہ رات کی طرح۔ اس ہولناک تنہائی کی طرح۔ اور اچانک اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ایک تیز روشنی اس کی نظروں سے ٹکرائی تھی۔ اس نے بے ساختہ اپنا بازو موڑ کے چہرے کے آگے کیا۔ اور پھر ہولے ہولے ہٹاتے ہوئے چندھی آنکھوں سے سامنے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ تیز روشنی بالکل سامنے سے براہ راست اس تک آ رہی تھی اور زمین پہ ایک لمبا سا گہرا سایہ۔ وہ سہم کے سکڑ گئی۔ سایہ نزدیک آ رہا تھا۔ قدموں کی چاپ بڑھ رہی تھی۔ دم سادھ کے دبکے جھینگر پھر سے ٹرٹرانے لگے۔ دور کہیں ایک کوئل کوکی تھی۔ شاید جھینگر کے بے سرے پن سے بدمزا ہو کے۔

روشنی کی چوڑی لمبی سی لکیر اس کے چہرے سے ہٹ کے نیچے زمین پر گئی اور وہ سامنے واضح طور پہ دیکھنے کے قابل ہوئی۔ مگر جو نظر آیا۔ اس نے میشا کے ہوش اور بھی اڑا دیے۔

٭ ٭ ٭

امی اور زینی کے لیے یہ سب بہت نیا تھا۔ مہر البتہ کسی حد تک نارمل تھی۔ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کچھ عرصہ اس نے خاصا اچھا وقت دیکھا تھا۔ اس کے والد اور سیف اللہ دونوں سفارت خانوں سے منسلک تھے اور اچھے عہدوں پہ تھے' اس لیے طرز زندگی خاصا قابل رشک رہا۔ بہت نامی گرامی لوگوں سے شناسائی اور میل جول رہا مگر امی اور زینی کے لیے کار امینشن ایک الگ ہی دنیا تھی۔

سنگ مرمر کے فرش۔

جا بجا قیمتی آرائشی قمقمے اور فانوس۔

نایاب پینٹنگز....

ایسے دبیز غالیچے کہ زینی کی چار انچ کی ہیل آدھی سے زیادہ اس میں دھنس رہی تھی۔

فواروں سے عطر آمیز پانی کی پھواریں سارے ماحول کو خوش گوار کر رہی تھیں۔

باادب... باوردی اور تربیت یافتہ ملازمین کی فوج۔

امی کی ساری توجہ تو انواع واقسام کے کھانوں پہ تھی مگر زینی کھلی آنکھوں کے ساتھ ان سب کو اپنی دسترس اور ملکیت میں لانے کے خواب دیکھ رہی تھی۔

٭ ٭ ٭

وہ جو کوئی بھی تھا۔ اس کی جانب بڑے دوستانہ انداز میں دیکھتا مسکرا رہا تھا۔ اور اس کی مسکراہٹ بڑی نرم بڑی مدھر سی تھی۔

آنکھوں میں بھی نرمتا ہلکورے لے رہی تھی۔

سادہ سے نقوش....

مناسب سی قدوقامت۔

سنولاہٹ کو چھوتا گندمی رنگ

بھورے رنگ کی سوتی پتلون' جو کثرت استعمال سے جگہ جگہ سے ہلکی بھوری ہو رہی تھی۔

بھورے اور بادامی خانوں والی سوتی قمیص... ڈھیلی ڈھالی سی۔

بدحال... خستہ اور کیچڑ بھرے لانگ شوز۔

مجموعی طور پہ اس کی شخصیت میں اگر اچانک اور فوراً" متاثر کرنے والا کچھ نہ تھا تو خوف زدہ کر دینے والا بھی نہیں تھا۔ مگر پھر بھی وہ بے حد ڈر گئی۔ کیونکہ گیٹ باہر سے مقفل تھا۔ وہ گھر میں بالکل اکیلی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ ایسے میں کسی اجنبی کو اپنے گھر کے احاطے میں صرف ڈھائی فٹ کے فاصلے پہ موجود پانا اچنبھے سے زیادہ خوف کا باعث ہی تو تھا۔

ہلکی سی چیخ مار کے اس نے بھاگنا چاہا۔ مگر سامنے تو وہ کھڑا تھا۔ اسی لیے ایک قدم آگے بڑھانے کے بعد اس نے بوکھلا کے دو قدم پیچھے بڑھا دیے اور ایک چکنے پتھر سے اٹک کر پیچھے کی جانب گرنے ہی لگی تھی کہ اس نے ہاتھ اس کی کمر کے گرد حائل کر کے اسے گرنے سے بچالیا۔

٭ ٭ ٭

مائر پھر سے اسی الجھن میں گھر رہا تھا۔

اس رات زینی کے شانے سے لگا وہ بندہ اسے گمان دلا رہا تھا کہ زینی ہی وہ لڑکی ہے. جس کی باتوں نے اس کا دل لبھایا تھا اور وہ چاہتے ہوئے بھی اس کا خیال دل سے اور اسے تلاش کرنے کی خواہش ذہن سے نکال نہیں پایا۔

لیکن دوسری جانب زینی کے نازو ادا' اس کی تصنع اور لگاوٹ سے بھرپور باتیں اس کے گمان کو غلط قرار دے رہی تھیں۔ ان میں وہ بے ساختگی۔ وہ بھول پن مفقود تھا جس کا وہ اسیر ہوا تھا۔

"مجھے تو لگا تھا میری طرح تمہیں بھی وہ ملاقات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یاد رہ گئی ہو گی۔"

اس پہ زینی نے دانستہ اس رات کا ذکر چھیڑ کے مائر کی الجھن میں مزید اضافہ کر دیا۔

"میں تو اس رات کے سحر سے نکل ہی نہیں پا رہی۔ وہ جھیل... وہ کشتی' وہ تمہارا ساتھ' وہ میٹھی میٹھی' پیار بھری باتیں۔"

"جھیل اور کشتی کے ذکر پر وہ پھر سے ذرا سا ڈگمگایا مگر جیسے ہی زینی نے پیار بھری باتوں کا ذکر کیا' وہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ بھلا پیار بھری باتیں کب ہوئی تھیں۔

"اس دن تو تمہیں کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔"

"وہ تو امی ساتھ تھی ورنہ تم کوئی بھولنے والی چیز ہو۔"

زینی نے اپنے تئیں بڑے قاتلانہ انداز میں کہا تھا مگر مائر کی نفیس طبیعت کو اس کی بات کھل گئی۔

"میں چیز ہوں بھی نہیں۔"

"یہ تو میرے دل سے پوچھو تم.... کہ تم کیا ہو؟"

وہ مزید نزدیک ہوئی اور مائر کی گھبراہٹ میں بھی اضافہ ہوا۔ وہ واضح طور پر کترا گیا۔

"ایکسکیوزمی۔"

زینی تلملا کے اسے دوسری جانب بڑھتا دیکھنے لگی۔

٭ ٭ ٭

"کک.... کو.... کون ہو تت.... تم؟"

وہ اس کے دائیں بازو پہ قوس قزح کے زاویے کی طرح گری پوچھ رہی تھی۔ اس اجنبی نے اس کا ہاتھ تھام کے سیدھا کرتے ہوئے مسکرا کے جواب دیا۔

"رومان.... رومان ہوں میں۔"

"یہاں کیوں آئے ہو؟" وہ پھر سے تھوڑا پیچھے ہٹی۔

"بھیجا گیا ہوں۔" وہ بھی آگے بڑھ آیا۔

"مگر کیوں؟" وہ کھسک کے گیٹ سے جا لگی۔

"تمہارے لیے۔" اب وہ بالکل مقابل کھڑا تھا۔

"میرے لیے؟"

"ہاں۔ تم ہی تو بلا رہی تھیں رو رو کے۔"

"جھوٹ۔ میں نے کب بلایا تمہیں؟ میں کیوں بلاؤں گی؟ میں تو تمہیں جانتی تک نہیں۔ کون ہو تم کوئی چور؟ ڈاکو؟"

"تم نے مجھے نہیں بلایا۔ مگر کسی کو تو بلا رہی تھیں اپنی فیری مدر کو.... بلا رہی تھیں یا نہیں۔"

"ہاں.... مگر.... تم...."

"اتفاق سے وہ میری گرینڈ مدر ہیں۔"

"کیا.... کون؟"

"تمہاری فیری مدر۔ میری گرینڈ مدر۔ انہوں نے ہی بھیجا ہے مجھے۔ صرف اور صرف تمہاری مدد کے لیے۔"

٭ ٭ ٭

پر شکوہ خانم اب سخت پچھتا رہی تھیں کہ میشا کو اکیلے چھوڑ کے کیوں آئیں۔ وہ ابھی سے اسے منانے کے طریقے سوچنے لگیں۔

"آنٹی... آپ اتنی الگ تھلگ گم صم کیوں بیٹھی ہیں؟" کارا نے ان کے نزدیک بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بہت عرصے کے بعد ایسی کسی تقریب میں شرکت کر رہی ہوں وہ بھی تمہارے اصرار پہ۔ الگ تھلگ رہنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ تم میری فکر نہ کرو۔ جاؤ جا کے اپنے مہمانوں کو وقت دو۔"

"ایک پرابلم ہے آنٹی۔"

"کیسی پرابلم؟"

"مائر کسی لڑکی کو پسند کرنے لگا ہے۔"

"تو اس میں مسئلہ کیا ہے.... جسے وہ پسند کرتا ہے اس سے کر دو اس کی شادی.... تمہیں یہ پارٹی رکھنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ شاید اسی لیے مائر اتنا الجھا ہوا اور اکھڑا اکھڑا سا لگ رہا ہے۔"

"یہ پارٹی میں نے رکھی ہی اسی لیے ہے کیونکہ مائر نہیں جانتا' وہ لڑکی کون ہے' کہاں رہتی ہے۔ اسی لیے میں نے سوچا۔ یہاں آئی لڑکیوں میں سے ہی وہ کوئی نکل آئے تو اچھا ہے۔ مگر دل میں ڈر ہے کہ کہیں وہ کسی ایسی ویسی فیملی کی نہ ہو۔"

٭ ٭ ٭

میشا منہ کھولے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی..... رومان نے اس کی سہولت کے لیے اپنا چہرہ ذرا مزید اس کے نزدیک کیا۔

"ہاں ہاں دیکھو۔ غور سے دیکھو..... میری شکل بھی ملتی ہے ان سے..... نہیں؟"

میشا نے پہلے آہستہ سے اور پھر زور سے اپنا سر نفی میں ہلایا..... پھر بولی۔

"کوئی نہیں جی..... ذرا سی بھی نہیں ملتی۔"

"جب وہ میری عمر کی تھیں تو بالکل ایسی تھیں اور جب میں ان کی عمر کا ہو جاؤں گا تو ویسا ہی ہو جاؤں گا۔ اچھا، تمہاری تسلی کے لیے بتاتا ہوں کہ تم میری گرینڈ مام کو اسی لیے بلا رہی تھیں کہ تمہاری کھڑوس اسٹیپ ماما اپنی لاڈلیوں کو لے کر پارٹی میں گئی ہیں اور تمہیں گھر میں قید کر گئی ہیں۔ اب تمہارا جانا تو بہت ضروری ہے ناں..... ورنہ اسٹوری کا کلائمکس کیسے ہو گا۔"

"تم یہ کیسے جانتے ہو؟" اس کا منہ دوبارہ کھل گیا۔

"میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارا نام میشا ہے۔ تمہارے بابا کا نام سیف اللہ تھا جو دس سال پہلے وفات پا گئے۔ تمہاری ایک گرینی ہیں جن سے تم بے حد پیار کرتی ہو۔ تمہارا سارا دن گھر کے کاموں میں گزرتا ہے یا پھر اپنی کھڑوس ماما کی ڈانٹ سنتے اور تم اپنی دنیا میں..... اپنے خیالوں میں اتنی مگن رہتی ہو کہ تمہیں یہ تک نہیں پتا چلتا کہ تمہارے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔"

"تم تو سب جانتے ہو..... کیا ہو تم؟ کوئی جادوگر، کوئی بھوت، جن۔" خوف نے اس کی رنگت یکسر سفید کر ڈالی جو رات کی نیلاہٹ میں بے حد نمایاں ہو رہی تھی۔

"نہیں..... نہ جادوگر، نہ جن، نہ بھوت..... فیری مین۔"

"کیا، فیری مین مذاق کر رہے ہو، میں شکل سے معصوم لگتی ہوں۔ ہوں نہیں۔ سمجھے، سچ بتاؤ کون ہو تم؟"

"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں فیری مین نہیں ہوں۔ کیا تمہیں پریوں کے ہونے پہ شک ہے اگر ایسا ہے تو تم مدد کے لیے فیری مدر کو کیوں بلا رہی تھیں۔"

"کیوں وہ ہیں..... شروع سے ہیں۔ سنڈریلا کے زمانے سے۔ شاید اس سے بھی پہلے۔ انہوں نے سنڈریلا کی لائف بنا دی تھی قسم سے مجھے بھی لائف بنانی ہے۔"

"مائر سے شادی کر کے؟" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"اوہ گاڈ! تم مائر کو بھی جانتے ہو؟"

"اب تو مان لو..... میں تمہاری فیری مدر کا پوتا ہوں۔ تمہاری فریاد ان تک پہنچی ضرور..... مگر وہ نہیں آسکتی تھیں۔ ان کی وفات ہو چکی ہے۔"

"اوہ..... ویری سیڈ..... مجھے رونا آرہا ہے۔"

ہوش سنبھالتے ہی ان کو کہانیوں میں اتنا سنا تھا اور کتابوں میں اتنا پڑھا تھا کہ ایک عجیب سی انسیت ہو گئی تھی اس لیے یہ سنتے ہی اس کا دل اور آنکھیں دونوں بھر آئیں۔

"نہیں نہیں رونا مت۔ بہت پرانی بات ہو چکی ہے اب تو ان کو گزرے دو سو سال ہونے والے ہیں۔ ورنہ وہ ضرور آتیں۔ تمہاری مدد کے لیے۔ اس لیے انہوں نے مجھے بھیجا ہے۔"

اتنی تفصیل سننے کے بعد بھی جب رومان نے میشا کی آنکھوں میں ہنوز بے یقینی اور ابہام دیکھا تو مایوس ہو کر یہ کہتے ہوئے جانے کے لیے پلٹا۔

"ٹھیک ہے۔ شاید تمہیں میری بات کا اعتبار نہیں ہے یا پھر شاید میری ضرورت نہیں ہے۔"

میشا اچانک کچھ بے چین سی ہوئی..... چند لمحے کشمکش کا شکار رہنے کے بعد وہ یہ پکارتی ہوئی اس کے پیچھے لپکی۔

"سنو، سنو پرے! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے پرے!"

✡ ✡ ✡

"زینی! یہ لو فون اپنی گرینی کو دے کر آؤ۔"

مہر نے زینی کو اشارے سے بلایا جو کہ دوبارہ مائر کے پیچھے جانے کے لیے پر تول رہی تھی اور موبائل اسے تھمایا۔

"یہ کیا کرنا ہے انہوں نے؟"

"میشا کو ہی فون کرنا ہو گا اور کیا..... بار بار اشارے کر کر کے منگوا رہی ہیں۔ جاؤ دے کر آؤ۔ جان چھوٹے میری تو۔"

زینی برے برے منہ بناتی پر شکوہ خانم کی جانب بڑھی جو بڑے دھیان سے کارا کی بات سن رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

میشا پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اس کے پاس آ کے رکی..... جو کیلے کے درختوں کے جھنڈ کی جانب بڑھ رہا تھا۔

"پرے! تم کرو گے میری مدد؟"

"میرا نام رومان ہے..... اور ہاں کروں گا مدد..... اسی لیے تو آیا ہوں۔"

"تو کرو..... لے جاؤ مجھے وہاں۔"

میشا نے بے ساختہ اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جیسے وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہی اسے ہوا کے دوش پہ جھیل کے اس پار لے جائے گا۔ رومان نے اس کا ہاتھ تھاما..... ایک گھٹنا زمین پہ رکھ کے وہ جھکا اور اس کے ہاتھ کی پشت پہ اپنے لب ہولے سے رکھے۔

میشا نے گھبرا کے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"اے..... یہ کیا کر رہے ہو؟"

"میرے ایک انکل تھے۔"

وہ یونہی زمین پہ ایک گھٹنا رکھے، جھکے ہوئے بتانے لگا۔

"کئی سو سال تک وہ ایک چراغ میں قید رہے۔ الہ دین نام کے ایک بندے نے انہیں آزاد کرایا تھا تب ہی وہ باقی ساری عمر اسے آقا مانتے رہے۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا تھا کہ ایک اچھے جن یا پرے کو اپنے آقاؤں کے ساتھ ایسے ہی پیش آنا چاہیے۔"

رومان نے دوبارہ اس کا ہاتھ تھاما اور بڑے احترام اور عقیدت سے بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"تم میری کوئین ہو اور کوئین کے ساتھ ایسے ہی پیش آیا جاتا ہے۔"

میشا کے انداز میں خود بخود ایک اتراہٹ سی آگئی۔ اس کے ابرو تن گئے..... صراحی دار گردن میں ایک خم نظر آنے لگا اور لہجہ یکایک شاہانہ اور بے نیاز سا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے..... اب جلدی سے مجھے پارٹی میں لے جاؤ ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

"چلو....." وہ فوراً تیار ہو گیا۔

"اس لباس میں۔" وہ ہلکا سا چیخی جیسے جتا رہی ہو کہ تمہارا دماغ تو درست ہے۔

"ٹھیک ہے۔ تم کپڑے تبدیل کر آؤ۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔"

"تم کیسے پرے ہو..... ایک لباس تک کا انتظام نہیں کر سکتے میرے لیے۔"

رومان کے چہرے پہ لمحہ بھر کے لیے گھبراہٹ نظر آئی۔

"مجھے بالکل سنڈریلا جیسا لباس چاہیے۔"

"اوں..... سنڈریلا جیسا۔" وہ کچھ سوچنے لگا۔

"ٹھیک ہے ابھی آجاتا ہے مگر تم اپنا منہ تو دھو کے آؤ۔ رو رو کے عجیب سا ہو رہا ہے۔ یہ میں کسی جادو سے ٹھیک نہیں کر سکتا۔"

"بس ابھی آئی۔ دو منٹ....."

وہ سرپٹ دوڑتی گھر کے اندر کی جانب بڑھی..... برق رفتاری سے اس نے پہلے برآمدہ..... پھر ہال اور پھر زینہ عبور کیا۔ اپنے کمرے میں جا کر چہرے پہ ٹھنڈے پانی کے زور زور سے چھپاکے مارے اور اپنی ہی قمیص کے دامن سے رگڑ کے خشک کرتے ہوئے اسی رفتار سے واپس آئی۔ وہ وہیں اسی جگہ ہاتھ میں ایک گلابی ریشمی لباس لیے کھڑا تھا۔

"واؤ..... پنک کلر لے آئے۔"

اس نے بڑے شوق سے اس کے ہاتھ سے لباس جھپٹ لیا مگر فوراً ہی اس کا منہ اتر گیا۔

"یہ کیا..... یہ کس کے سائز کا لائے ہو؟ امی کے سائز کا..... دوسرا لا کے دو۔"

"اب میں پھر سے پرستان جاؤں۔ کتنا ٹائم ضائع ہو

گا یار۔"

"مجھے یار مت کہو۔" اس نے منہ بنایا۔

"اچھا نہیں کہتا..... مگر فی الحال تم یہی پہن لو..... دیر ہو رہی ہے۔"

"پہننے میں بھی تو وقت ضائع ہو گا۔ تم اپنے جادو سے کیوں نہیں پہنا دیتے مجھے جیسے فیری مدر نے چٹکی بجاتے ہی سنڈریلا کو خود بخود پہنا دیا تھا۔"

"سوچ لو۔" وہ لطف لیتے ہوئے مسکرایا۔ "وہ فیری مدر تھیں۔ ان کی بات اور تھی..... میں ایسا کروں گا تو شاید تمہیں شرم آئے..... نہیں؟"

میشا جھینپ گئی اور لباس لے کر اندر کی جانب بھاگی..... اس نے پشت سے پکار کے کہا۔

"سنو..... تمہیں چلنا نہیں آتا؟ ہمیشہ بھاگتی کیوں ہو۔" مگر وہاں جواب دینے کی فرصت کسے تھی۔ چند منٹ بعد ہی وہ برا سا منہ بنائے کاندھوں سے اس لباس کو تھامے اندر سے برآمد ہوئی۔

"یہ کس موٹی پری کا اٹھا لائے ہو..... اتنا کھلا ہے مجھے۔ بار بار نیچے گر رہا ہے۔"

رومان کی نظروں میں مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔

"کوئی پن ہے تو دو..... میں لگا دیتا ہوں۔"

"لو..... اب میں پن ڈھونڈنے لگ جاؤں تاکہ مزید وقت ضائع ہو اور میرے وہاں جاتے جاتے پارٹی ختم ہو جائے۔"

وہ اس پہ برس پڑی۔

✵ ✵ ✵

"آخر ملا کہاں تھا وہ اس لڑکی سے؟"

پرشکوہ خانم کار اسے استفسار کر رہی تھیں۔ جب زینی فون لیے ان کے عقب میں آئی اور عادت سے مجبور وہیں رک کر سننے لگی۔ گفتگو کے رخ نے اسے کھٹکا دیا تھا۔

"پتا نہیں..... نہ نام جانتا ہے نہ پتا۔ ہاں بس ایک ایئر رنگ ہے..... چاندی کا..... سبز نگ والا..... اسی کو لیے پھرتا ہے۔ جو وہ چھوڑ گئی تھی۔"

زینی کا دل زور سے سکڑ کے سمٹ گیا۔

"چاندی کا بُندہ..... اوہ' وہ والا وہ جو ایک ہی رہ گیا تھا اور جسے میں نے آج صبح ہی بے کار سمجھ کر لان میں پھینک دیا تھا..... اوہو ایک تو میری جلد بازیاں۔"

وہ پچھتانے لگی۔

✵ ✵ ✵

رومان کی نظر اچانک نیچے گئی۔

گھاس میں پھنسے چاندی کے بُندے میں جڑے نگینے کی چمک نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

"لو کام بن گیا۔"

اس نے جھک کر بندہ اٹھایا اور میشا کے کاندھے سے پھسلتے ریشمی لباس کو چٹکی میں پکڑا۔

وہ بدک کے پیچھے ہٹی۔

"اے..... ہٹو' ہاتھ مت لگاؤ۔"

"ہاتھ نہیں..... پن لگا رہا ہوں۔"

وہ پرواہ کیے بغیر دوبارہ سے آگے بڑھا اور بُندے کو پن کی طرح لگا کے اس کے لباس کو شانوں سے ٹھیک کیا۔

"ہوں اب ٹھیک ہے۔"

"اور میرے شیشے کے سینڈل سنڈریلا جیسے؟"

"سنڈریلا بہت نازک تھی۔ تم نے اپنا ویٹ دیکھا ہے۔ ایسے سینڈلز تم جیسی لڑکیوں کے لیے نہیں ہوتے۔ ہاں یہ اتار دو۔"

اس نے میشا کے بالوں میں بندھا ربن کھول دیا اور سیاہ گھنگھریالے بال جیسے اس قید سے چھٹنے پہ شکر ادا کرتے اس کے شانوں پہ بکھر گئے۔

وہ بے خود سا ہو کے دیکھنے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

وہ مسکرائی تو رومان چونکا..... پھر انجان بن گیا۔

"کچھ نہیں..... سوچ رہا تھا۔ چلیں۔"

"جی نہیں۔ تم مجھے دیکھ کے کھو گئے تھے۔ میں بہت کیوٹ اور سویٹ لگ رہی ہوں ناں اس لیے۔"

رومان کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

میشا نے نیچے رکھا کدو اٹھا کے اس کے چہرے کے سامنے بڑے فخر سے دکھایا۔

"ہاں یہ بھی کیوٹ ہے۔ اب چلو۔"

"اس پہ جائیں گے ہم۔ جلدی سے اپنے جادو سے اسے زبردست سی بگھی بنا دو۔"

"ہاں بنا تو دوں..... مگر اب چوہے کہاں سے لاؤں گا۔ جن کو گھوڑے بنانا ہے اور اس پہ تو جاتے جاتے بہت دیر ہو جائے گی..... میرے پاس ایک زبردست چیز ہے جو چلتی نہیں..... اڑتی ہے..... اس پہ چلتے ہیں مگر اس سے پہلے یہ۔"

اس نے جیب سے ایک کاغذی رنگین چشمہ نکالا۔

"یہ کیا ہے؟ ماسک؟"

"یہ پہن لو گی تو پارٹی میں اپنی کھڑوس ماما کی پٹائی سے بچ جاؤ گی۔"

"مگر گیٹ پہ تو تالا ہے۔"

میشا اسے گیٹ کی جانب بڑھتے دیکھ کے بولی۔

"لیکن باہر تو جانا ہے۔ کچھ کرتے ہیں۔"

"کچھ کیا..... وہی کرو ناں جو کر کے تم یہاں آئے تھے یعنی جادو سے۔"

"جادو سے میں تو دیوار کے آرپار جا سکتا ہوں مگر تم عام انسان ہو۔ تم ایسے جاؤ گی۔"

اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کے دیوار پہ رکھے۔ اچھلا اور پھر کود کے دوسری جانب۔

"آؤ اب۔" میشا ہمت کر کے دیوار پہ تو چڑھ گئی..... اتنی اونچی بھی نہیں تھی اور پاؤں رکھنے کے لیے گملے بھی تھے مگر اب نیچے کودنے سے ڈر رہی تھی۔

"جلدی۔"

"نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"یار..... میں ہوں ناں۔"

"تم نے پھر مجھے یار کہا۔"

"اوکے..... ہر ہائی نیس آئیے....."

رومان نے اسے بڑی احتیاط سے کمر سے پکڑ کے نیچے ایسے اتارا جیسے کوئی گلاب کا پھول توڑ کے کسی کے بالوں میں لگا دے۔

"اس پہ جائیں گے ہم۔"

میشا موٹر بائیک دیکھ کے چلا اٹھی۔

"سوال پہ سوال بند کرو..... اور جلدی بیٹھو۔"

اس نے بائیک اسٹارٹ کی..... میشا فوراً" لباس کو گھٹنوں سے اٹھاتے ہوئے احتیاط سے بیٹھی۔ اس نے دانستہ اپنے اور رومان کے درمیان خاصا فاصلہ رکھا تھا..... مگر جیسے ہی بائیک تیز رفتاری سے اونچے نیچے راستوں پہ گزرنے لگی تو میشا نے اسے زور سے کمر سے دبوچ لیا۔

"یہ کیسے راستوں سے گزر رہے ہو۔ اتنے خراب والے۔"

"یہ شارٹ کٹ ہے..... ابھی دو منٹ میں ہم وہاں ہوں گے۔"

✵ ✵ ✵

"اگر یہ وہی ہے تو میرا دل گواہی کیوں نہیں دیتا؟ مگر وہ تو کہہ رہی ہے کہ وہ..... وہی ہے تو کیسے نہ مانوں۔ اس ملاقات کے بارے میں ہم دونوں کے علاوہ کون جانتا ہے۔ لیکن..... نہیں۔ یہ وہ کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ تو بہت معصوم' اپنے حسن سے انجان..... اپنی کشش سے بے خبر تھی۔ یہ وہ....."

وہ کب سے محفل میں اٹکھیلیاں کرتی۔ بجلیاں گراتی زینی کو نظروں کے حصار میں لیے سوچ رہا تھا اور ہمیشہ کی طرح زینی اس کی نظروں سے اپنی مرضی کے مطلب اخذ کرتی پاس آئی..... اور اٹھلا کے کہا۔

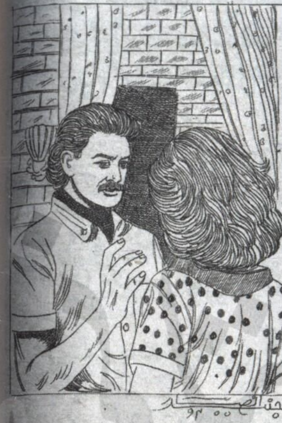
"میری ایک چیز ہے تمہارے پاس۔"

"کون سی چیز؟"

"کچھ تھا..... جو اس رات میں کشتی میں گرا آئی تھی۔ مجھے ایسا کیوں لگتا ہے' تم نے اسے میری نشانی سمجھ کے اپنے پاس رکھ لیا ہو گا۔"

وہ ایک بار پھر بری طرح چونکا..... زینی کی بات پہ کم اور سامنے سے آتی میشا کو دیکھ کے زیادہ۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)





صوفیہ کشمیر



مکمل ناول

"کھانے میں کیا پسند ہے آپ کو۔"

"جو شے اچھی اور ذائقہ دار بنی ہوئی ہو۔"

"اچھا یہ بتائیں.... میوزک پسند ہے آپ کو؟"

"سب کو ہوتا ہے۔"

"کیسا میوزک پسند ہے؟"

"جو سننے میں اچھا لگے۔"

"مطالعہ کرتی ہیں۔"

"ہر پڑھا لکھا بندہ کرتا ہے۔"

"اچھا بتائیں! کس طرح کی کتابیں پڑھتی ہیں؟ ویٹ ویٹ.... شاید میں جواب جانتا ہوں۔ آپ وہ کتابیں پڑھتی ہیں، جو پڑھنے میں اچھی لگیں۔ موویز وہ دیکھتی ہیں جو دیکھنے میں اچھی لگیں اور فیشن وہ کرتی ہیں جو کرنے میں اچھا لگے۔ ایم آئی رائٹ؟" طیب طاہر نے سوال کرکے خود ہی جواب دیا اور تائید چاہی۔ لیکن بلیو مون نے جواب نہیں دیا اور آف لائن ہو گئی۔ طیب مسکرا کر بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

یہ کوئی نئی بات نہ تھی بلیو مون دنیا کے ہر موضوع پر

بات کرتی تھی' ہر موضوع پر بحث کرتی تھی مگر جہاں اس کی ذات پر بات آتی' وہیں سے اس کی گفتگو گول مول ہو جاتی۔ وہ نہ طیب سے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ پوچھتی' نہ ہی کچھ بتاتی۔ یہ دستور اس کا روز اول سے تھا جسے اس نے ان سات ماہ تیرہ دن میں کبھی تبدیل نہ کیا تھا۔

✡ ✡ ✡

ماہم نور سینٹرل لائبریری سے باہر آئی تو اندھیرا چاروں اطراف پھیل چکا تھا۔ وہ پریشان ہوئی۔ اندر تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ جب وہ یہاں آئی تھی' تب تو دو تین ہاسٹلر لڑکیوں کو دیکھا تھا۔ لیکن اس وقت ادھر ادھر چند لڑکے ہی نظر آرہے تھے۔ اس نے رکشے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں' لیکن ناکامی ہوئی۔ اس کی نظریں ہی سامنے کھڑے لڑکوں کی طرف اٹھیں۔ ان میں سے ایک موصوف اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ اسے کوفت ہوئی۔ دل ہی دل میں اسے "تاڑو" کا خطاب دے کر وہ زیرو پوائنٹ کی طرف آئی اور وہاں موجود پولیس والے سے رکشے کے بارے میں پوچھا۔

"ادی! اس وقت رکشہ کہاں سے ملے گا۔ جلدی چلے جانا تھا ناں۔" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا۔

اس کا دل چاہا اس کے کندھے سے لٹکتی بندوق اتار کر اس پر چلا دے۔ لیکن ظاہر ہے ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے پیدل ہی ہاسٹل جانے کا ارادہ کیا اور چل دی۔ اسے ردا پہ بے حد غصہ آرہا تھا' جس کو اس نے ڈیجیٹل لوجک ڈیزائن کا اسائنمنٹ یاد دلاتے ہوئے اپنے ساتھ ـــــ سینٹرل لائبریری چلنے کو کہا تھا لیکن محترمہ کو نیند زیادہ پیاری تھی۔

"ایسی کلاس میٹ ہونے کا بھی کیا فائدہ۔ باقی لڑکیاں کتنی خوش قسمت ہیں کہ ان کی کئی کلاس فیلوز ہاسٹلرز بھی ہیں۔ کتنے مزے سے کمبائن اسٹڈی کرتی ہیں اور ایک میں۔۔۔ یہ میڈم ہی رہ گئی تھیں میرے لیے۔" دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ کوئی اور بھی اس کے پیچھے آرہا ہے۔ اس نے اس خیال سے مڑ کر دیکھا کہ شاید کوئی ہاسٹلر لڑکی ہو لیکن پیچھے تو وہ تاڑو اور ایک لڑکا اور تھا۔ اس کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ قدموں کی رفتار بڑھا دی۔

ٹھہر بھی جاؤ صنم
تم کو میری قسم

ان میں سے کسی ایک نے گنگنانا شروع کر دیا تھا' اسے پسینہ آنے لگا۔ دل ہی دل میں اس نے دعائیں پڑھنی شروع کر دیں۔

اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر تم
تمہارے بنا ہم بھلا کیا جئیں گے

بول بدل گئے آواز قریب سے قریب تر ہوتی جارہی تھی۔ اس کو لگا وہ اس کے اتنے قریب ہیں کہ اگر وہ ایک لمحہ کے لیے بھی رکی تو ان سے ٹکرا جائے گی۔ پسینہ صاف کرتے ہوئے اس نے رب سے مدد مانگی۔ اس لمحے اسے لگا جیسے پیچھے سے کوئی گاڑی آرہی ہے اور سڑک پہ مزید پھیلتی روشنی نے تصدیق بھی کر دی۔ ایک سیاہ کار اس کے بالکل قریب آکر رک گئی۔ پہلے تو اسے کچھ حوصلہ ہوا' پھر یہ سوچ کر ڈر گئی کہ کہیں وہ بھی ان ہی کا ساتھی نہ ہو۔ یہ خیال آتے ہی وہ اور بھی تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ گاڑی بھی اس کے ساتھ آہستگی سے کچھ آگے بڑھی۔

"ماہم۔"

اپنا نام سن کر ایک پل کے لیے وہ تھم سی گئی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ اس کے کان اس آواز سے شناسا ہیں۔ اس نے جلدی سے مڑ کر گاڑی کے اندر نظر ڈالی۔

"دُجانے عثمان۔"

اس کی جان میں جان آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے بیٹھنے کو کہتا' اس نے خود ہی تیزی سے سامنے سے گزر کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ دُجانے نے ایک نظر ان لڑکوں پر ڈالی جو سڑک سے اتر کر نشیب میں گم ہو رہے تھے اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ لب کچلتی ہوئی وہ بہت گھبرائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

"پوچھ سکتا ہوں' اس وقت اکیلی کس مہم پر نکلی ہوئی تھیں تم؟" اس نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"ڈیجیٹل لاجک (Digital logic) کی اسائنمنٹ بنانا تھا تو مرکزی لائبریری گئی تھی۔" اس نے انگلیاں مروڑتے ہوئے جواب دیا۔

"شاباش۔۔۔ دُجانے عثمان تمہارے جذبہ تعلیم سے خاصا متاثر ہوا۔ ویسے مطلع کیے دیتا ہوں کہ ایک عدد لائبریری ہمارے ڈپارٹمنٹ میں بھی ہے۔" اس کا انداز سراسر مذاق اڑانے والا تھا۔ وہ روہانسی ہو گئی اور صفائی دینے لگی۔

"وہاں سے اس سبجیکٹ کی چاروں کتابیں ایشو ہو چکی تھیں۔"

"رداجی کہاں ہیں۔"

"وہ سو۔۔۔ وہ بزی تھی۔"

"چلیں۔۔۔ آج کی آپ کی بہادری کو تو میں خراج تحسین پیش کر دیتا ہوں۔ مگر پلیز! آئندہ خیال رکھنا۔۔۔ اگر ردا بی بی دستیاب نہ ہوں تو ایسی کارکردگی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ اب میں کوئی ہیرو تو ہوں نہیں کہ جب تم نے پکارا۔ میں جامشورو کے جس کونے میں ہوا گھوڑا۔۔۔ سوری! گاڑی سرپٹ دوڑاتے ہوئے پہنچ جاؤں گا۔۔۔ اور تم ہیرو بدلتی رہو' یہ بھی زیب نہیں دیتا۔" وہ اپنے انداز میں شروع ہو چکا تھا۔

"جی!" اس کے خاک پلے نہ پڑا۔

"جی۔۔۔ مطلب یہ کہ آئندہ علم کی تلاش میں اس وقت اکیلی نہ نکلنا۔" اس نے گاڑی ہاسٹل کے گیٹ کے آگے روکتے ہوئے کہا۔ وہ سوچنے لگی کہ اس کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کرے۔

"نہیں نہیں۔۔۔ شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ تو ایک مسلمان' ایک پاکستانی اور ایک کلاس فیلو ہونے کے ناطے میرا فرض تھا۔" جیسے ہی اس نے الفاظ ترتیب دے کر لب وا کیے وہ اس سے پہلے ہی بے اختیار بول پڑا۔ تب ہی مسکراہٹ ماہم کے لبوں کو چھو گئی۔ اس نے سر جھکاتے ہوئے فائل گود سے اٹھائی اور اترنے لگی۔

"اللہ حافظ۔" وہ گاڑی کا دروازہ بند کرنے لگی تب دُجانے نے کہا۔

"اللہ حافظ۔" اس نے تھوڑا جھکتے ہوئے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ اخلاقاً تو یہ الفاظ پہلے اسے ادا کرنے چاہیے تھے۔

✡ ✡ ✡

بلیو مون اور اس کے بیچ آج پورا گھنٹہ بات ہوئی تھی۔ وہ اس کی ذہانت اس کی اپ ٹو ڈیٹ نالج پہ حیران رہ جاتا تھا۔ عام طور پر لڑکیاں مخصوص موضوعات پہ بات کر سکتی تھیں۔ کئی لڑکیاں اس کی فرینڈز تھیں۔ مگر ان کے مخصوص انداز اور مخصوص باتیں اسے بور کر دیتیں۔ ایک بلیو مون تھی جس کی گفتگو کا دائرہ بے

حدود وسیع اور معیار بہت بلند تھا۔

بلیو مون بھلے اسے اپنے بارے میں کچھ نہ بتاتی ہو اور نہ ہی اس نے کبھی طیب سے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کوئی سوال کیا تھا۔ مگر طیب طاہر ایک کھلی کتاب تھا۔ بلیو مون پوچھے نہ پوچھے مگر جانتی تھی کہ طیب طاہر سال بھر پہلے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اب بینک میں بہت اچھی پوسٹ پر ہے۔ اس کی فیملی ٹنڈو محمد خان میں ہے اور وہ نوکری کے سلسلے میں کراچی۔ امی ابو کے علاوہ اس کے گھر میں ایک چھوٹی بہن ہے جو بی اے کر رہی ہے۔ بڑی دونوں بہنوں کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ طیب طاہر کے چار چچا' دو پھپھو' دو ماموں اور تین خالائیں ہیں۔ ان کے بچوں کا تفصیلی تعارف بھی وقتاً"فوقتاً" پیش کیا جاتا تھا' یہ اور بات کہ بلیو مون کو یاد رہا ہو یا نہ.....

طیب طاہر گھر میں زیادہ تر وقت کمپیوٹر کے آگے گزارتا ہے اور اگر کرکٹ کا موسم ہو تو وہ ٹی وی کے آگے بھی بیٹھ جاتا ہے کیونکہ میچ اسے بتیس انچ سے کم کی اسکرین پر دیکھنے میں مزا نہیں آتا۔ اس کو لباس میں شلوار قمیص پسند ہے۔ کھانے میں پلاؤ کے ساتھ کباب کی ہر قسم پسند ہے۔ پزا بھی پسند ہے' مگر نوڈلز اسے یوں لگتے جیسے سویوں کو نمکین کر کے کھا رہے ہوں۔ طیب طاہر ہر اجتماعی بات میں بھی اپنی فیملی' اپنے شہر کا ذکر لے آتا جبکہ بلیو مون نہایت ذاتی بات کو بھی اجتماعی رخ دے دیتی۔

وہ بلیو مون کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا جب سجیل اور بسمہ چلے آئے۔ بسمہ کے ہاتھ میں ڈونگا دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اور وہ مزید خوش اخلاق ہو گیا۔ بسمہ نے اسے گھورتے ہوئے ڈونگا اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

"پھوپھو کو لگتا ہے کہ ہم ان کے لاڈلے کا خیال نہیں رکھتے۔ یہاں لاڈلے کو توفیق نہیں ہوتی کہ گھر کا چکر لگا لے۔"

"چائے بناؤ۔" سجیل نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔ اس کو طعنہ مارا اور ساتھ ہی فرمائش کم حکم زیادہ دیا۔

"چائے بناؤ۔" طیب نے فرمائش آگے پاس کی۔ بسمہ اسے گھورتے ہوئے اوپر کچن میں چلی آئی۔

چائے بنانے کے ساتھ ساتھ اس نے کچن صاف کرنا شروع کر دیا جس میں کم سے کم گھنٹہ درکار تھا۔ اس نے سارا پھیلاوا سمیٹا اور سب برتن دھوئے۔ جو دھلے ہوئے تھے' ان کو بھی دوبارہ دھویا۔ اس کی طبیعت میں بہت نفاست تھی اور وہ بہت صفائی پسند تھی۔ اس لیے ہفتے میں ایک دفعہ تو وہ اس کے فلیٹ میں آ کر ماسیوں والے سارے کام کر جاتی تھی۔

"بسمہ! تمہارے امتحان ہو گئے؟" طیب نے ٹی وی سے نظریں ہٹائے بغیر اس سے پوچھا۔

"جی! ہو گئے ہیں۔ پہلے تو توفیق نہیں ہوئی پوچھنے کی۔ پتا تھا ناں کہ انگلش پڑھانی پڑ جائے گی۔"

"ارے! یاد آیا..... مجھے تو تمہیں پڑھانا تھا۔" اس نے اپنے سر پہ ہاتھ مارا۔ بسمہ دانت پیس کر رہ گئی۔

"کمپیوٹر سے فرصت ملے تو کچھ اور یاد رہے نا۔"

"کہاں بھئی..... میرے کمپیوٹر کو الزام نہ دو۔ نوکری نے پھنسایا ہوا ہے۔ کیسے ہوئے پیپر؟"

"اللہ کا شکر ہے۔ بہت اچھے۔"

"نوکری کا ارادہ ہے۔" نظریں اس کی اسکرین پر ہی تھیں' جہاں سجیل نے ایک فیشن شو لگا رکھا تھا۔

"موڈ تو ہے..... رزلٹ آئے تو۔" اس نے کچن کی صفائی سے مطمئن ہونے کے لیے بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

"اگر میں تمہیں تمہارے رزلٹ آنے سے پہلے ہی ایک اچھی جاب آفر کر دوں تو....."

"رئیلی..... کون سی جاب؟ کہاں ہے؟ کیسی ہے؟" وہ پرجوش ہو کر ان کے قریب چلی آئی۔

"میرے گھر میں ویکینسی ہے ماسی کی..... اگر کک کی ڈیوٹی نبھانا چاہو تو تنخواہ ڈبل اور اگر سویپرس (بھنگن)....."

سجیل ہنسنے لگا۔ بسمہ نے غصے میں آ کر کرسی اٹھائی اور ٹی وی کے سامنے لا کر اس پہ بیٹھ گئی۔ دونوں چلاتے رہ گئے۔ آدھی اسکرین کے سامنے وہ جمی ہوئی تھی۔ مگر بسمہ نے وہیں بیٹھ کر ہی اپنا چائے کا کپ آرام سے ختم کیا۔

✡ ✡ ✡

"خواتین! کل اسٹیٹکس کا ٹیسٹ ہے اور ہمیں کچھ نہیں آتا۔" سمیعہ نے چاٹ کے جو نوالے ان کے منہ میں تھے۔ وہ بھی حلق سے اتارنے دوبھر کر دیے۔

"بھئی! اب سر ظفر پڑھاتے ہی ایسا ہیں تو کیا کریں؟" ردا نے کچھ بھی نہ آنے کی ذمہ داری اپنے ناتواں کندھوں سے اتار کر استاد محترم پہ ڈال دی۔

"سمیعہ! ہزار بار کہا ہے ہمیں "خواتین" جیسے ہولناک لفظوں سے مت پکارا کرو۔" سنّی کو لفظ "خواتین" نے ہی اتنا صدمہ پہنچایا کہ وہ آگے بڑھ اور سن نہ پائی۔

"ٹیسٹ کا مسئلہ جوں کا توں ہے دوشیزہ!" اس نے اپنی لغت سے سنّی کے اطمینان کے لیے دوسرا لفظ نکالا۔

"بھئی! فکر کیوں ہو۔ دُجانے ہے نا..... اس کی اسٹیٹکس اچھی ہے۔ اسی سے پڑھ لیں گے۔" ردا نے مسئلے کا حل پیش کیا۔

"محترمہ! بھول جاؤ اس دُجانے عثمان کو' جس نے فرسٹ ایئر میں ہمیں "سی" اور "اکاؤنٹنگ" بڑی خوش اخلاقی سے پڑھائی تھی۔ اب تو بے عزتی کر کے رکھ دیتا ہے۔" سمیعہ نے ماہم کی پلیٹ میں سے آلو نکال کر اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اس نے ایسی جرات کب کی؟" سنّی کو جوش آیا۔

"کہا تھا کل میں نے اس سے کہ ہمیں ٹیسٹ کی تیاری کرا دے۔ کہنے لگا جب تم لوگوں کو کچھ آتا جاتا نہیں ہے تو آرام سے گھر بیٹھ کر پرائیوٹ بی اے کرو۔ آئی ٹی ڈپارٹمنٹ میں کیا کر رہی ہو۔"

"کیا.....؟ ایسا کہا اس چھچھوندر نے۔" سنّی چیخی۔

"خبیث نہ ہو تو۔" ردا نے پلیٹ سامنے پڑی میز پر پٹخی۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے اتنے سنہری القابات سے کیوں نوازا جا رہا ہے۔" ہاتھ میں سموسہ پکڑے وہ جن کی طرح حاضر ہوا۔

"تمہیں ہمت کیسے ہوئی' ہمیں نالائق کہنے کی؟ اسائنمنٹ تو تم ہماری کاپی کرتے ہو۔" سنّی کو تو بہت ہی غصہ چڑھ گیا۔

"ہمیشہ نہیں..... کبھی کبھی۔" اس نے تصحیح کی۔

"اور رزلٹ میں مارکس بھی ہمارے تم سے زیادہ آتے ہیں۔" سمیعہ نے یاد دلایا۔

"صرف تھیوری میں..... پروگرامنگ میں میرے مقابل آؤ تو میں مانوں۔" اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"اچھا..... چلو اب زیادہ نخرے نہیں دکھاؤ..... اسائنمنٹ میں ہم تمہاری ہیلپ کرتے ہیں۔ ٹیسٹ میں تم ہماری کرو۔" سمیعہ کو ٹیسٹ کا مسئلہ بھی تو حل کرنا تھا۔

"ٹھیک ہے! مگر ایک شرط پہ....."

"اب وہ کیا ہے۔" سمیعہ نے چڑ کر پوچھا۔

"تم لوگوں نے جو چھچھوندر اور خبیث جیسے سنہری القابات سے میری شان میں گستاخی کی ہے۔ اب اس کے مداوے کے طور پر آج سے تم سب مجھے "سر" کہو گی اور مجھے جہاں دیکھو گی' وہیں سیلیوٹ مارا کرو گی۔" اس نے چاکلیٹ کا ریپر اتارتے ہوئے شرائط نامہ پیش کیا۔

"ظل الٰہی! اگر آپ حکم فرمائیں تو آپ کی خدمت میں جھک کر تعظیم بھی بجا لائیں گے۔" ردا نے دانت پیسے۔

"شاباش کنیز! تمہاری تابعداری کے عوض تم سے اور تمہاری سہیلیوں سے سیلیوٹ مارنے کی شرط بھی واپس لی جاتی ہے۔ بس اب تم لوگوں کو مجھے سر کہہ کر پکارنا ہو گا۔" اس نے احسان عظیم فرمایا۔

"کیا ہے دُجانے.... اتنے نخرے کیوں دکھا رہے ہو؟" ردا جھنجھلائی۔

"نخرے کب کر رہا ہوں۔ "سر" ہی تو پکارنے کو کہہ رہا ہوں۔ کوئی "شمس العلما" کا خطاب تو نہیں مانگ رہا۔" یوں ہی آج چھوڑ دینے کا ارادہ نہیں تھا اس کا۔ بدلہ تو لینا تھا۔

"ہم تو تمہیں "سر" نہیں کہیں گے۔" لڑکیوں کی انا کا مسئلہ تھا۔

"ٹھیک ہے مگر یاد رکھنا! کل اسٹیٹکس کا ٹیسٹ ہے۔" وہ بھی بڑا بلیک میلر تھا۔

"تم بھی یاد رکھنا! پرسوں جاوا کا اسائنمنٹ جمع کرانے کی آخری تاریخ ہے۔ اگر تم ہمیں نہیں پڑھاؤ گے تو ہم بھی تمہیں اسائنمنٹ نہیں دیں گے۔" سمیعہ نے دھمکی دی۔

"مت دینا.... میں ماہم سے لے لوں گا۔" اس نے بہت اطمینان سے کہا۔ ابھی تک خاموش بیٹھی ماہم اس کے منہ سے اپنا نام سن کر چونک سی گئی۔ باقی سب کے منہ سے مختلف آوازیں نکلیں۔

"ماہم بھی تمہیں نہیں دے گی۔" مسّی نے فوراً کہا۔

"ماہم دے گی.... آخر کو ایک احسان ہے میرا اس پہ...."

"شرم کرو! احسان کر کے جتاتے ہو۔" سمیعہ نے احساس دلانے کی کوشش کی۔

"بس ایسا ہی ہوں۔" اس نے کندھے اچکائے اور درخت کے نیچے کھڑے حسام اور احمد کی طرف بڑھ گیا۔ ماہم لب کاٹ کر رہ گئی۔

"دماغ خراب نہیں ہے ہمارا کہ اس صاجزادے کو "سر" کہیں۔ ہم آفاق سے ہیلپ لے لیتے ہیں۔" سسّی کا مشورہ کسی کو پسند نہ آیا۔ آفاق محنتی اور لائق ہونے کے باوجود ان کی گڈ بک میں نہ تھا' وجہ اس کی حد درجہ خود پسندی تھی۔

"چلو پھر دُجانے کو ہی "سر" بناؤ۔ سر ظفر نے مڈ ٹرم میں فیل کر دیا تو اوور آل رزلٹ پر کتنا برا اثر پڑے گا۔" سمیعہ نے مصالحت اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔

"ہاں تو کیا ہے' کہہ دیں گے۔ "سر" اسے۔ ویسے بھی ضرورت کے وقت گدھے کو "سر" تو کیا.... باپ بھی بنانا پڑتا ہے۔" ردا نے دُجانے کی بات ماننے کی خوب دلیل پیش کی۔

"ویسے گدھا اتنا ہینڈسم ہو تو اسے سر یا باپ نہیں کچھ اور ہی بنانے کو جی چاہتا ہے۔" سمیعہ کے جملے پہ سب ہی ہنس دیے۔ ماہم کی نظریں بے اختیار ہی دُجانے کی طرف اٹھیں۔

بدرنگ جینز کے ساتھ بلیک ٹی شرٹ پہنے رف سے حلیے میں بھی وہ غضب کا بندہ لگ رہا تھا۔

اسی لمحے دُجانے نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ اس نے فوراً" نگاہیں جھکا کر رخ تھوڑا موڑ لیا۔ دُجانے کے ہونٹوں پہ بھرپور مسکراہٹ بکھر گئی۔

"سر.... سر۔" ردا نے اسے وہیں سے پکارا۔

ماہم فوراً" ہاسٹل جانے کے لیے اٹھ گئی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ شام میں سامنے والے ونگ کی ندا سے مدد لے' لے گی' مگر دُجانے عثمان کے ایک اور احسان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔

"تم لوگوں کو تمیز بھی مجھے ہی سکھانی پڑے گی۔ دور سے یوں صدائیں لگا رہی ہو جیسے سر کو نہیں' پیون کو.... تم کہاں جا رہی ہو' تمہیں میری شاگردی نہیں اختیار کرنی کیا؟" ماہم کو جاتا دیکھ کر وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر اس سے پوچھنے لگا۔

"نہیں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا اور سب لڑکیوں کے روکنے کے باوجود رکشے کو اشارے سے روکا اور اس میں بیٹھ کر چلی گئی۔ دُجانے زیر لب مسکرا دیا۔

✡ ✡ ✡

"طیب! پلیز میری مدد کریں۔" بلیو مون نے آن لائن ہوتے ہی میسج بھیجا۔ اس سے پہلے کہ طیب پوچھتا' اس کا اگلا پیغام آ گیا۔

"میری دادو کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے۔ میرے پاپا لاہور گئے ہوئے ہیں۔ ہمارا فارم شہر سے بہت دور ہے۔ پلیز! کسی ڈاکٹر کو لے کر آ جائیں۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں۔"

"اوہ.... آپ اپنا ایڈریس اور فون نمبر دیں۔" طیب نے فوراً" ٹائپ کر کے بھیجا۔ کچھ دیر بعد ایڈریس اور فون نمبر اسکرین پر نمودار ہو چکے تھے۔

"آپ فکر نہیں کریں میں ڈاکٹر کو لے کر پہنچتا ہوں۔" طیب نے ایڈریس اور نمبر نوٹ کرنے کے بعد اسے تسلی دے کر کمپیوٹر بند کیا اور جلدی سے والٹ میں رقم ڈال کر باہر نکل آیا۔ اس کی گاڑی کا رخ ماموں کے گھر کی طرف تھا۔ راستے میں اس نے سجیل کو کال کی اور اسے تیار رہنے کو کہا۔ بسمہ نے اسے ٹیرس پر سے ہی دیکھ لیا تھا۔ اس نے ہاتھ بھی ہلایا۔ مگر اس نے ادھر دیکھا ہی نہیں۔ وہ بھاگ کر نیچے آئی تو سجیل بھی عجلت میں اپنا بیگ اٹھائے ہوئے نکلتا نظر آیا۔

"پتا نہیں' یہ طیب کس مشن پہ لے کر جا رہا ہے۔" اس نے کہا اور جلدی سے باہر آ گیا۔

"یار! ابھی ابھی تو پہنچا ہوں اسپتال سے۔ تھک گیا ہوں اور تجھے...."

"چپ کر کے گاڑی میں بیٹھو۔" طیب نے اسے مزید بولنے کا موقع نہیں دیا۔

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟ یہ بتاؤ گے یا مجھے سرپرائز دینے کا ارادہ ہے؟"

"سرپرائز.... وہ بھی ڈاکٹر کو۔" طیب کو ہنسی آ گئی۔ پھر اس کی صورت دیکھ کر سنجیدہ ہو گیا۔ "میری ایک آن لائن فرینڈ کو ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

"وہ بیمار ہے کیا؟"

"نہیں! اس کی دادی بیمار ہیں۔"

"یار! یہ آدھی رات کو مجھ سے دادیوں کی مسیحائی مت کرایا کرو۔" اس نے جمائی لی۔ "بائے دا وے.... فرینڈ کا نام کیا ہے؟"

"بلیو مون۔"

"یہ تو نیٹ آئی ڈی ہے۔ رئیل نیم کیا ہے؟"

"رئیل نیم.... یہ تو مجھے پتا نہیں۔" وہ گڑبڑایا۔

"کیا....؟ مجھے اتار.... مجھے یہیں اتار۔" سجیل کو تپ چڑھی۔ "میرا کوئی موڈ نہیں بکرا بننے کا۔" اس نے چلتی گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔

"شرافت سے چلو۔" طیب نے آنکھیں نکالیں۔

"یار! تجھے کوئی بھی بے وقوف بنا لے اور تو بن جائے گا۔" سیدھا تو وہ ہو گیا' مگر اسے طیب پہ تاؤ آنے لگا تھا۔

"بلیو مون میرے ساتھ جھوٹ نہیں بول رہی' مجھے یقین ہے۔"

"ابے جس لڑکی کا تجھے نام تک نہیں پتا' اس پہ اتنا یقین؟"

"ہاں! ہے اتنا یقین۔" وہ چپ کر کے بیٹھ گیا مگر گاڑی ٹول پلازہ سے باہر نکلی تو پریشان ہو اٹھا۔

"جا کس جگہ رہے ہیں ہم؟"

"ایک فارم پر۔"

"اور یہ فارم کہاں ہے؟"

"کراچی سے باہر نکلو تو پونے سے ایک گھنٹہ لگے گا۔"

"ابے! دماغ خراب ہے تیرا۔ کسی نے تجھے رات کے اس پہر شہر سے باہر انجان جگہ پہ بلایا اور تو منہ اٹھا کر چل پڑا۔"

"کسی نے نہیں' بلیو مون نے بلایا ہے۔" اس کے انداز میں ابھی بھی اطمینان تھا۔

"دیکھ لے! یہ نیٹ فرینڈ شپ بڑی مہنگی بھی پڑتی ہے۔ بڑے بڑے دھوکے کھائے ہیں لوگوں نے۔ تو ثاقب کا قصہ بھول گیا ہے شاید۔" سجیل ہر دس منٹ بعد بوکھلا کر اسے خبردار کرنے بیٹھ جاتا۔ مگر طیب کا اطمینان قابل دید تھا۔

"مجھے بلیو مون پر پورا یقین ہے۔ وہ میرے ساتھ کوئی گیم نہیں کر رہی۔" اس لمحے سجیل کی چیخ نکلی تھی۔

"ابے سامنے دیکھ۔"

سجیل کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ طیب پہلے

ہی دیکھ چکا تھا اور اگلے لمحے اس کے رونگٹے بھی کھڑے ہو چکے تھے۔

سڑک کے دونوں اطراف کے کھیتوں سے ایک دم دو افراد نکل کر سامنے آئے تھے جن کے ہاتھ میں کلاشنکوفیں تھیں۔ وہ دائیں بائیں کھڑے ہو گئے اور گاڑی کے عین سامنے آکر ہتھیار تان لیے۔ طیب نے بریک لگائے۔ سجیل نے پیچھے دیکھا۔ وہاں بھی دو مسلح افراد کھڑے تھے۔ گھیرا مکمل تھا۔

"نیچے اترو۔" ایک مسلح ڈاکو گاڑی کی طرف آیا اور پاٹ دار آواز میں حکم دیا۔

"دیکھ! آگئی تیری بلیو مون۔" سجیل نے دانت کچکچائے اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔ طیب سکتے کی کیفیت میں تھا۔

✡ ✡ ✡

آج کے پیپر کے لیے وہ رات ایک بجے تک تیاری کرتی رہی۔ صبح نماز فجر ادا کرنے کے بعد سے جو نوٹس اٹھائے تو پھر ناشتے کا ہوش بھی نہ رہا۔ اس کی روم میٹ عابدہ نے زبردستی دو سلائس کے بیچ آملیٹ رکھ کر اس کے ہاتھ میں تھمائے اور چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا۔ ڈپارٹمنٹ آنے کے بعد بھی باہر کے لان میں بیٹھ کر وہ چاروں دوستیں جو پوائنٹس سمجھ میں نہ آئے تھے انہیں ایک دوسرے سے سمجھ رہی تھیں۔

"لڑکیو! مجھے کوئی اپنی کتاب دے دو یا نوٹس دے دو۔ مجھے پیپر کی تیاری کرنی ہے۔" پیپر شروع ہونے میں صرف بیس منٹ رہ گئے تھے جب دُجانے بھاگتا ہوا آیا۔

"سر! آپ کل کیا کر رہے تھے؟" ردا نے اسے گھورا۔

"بچہ! کل میرے دوست کے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اس کے پاس اسپتال رہا ساری رات۔"

ماہم نے اس کی طرف دیکھا۔ سرخ ہوتی آنکھیں اس کی نیند نہ پوری ہونے کی غماز تھیں۔ چہرے پہ بھی تھکن کے ہلکے سے اثرات تھے۔

"اپنے دوستوں سے جا کر لو۔" مسّی نے صاف انکار کیا۔

"لڑکے تم لڑکیوں کی طرح پاگل تھوڑی ہوتے ہیں کہ آخری وقت تک رٹے مارتے رہیں۔ وہ اپنی کتابیں کاپیاں گھر چھوڑ کر آتے ہیں۔"

"ایک تو ہم سے بک مانگ رہے ہو، اوپر سے ہمیں ہی پاگل کہہ رہے ہو۔ پھر بھی تمہیں لگتا ہے کہ ہم تمہیں اپنے نوٹس یا بکس دے دیں گے تو تم تو بہت معصوم ہو دُجانے!" سمیعہ نے آخر میں دانت پیسے۔

"نہ دو.... میں ماہم سے لے لوں گا۔" دُجانے نے اطمینان سے کہا اور ساتھ ہی اس نے ماہم کے ہاتھ سے نوٹس چھین لیے۔ وہ اس کی جرات پہ بھونچکا رہ گئی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ احسان ہے میرا ایک تم پر۔ احسان فراموش!" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

"ایک مسلمان ایک پاکستانی اور ایک کلاس فیلو ہونے کے ناطے تمہارا ابھی کچھ فرض بنتا ہے یا نہیں؟"

"ماہم! آج بتا ہی دو، کون سا احسان کیا ہے دجانے نے تم پر، جو اسے بھولتا ہی نہیں۔" مسّی کتاب ایک طرف رکھ کر تجسس سے بولی۔

"ماہم نہیں بتائے گی۔ یہ میرا اور اس کا راز ہے۔"

"تم جانتے ہو، جب کسی لڑکا لڑکی کے بیچ راز بننے لگیں تو کیا ہوتا ہے؟" مسّی کی بات پہ ماہم کا چہرہ سرخ ہوا۔

"کیا ہوتا ہے؟" وہ نوٹس پہ تیزی کے ساتھ نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ مسّی کچھ اور فضول بولتی، ماہم ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ان سب کے روکنے کے باوجود وہ اندر جا چکی تھی۔ دُجانے کی نظریں اب بھی نوٹس پہ تھیں۔ مگر ہونٹوں پہ غیر محسوس سی مسکراہٹ تھی۔

✡ ✡ ✡

"یہ تو بلیو مون نہیں، بلیک مون اور براؤن مون ہیں اور وہ سب سے بڑی مونچھوں والا ڈارک براؤن مون

اور وہ...."

"کیا بک بک کر رہے ہو۔" براؤن مون دھاڑتے ہوئے طیب کا موبائل اپنی جیب میں ڈالنے لگا۔ موبائل اسی وقت بج اٹھا۔

"بلیو مون کا ہوگا۔ بتا دو! واردات کامیاب ہو گئی ہے۔" سجیل نے بُت بنے طیب کی طرف دیکھتے ہوئے دانت پیسے۔ براؤن مون اس کی بات پہ توجہ دیے بغیر موبائل کو آف کر دینے کے چکروں میں تھا۔

"تیری بک بک میرے کو سمجھ نہیں آئی۔" بلیک مون اس کی طرف بڑھا۔

"جی کچھ نہیں.... میں پوچھ رہا تھا، آپ میں سے بلیو مون کون سی ہے؟" ڈارک براؤن مون نے اپنی لال سرخ آنکھیں اس پہ گاڑیں تو وہ گڑبڑا گیا۔

"نہیں موڈ بتانے کا تو نہ بتائیں۔ واپسی کا کرایہ تو دے دیں۔" ڈارک براؤن مون نے اسے گھورا۔ بلیک مون نے جیب سے بیس روپے نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمائے۔

"بیس روپے میں اپنے گھر کیسے پہنچیں گے؟"

"کہو تو مفت میں اوپر پہنچا دیں۔" ڈارک مون کا ہاتھ اپنی کلاشنکوف کی طرف بڑھا۔

"نہ نہ.... بیس روپے ہی ٹھیک ہیں۔"

"یہاں سے کوئی ٹریکٹر ٹرالی پکڑ لینا یا کسی ٹرک پہ چڑھ جانا، کراچی پہنچ جاؤ گے۔ ویسے پولیس کی موبائل بھی جائے گی کلاک (گھنٹے) آدھے کلاک تک۔ چاہو تو اس پہ چلے جانا۔" بلیک مون بڑا ہی نیک ڈاکو تھا۔ اس کے نیک مشوروں سے سجیل کو یہ ہی لگا۔ وہ کڑھ کر رہ گیا۔

"چھوڑو بھائی! تم لوگوں نے کچھ چھوڑا ہوتا تو پولیس کو ملتا۔ ایسے کیسے لفٹ دیں گے وہ ہمیں۔"

"تن پہ کپڑے چھوڑے ہیں ہم نے۔" براؤن مون موبائل آف کر کے جوش سے اس میں اپنی سم لگا چکا تھا اور اب دوبارہ اسے آن کرتے ہوئے ان کی طرف آیا اور کلاشنکوف کو تھپتھپاتے ہوئے اپنا احسان جتایا۔

"اپنی عزت بڑی عزیز ہے ہمیں۔ پیدل چلے جائیں گے۔" سجیل نے طیب کو کھینچ کر چلانا چاہا۔

"ٹھہرو...." براؤن مون اپنی بندوق ان پہ تانتے ہوئے دھاڑا۔ ان کا خون خشک ہو گیا۔ سجیل بمشکل پلٹا۔

"اس میموری کارڈ میں جلال چانڈیو کے گانے تو ہیں نا۔"

سجیل نے طیب کی طرف دیکھا۔ مگر وہ اپنے حواس میں کہاں تھا کہ کوئی جواب دیتا۔

"یہ کوما میں چلا گیا ہے کیا.... اس کو آئی سی یو میں جمع کرا دینا۔" ڈارک براؤن مون کو اس کے بارے میں تشویش ہوئی۔ سجیل نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو بھلا میرے کو جلال چانڈیو کا نیا والیوم ڈاؤن لوڈ کر کے دے۔" طیب کا موبائل براؤن مون نے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے معصوم سی فرمائش کی۔

"اوہ.... اللہ لوک! پولیس آجائے گی۔" بلیک مون نے پریشانی ظاہر کی۔ سجیل پہ پہلی بار انکشاف ہوا کہ ڈاکو بھی "اللہ لوک" ہوتے ہیں۔

"آنے دو پولیس کو۔ میں نے اپنا یہ موبائل ان کے لیے رکھ لیا ہے۔" براؤن مون نے بے نیازی سے اپنا پرانا موبائل لہراتے ہوئے بلیک مون کو مطمئن کیا۔

"ہاں! پر اس کے ساتھ وہ چھوٹا منشی ہوا تو موبائل نہ لے گا، کار لے گا۔" براؤن مون کو جلال چانڈیو کی قربانی دینی پڑی۔ وہ فوراً گاڑی کی بڑھا۔

"اگر ہماری گاڑی پہ ہمیں لفٹ دے دیتے تو ہم دعائیں.... نہیں، نہیں بس ٹھیک ہے! گاڑی پر اب صرف آپ کا حق ہے۔ ہم پیدل چلے جائیں گے۔" ڈارک براؤن مون کی سرخ آنکھیں اور دو گز کی مونچھیں ہی کافی تھیں جان نکالنے کے لیے۔

"دیکھ لیا اپنی بلیو مون کو.... مجھے بلیو مون پر پورا یقین ہے۔ وہ میرے ساتھ کوئی گیم نہیں کر رہی۔ پھولن دیوی نہ ہو تو۔" اس پہ برستے ہوئے وہ ہر گزرتی گاڑی کو ہاتھ دینے لگا۔ مگر اس وقت کوئی بھی گاڑی

روکنے کی غلطی کیسے کر سکتا تھا۔

"دیکھو... کوئی تمہاری طرح الو کا پٹھا نہیں ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنا نقصان کروالے۔" سجیل کا بس نہ چل رہا تھا کہ اسے پکڑ کر کسی چلتی گاڑی کے آگے دھکا دے' دے۔ آخر وہ دونوں پیدل ہی کراچی کی طرف منہ کر کے چلنے لگے۔

✡ ✡ ✡

کوڈنگ میں کچھ تبدیلی کر کے ماہم نے مطمئن ہو کر پروگرام کو ترتیب دیا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسکرین پر پھر تین غلطیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔

"کیا مصیبت ہے۔" وہ جھنجلائی۔

"کیا میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں؟" اس آواز پر اس نے گردن ذرا سی موڑ کر دائیں طرف دیکھا۔ دُجانے کب اس کے ساتھ والے کمپیوٹر پر آکر بیٹھا' اسے خبر ہی نہ ہوئی۔

"رہنے دیں۔ آپ کے مزید احسانات کے بوجھ تلے دبنا نہیں چاہتی میں۔"

"کیسا احسان... یہ تو ایک مسلمان' ایک پاکستانی اور ایک کلاس میٹ ہونے کے ناطے میرا فرض ہے۔" وہ اپنی مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ تپ کر کوئی اور جواب دیتی اس کا موبائل تھرا اٹھا۔ اسکرین پہ جو نام ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر یہ کال اٹینڈ کرنے کا قطعا" جی نہ چاہا۔ مگر جانتی تھی کہ اگر بابا کی کال مس ہو گئی تو وہ خود یہاں پہنچ جائیں گے۔ حالانکہ اس کا ٹائم ٹیبل اس سے زیادہ انہیں یاد تھا اور وہ جانتے بھی تھے کہ اس وقت اس کی لیب ہے۔ اس نے بے دلی کے ساتھ موبائل کان سے لگایا۔

"جی بابا... مگر بابا... لیکن بابا۔" اس کی نہایت دھیمی آواز میں کی جانے والی گفتگو اس سے زیادہ بڑھ نہ پاتی۔

"بابا! پلیز آپ میری بات تو سنیں۔" پوری گفتگو میں یہ اس کا پہلا طویل جملہ تھا۔

"بابا! آپ سمجھتے کیوں نہیں؟" دُجانے کو اس کی آواز بھیگی ہوئی سی لگی۔ وہ بے اختیار مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ لب کچلتے ہوئے دوسری طرف مخاطب کی بات سنتے ہوئے وہ بہت مضطرب سی لگ رہی تھی۔ یہ اضطراب اسے اپنے اندر اترتا محسوس ہوا۔

"دیکھیں بابا... مگر بابا!" اس کو اسکرین دھندلی محسوس ہو رہی تھی اور اس سے زیادہ اپنی زندگی۔ جہاں کچھ بھی واضح نہ تھا۔

"اچھا بابا!" اس نے پست آواز میں کہا اور موبائل کان سے ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا۔

اس نے نامحسوس طریقے سے اپنی آنکھیں صاف کی تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے۔ سر عبدالرحمان کی لیب چھوڑ کر جانے پر اس کی اچھی خاصی کلاس لی جا سکتی تھی۔ مگر اس وقت اسے وہاں بیٹھنا بھی بہت مشکل لگ رہا تھا۔

"تمہیں ہاسٹل جانا ہے تو تم جاؤ میں سر کو بتا دوں گا۔" دُجانے نے بہت نرمی سے کہا۔ وہ ایک دم گردن موڑ کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں پھیلی نمی دُجانے کے اضطراب میں اضافہ کر گئی۔

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید ماہم اسے سخت جواب دیتی۔ مگر اس وقت اس کی سماعتوں کو اتنے ہی نرم لہجے کی ضرورت تھی۔ اسے اتنے ہی پروا کرنے والے ایک ہمدم کی خواہش تھی۔ اس نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا بیگ اور فائل لے کر اس نے دُجانے کی طرف دیکھا۔ اس نے تھوڑا سا کرسی کو آگے کر کے اسے نکلنے کے لیے جگہ دی۔ وہ اس کا "احسان" لے کر لیب سے باہر نکل گئی۔

سارا دن اس کا عجیب سی اداسی اور اپنی کم مائیگی کے احساس کے ساتھ گزرا۔ ردا بھی اسے ان کیفیات سے نکال نہ پائی۔ ویسے بھی وہ ذرا الگ مزاج کی تھی۔ اپنے فیشن' اپنی دنیا میں پوری تھی۔ ماہم کے لیے ایسے رشتے پہلے سے سوتیلے بہن' بھائیوں کی صورت میں موجود تھے۔ اس لیے اس کے ساتھ اس کی وہ ذہنی ہم

آہنگی پیدا نہ ہو سکی تھی۔ کل جب وہ اپنی ماں یا باپ کے گھر میں تھی' تب بھی وہ تنہا تھی۔ آج جب وہ سیکڑوں لڑکیوں کے درمیان رہ رہی ہے' تب بھی وہ تنہا ہے۔

رات جب وہ اپنی میلز چیک کرنے کے لیے اسپتال کے کیفے آئی تو اس کے ان باکس میں دُجانے عثمان کی ایک میل موجود تھی۔ وہ حیران نہیں ہوئی۔ کیونکہ ان کی کلاس کی گروپ میلز میں اکثر اس کی میل آئی ہوتی تھی۔ تھی تو یہ بھی گروپ میل ہی' مگر اس میں وہ پروگرام منسلک کیا گیا تھا جو کل ہر حال میں سر عبدالرحمان کو دکھانا تھا اور جس میں ماہم کی غلطیاں ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔ اس ایک میل نے اس کی سارے دن کی پژمردگی جادو کی چھڑی گھما کر غائب کر دی تھی۔

"کیسا احسان... یہ تو ایک مسلمان' ایک پاکستانی' ایک کلاس میٹ ہونے کے ناطے میرا فرض ہے۔" اس کے لبوں کو بے اختیار مسکراہٹ چھو گئی۔ دُجانے عثمان کا ایک اور احسان لے کر وہ مسکرا دی۔

✡ ✡ ✡

بسمہ' امی اور خالہ منورہ پریشانی کے عالم میں لاؤنج میں بیٹھی تھیں اور ابو ادھر سے ادھر چکر لگا رہے تھے۔ جب وہ دونوں کافی دیر تک واپس نہ لوٹے تو بسمہ نے پہلے سجیل کو اور پھر طیب کو فون کیا۔ دونوں کے نمبر بند جا رہے تھے۔ چھ' سات دفعہ اس نے یہی کیا اور ہر بار نمبر بند ہی ملا تو اس نے گھبرا کر امی' ابو کو جگا دیا۔

خالہ منورہ دور پار کے رشتے سے بسمہ کی خالہ تھیں۔ بے چاری بے اولاد بیوہ تھیں' اس لیے کبھی کسی رشتہ دار کے گھر اور کبھی کسی کے گھر پائی جاتیں۔ وہ بھی باہر سے آتی آوازوں کو سن کر باہر چلی آئیں اور اب صوفے پہ بیٹھی امی کو تسلیاں دے رہی تھیں۔

"تم فکر نہ کرو' آجائیں گے وہ دونوں واپس... ساری رات رفیقاں کے گھر والے نمبر ملاتے رہے۔ پر فون جائیں بند۔ ایسا برا ایکسیڈنٹ ہوا کہ رفیقاں کے ساتھ اس کی بہو بھی گزر گئی۔ تم دل پہ نہ لو۔ اللہ ان کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ ثم آمین۔" امی کے ساتھ سب کا دل دہلا کر ہاتھ اٹھا کر بڑے جذب کے ساتھ دعا مانگی۔ سب نے دل سے آمین کہا۔

"اصغر بھائی کا بیٹا تو جو گھر سے نکلا تو پھر واپس ہی نہ آیا۔ بوری میں بند لاش ملی۔ تم فکر نہ کرو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" امی کی رنگت بری طرح سے پھیکی پڑی تو وہ ان کا شانہ تھپکنے لگیں۔

"آپا! آپ جا کر سو جائیں۔" ابو جو فون پر اپنے کسی پولیس آفیسر دوست سے بات کر رہے تھے' انہوں نے کان سے موبائل لگاتے ہوئے کہا۔

"کیسی بات کرتے ہو فضل الرحمان! مجھے یوں بھلا نیند آنی ہے کیا؟" آپا خاصا برا مان گئیں۔

ابو نے اپنے ایک کزن کو فون کیا تھا جن کے ساتھ انہیں اب پولیس اسٹیشن جانا تھا۔ مگر ان کے کزن کے آنے سے پہلے وہ دونوں لٹے پٹے پہنچ گئے۔ بسمہ چیخ مار کر سجیل سے لپٹ گئی۔ امی' ابو نے ان دونوں کو خوب پیار کیا۔ امی کا پیار طیب کی طرف ذرا کم ہی رہا۔ کیونکہ وہی اتنی رات کو ان کے بیٹے کو لے کر نکلا تھا۔ ان دونوں کی شکلوں اور چال سے پتا لگ رہا تھا کہ لٹ کر آئے ہیں۔ سجیل نے اندر صوفے پہ بیٹھ کر پانی پی کر امی کی گود میں سر رکھ کر ساری داستان سنائی۔ (صرف لٹنے کی' بلیو مون کا ذکر حذف۔)

"انہوں نے ہم سے رقم' موبائل' گاڑی سب چھین لیا۔"

"شکر اللہ کا۔" امی' ابو کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ منورہ خالہ کی آنکھیں آدھی باہر نکل آئیں۔

"جان بچ گئی۔"

ثابت ہوا کہ امی' ابو کراچی کے رہنے والے تھے۔ جو چیز چلی گئی اس کا غم نہیں کرتے۔ جان بچ گئی اس کی خوشی مناتے ہیں۔

منورہ خالہ کی آنکھیں اپنی نارمل پوزیشن پہ آگئیں۔

"ہاں بھئی! اب آپ آرام کریں۔" بسمہ فورا" بولی۔

کیمپس، جامشورو اور حیدر آباد تو کیا، اپنے شہر میں بھی اسے کوئی بلیک ہونڈا سوک نظر آجاتی تو اس کی نظریں بے اختیار ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بندے کی طرف اٹھتیں اور پھر اکثر مایوس ہو کر پلٹتیں۔

سبزی لینے کے بعد ماہم مرغی خانے کی طرف آگئی تھی۔

"صالحہ! میرا دل چاہ رہا ہے تمہارے ہاتھوں کی بریانی کھانے کو۔" اس نے تین کلو مرغی کا گوشت اور اسٹور سے باقی مسالا جات لے لیے۔

صالحہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اس کے نہ، نہ کرنے کے باوجود اکثر ایسا ہی کرتی تھی۔ اچانک ہی اس کا کڑاھی، بریانی کھانے کو جی چاہنے لگتا تھا اور وہ اتنا مرغی کا گوشت لے لیتی تھی کہ اگلے ایک ہفتے کے لیے وہ سوڈانی نجلا کے فریج میں رکھوا کر چل سکتا تھا۔

واپسی پہ پھر اس کی نظریں سڑک پہ بھاگتی دوڑتی کئی گاڑیوں میں سے ایک کی تلاش میں تھیں۔

٭ ٭ ٭

غیروں کے ہاتھ بندہ ذلت اٹھائے تو شاید اتنی شرمندگی نہ ہو، جتنی اپنوں کے ہاتھ ذلیل ہو کر ہوتی ہے اور ماہم نور تو ہمیشہ ان ہی دو بے حد اپنوں کے ہاتھ ذلیل ہوتی آئی تھی۔ تکلیفیں اور رنج اٹھاتی اور تمسخر بنتی آئی تھی۔

ماہم کی نگاہیں اس وقت زمین کی سطح پہ تھیں۔ مگر وہ جانتی تھی کہ ارد گرد طلبا کا ایسا جمگھٹا بھی ہوگا جن میں سے کچھ منہ اٹھا کر اس طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ کچھ بظاہر اپنا کام کر رہے ہوں گے، مگر متوجہ اسی طرف ہوں گے۔ کچھ کی نظروں میں ترحم ہوگا، کچھ کی تمسخر۔ پہلی بار اس کا بھرم یوں سرعام مٹی میں نہ مل رہا تھا۔ اس کے اسکول و کالج میں بھی ایسے کئی تماشے ہو چکے تھے۔ گھر کے دروازے تو ایک دوسرے کے لیے بند تھے۔ انہیں یہی جگہ ملتی تھی آمنے سامنے ہونے اور یہ جتانے کے لیے کہ ماہم جیسی بے جان گڑیا پہ ان کا حق بھی ہے۔

آج بھی ان دونوں نے سر راہ اس کا تماشا بنا رکھا تھا۔ ایک طرف کرنل عبدالمجید اور دوسری طرف ندرت جہاں آرا۔ دونوں کے خاندانوں میں ایک ہی تاریخ پہ تقریبات آگئی تھیں۔ دونوں ماہم کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ دونوں اس وقت ایک دوسرے کے ساتھ ایسی زبان استعمال کر رہے تھے کہ لگتا نہ تھا کہ ایک بہت قابل، بہت مہذب آرمی آفیسر ہے اور دوسری نفسیات کی وہ پروفیسر ہے، جس کے پاس پی ایچ ڈی کی ڈگری ہے اور جس کے "اولاد کی تربیت" پہ کالمز ایک ماہ نامے کی زینت بنتے ہیں۔

"تم چاہتے ہو تمہارا سر اونچا ہو جائے کہ ماہم ندرت جہاں آرا کے بھتیجے کے ولیمہ کو چھوڑ کر کرنل عبدالمجید کی بھانجی کی منگنی میں آئی ہے۔"

"ہاں! کرے گی ماہم میرا سر اونچا۔ آخر حق ہے میرا اس پر۔"

"میں ماں ہوں، میرا حق تم سے زیادہ ہے۔"

"کون سا حق؟ سات ماہ کی عمر میں اسے پھینک کر چلی گئیں اور اب....."

"تم نے صرف اس کی کتابوں کے خرچے اٹھائے ہیں۔ اس کا بینک بیلنس تو ندرت جہاں آرا ہی ہے۔"

ماہم کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ اسے لگا کہ اگر مزید یہاں کھڑی رہی تو گر جائے گی۔ اس نے ہمت کر کے کچھ قدم اٹھائے اور آمنے سامنے کھڑے ماں اور باپ کی گاڑیوں کے بیچ میں سے نکل کر رکشے میں بیٹھ گئی۔

٭ ٭ ٭

بلیو مون سے اس کی دوستی انٹرنیٹ پر اتفاقیہ ہوئی تھی۔ اس کو ای۔ بینکنگ کے حوالے سے کچھ مدد چاہیے تھی تو وہ ایک چیٹ روم میں اپنا سوال لے کر پہنچ گیا۔ دو لوگوں نے اس کی مدد کی۔ جس میں سے ایک بنگالی لڑکا تھا اور ایک بلیو مون تھی۔ پھر اس نے دونوں کو اپنے میسنجر سے فرینڈ شپ ریکویسٹ بھیجی

"بسمہ! چائے اور پکوڑے ہی بنا دو۔" نڈھال سے سجیل کی فرمائش پر بسمہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"ہاں ہاں جاؤ بسمہ! بھائی کہہ رہا ہے، بنا لاؤ۔" امی نے پیار سے اپنے سپوت پہ نگاہ کی۔

"بھائی! موت کے منہ سے نکل کے آیا ہے، قدر کرو اس کی۔" خالہ جی بھی اٹھتے اٹھتے سجیل کی ہم نوا ہوئیں۔

ان کے جانے کے بعد بسمہ کچن میں چلی آئی۔ سجیل کی فرمائش پوری کرنے کے ساتھ ساتھ طیب کے لیے کباب بھی فرائی کر لیے۔ اس کو پسند تھے نا۔

اس کے دل کی دھڑکن ابھی تک معمول پہ نہ آئی تھی۔ ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں اور ہاتھوں میں بھی ہلکی لرزش باقی تھی۔ وہ دونوں کس مشکل سے بچ کر آئے تھے۔ دونوں سے رشتے بہت مختلف تھے اور دونوں ہی اسے بہت عزیز تھے۔ وہ ابھی بھی ان گھڑیوں کے بارے میں سوچتی جن سے وہ دونوں گزر کر آئے تھے تو آنکھیں لبالب بھرنے لگتیں اور وہ رب کا شکر بجا لاتی جو حفیظ تھا۔

وہ جب ٹرے سجا کر لاؤنج میں آئی تو سجیل ہنس رہا تھا، جبکہ طیب یوں ہی خلاؤں میں گھور رہا تھا۔

"کباب صرف دو تھے اور یہ طیب کے لیے ہیں۔" اس نے سجیل کو پہلے سے خبردار کیا کہ وہ اپنی نیت کبابوں پہ بھی خراب نہ کر لے۔

"اس کے لیے کباب کیوں لے کر آئیں؟ اب یہ سولہ سال صدمے سے باہر نکلنے والا نہیں۔" سجیل نے سیدھے ہوتے ہوئے ایک پکوڑا منہ میں ڈالتے ہوئے گل افشانی کی۔

"خدا نہ کرے! طیب گاڑی کی فکر نہ کرو..... وہ جس کی تھی، وہ ابھی یہاں نہیں۔ اس کے آنے تک کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔ موبائل یا پیسوں کا بھی کیا ہے، آنی جانی شے ہیں۔ تم ان کا غم کیوں کر رہے ہو۔"

"غم ہی یہی ہے کہ غم گاڑی، پیسے یا موبائل کا نہیں، غم تو دل کا ہے۔" سجیل پھر ہنسا۔

"کیا مطلب؟"

سجیل نے بسمہ کو پوری کہانی بلیو مون کے ذکر کے ساتھ مرچ مسالے لگا کر سنائی۔ بسمہ تاسف کے ساتھ طیب کی طرف دیکھتی رہی۔

"تم نے ایک لڑکی پر اتنا یقین کیسے کر لیا، جبکہ تم اس کو جانتے تک نہ تھے؟"

"جانتا تو ہے بے چارہ۔ اس کی نیٹ فرینڈ ہے۔" سجیل پکوڑا منہ میں ڈالتے ہوئے خباثت سے بولا۔ بسمہ کا پارہ مزید اوپر اٹھا۔

"ویسے بسمہ! صنف نازک کو جانو نہ جانو، اس پہ یقین کرنے کو دل تو چاہتا ہے نا۔" سجیل مسکینی سی صورت بنائے آفاقی سچ بیان کر رہا تھا۔

"ہاں! چاہے وہ کیسی ہی دھوکے باز اور فراڈن کیوں نہ ہو۔" بسمہ نے دانت پیسے۔

"بلیو مون ایسی نہیں ہے۔" طیب کا سکتہ ٹوٹا اور منہ سے جو جملہ نکلا وہ کم و بیش ویسا ہی تھا، جیسا واردات سے قبل۔ سجیل سر تھام کر رہ گیا اور بسمہ کے تو تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔

٭ ٭ ٭

اس سال فائنل کر کے جا چکنے والی عابدہ کی جگہ صالحہ ان کے کمرے میں آئی تھی۔ اپنی اچھی عادات کی وجہ سے جلد ہی وہ اپنی تینوں سینئر روم میٹس کے ساتھ سیٹ ہو گئی تھی۔ اس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ میس کا ماہانہ بل وہ ادا نہ کر سکتی تھی۔ اس لیے اپنی کوکنگ خود ہی کرتی تھی۔ سوسائٹی سے وہ دو، تین دن کی سبزی لے آتی تھی اور باقی سامان تو اکثر وہ گھر سے ہی لے کر آتی تھی۔ وہ ماہم کا خیال رکھتی تھی تو ماہم اس سے بھی بڑھ کر اس کا خیال رکھتی تھی۔

آج شام وہ دونوں سبزی لینے سوسائٹی آئی ہوئی تھیں۔ صالحہ جب سبزی میں بھاؤ تاؤ کر رہی تھی تو اس کی نظریں سڑک پہ دونوں اطراف گھوم رہی تھیں۔ سیاہ ہونڈا سوک کی تلاش اسے اب ہر جگہ رہتی تھی۔

تھی جو بنگالی انجینئر نے تو فوراً" قبول کرلی تھی اور بلیو مون نے ایک ہفتے بعد۔ بعد میں اسے اندازہ ہوا کہ وہ آن لائن ہی بہت کم ہوتی تھی اور جب بھی ہوتی تھی تو ان دونوں کے بیچ بہت مثبت بات چیت ہوتی۔

اسے ابھی تک یقین نہ آیا تھا کہ بلیو مون اس کو دھوکا دے سکتی ہے یا وہ کسی گینگ کا حصہ ہے۔ بلیو مون ڈاکوؤں کی ساتھی کیسے ہو سکتی تھی۔ وہ تو حق کی سچ کی بات کرتی تھی۔ وہ تو ایک آنے کی چوری کے بھی خلاف تھی۔ پھر وہ ڈاکا کیسے ڈال سکتی تھی' وہ کہتی تھی۔

"چوری لاکھ کی ہو یا ایک تنکے کی' چوری' چوری ہی ہوتی ہے۔" بلیو مون اتنے پیارے انداز میں نصیحت کرتی کہ سننے والے کا خود عمل کرنے کو جی چاہتا اور طیب کے اندر بہت سی اچھی تبدیلیاں اس سے دوستی کے بعد آئی تھیں۔ وہ کہتی تھی۔

"طیب طاہر! آپ جانتے ہیں' میں نے آپ سے دوستی کیوں کی..... آپ کی نام کی وجہ سے۔ میری دادو نے مجھے سب سے پہلے کلمہ سکھایا تھا۔ پہلا کلمہ طیب' طیب معنی پاک۔ مجھے لگتا ہے دنیا میں ہر طیب پاک ہوتا ہوگا۔"

اور طیب طاہر شرمندہ ہو کر رہ جاتا۔ وہ عام لڑکوں کی طرح لاپرواسا لڑکا تھا۔ بہت سی بشری کمزوریاں اس کے اندر تھیں مگر بلیو مون کی نصیحتوں اور یقین سے اس کے اندر کئی پاک تبدیلیاں آئیں۔ وہ نمازوں میں ناغہ کر جاتا تھا۔ مگر اس نے تو اسے پنج وقتہ نمازی بنا دیا تھا۔ وہ روزے رکھنے میں ست تھا۔ اس نے اسے روزوں کا پابند بنایا تھا۔

وہ بلیو مون ڈاکو کیسے ہو سکتی ہے۔ سجیل کے مطابق بلیو مون ضروری نہیں کہ کوئی لڑکی ہی ہو۔ کوئی مرد بھی لڑکی بن کر لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے۔ بلکہ وہ تو اسی فیصد پر یقین تھا کہ جس ڈاکو نے چہرے سے کپڑا نہیں ہٹایا تھا' وہی بلیو مون ہے۔

طیب ایسا سوچتا بھی تو اس کا سر بے اختیار نفی میں ہلنے لگتا۔ جو کبھی وہ ارادہ کرتا کہ اس کے خلاف رپورٹ کرے یا کم از کم اس کا اکاؤنٹ بلاک کروا دے' اتنا بھی نہیں تو خود ہی اسے اَن فرینڈ کر دے' مگر عین وقت پر اس کی انگلی ایک کلک نہ کر پاتی۔ اس دن کے بعد سے وہ بھی آن لائن نہ ہوئی تھی اور پھر بارہ دن بعد ایک دم وہ آن لائن ہوگئی۔

"طیب طاہر! کہاں رہ گئے تھے آپ؟ اس دن میں نے کتنا انتظار کیا آپ کا۔" اس سے پہلے کہ طیب اس سے بات کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتا' اس کی طرف سے شکوہ آگیا۔

"اب آپ کی دادی کیسی ہیں؟" اس نے طنزیہ پوچھا۔ مگر اس کا جواب پڑھ کر ایک لمحے کے لیے سکتے میں آگیا۔

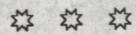
"ان کی ڈیتھ ہوگئی اگلے دن۔" اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وہ اس کا یقین کرے یا نہ کرے۔

"میں نے بہت انتظار کیا آپ کا۔"

"ایک بات بتائیں بلیو مون! آپ کو دادی کی ڈیتھ کا زیادہ افسوس ہوا تھا یا کامیاب واردات کی زیادہ خوشی ہوئی تھی؟" وہ تلخ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مگر ہو گیا تھا۔

"آپ کیا کہہ رہے ہو طیب طاہر! میری سمجھ میں نہیں آرہا۔" بہت دیر کی خاموشی کے بعد اس کا جواب اسکرین پہ نمودار ہوا۔

طیب نے اس کو جواب دینے کی زحمت نہ کی۔ اس کا دل عجیب کیفیات میں گھرا تھا۔ بلیو مون کے اوپر تلے میسج آرہے تھے۔ مگر اس نے نہ تو پڑھے اور نہ ہی جواب دیا۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا' اس کا غصہ شاید آج نکل رہا تھا۔ دل اس کو الزام دے یا نہ دے' پھر بھی وہ سمجھتا تھا کہ اگر وہ اب بھی بلیو مون کے ساتھ سابقہ دوستی اور رویہ برقرار رکھتا ہے تو پھر اس سے زیادہ بے وقوف کوئی نہ ہوگا۔



پوائنٹ یا رکشے سے اترتے ہی ماہم کی نگاہیں لاشعوری طور پر جس شخص کو ڈھونڈتی تھی' وہ دُجانہ عثمان تھا۔ کبھی تو وہ باہر ہی لان کے پاس حسام اور احمد

کے ساتھ نظر آجاتا۔ اگر نظر نہ آتا تو اس کی نظریں اس کی گاڑی کی تلاش میں اٹھتیں۔ اگر گاڑی نظر آجاتی تو ڈھیروں اطمینان اس کے اندر اتر آتا' ورنہ پژمردہ سی ہو جاتی۔ کبھی تو کسی نہ کسی کا کوئی نہ کوئی مسئلہ حل کرنے میں اتنا مصروف ہوتا کہ آخری کلاس میں ہی نمودار ہوتا۔

آج بھی ماہم کی نظریں اس کی تلاش میں نکلیں تو کیمسٹری لان کے پاس صرف حسام اور احمد کو دیکھ کر مایوس لوٹ آئیں۔ اس کی گاڑی بھی کہیں نہ تھی۔

"ہوگا خدمت خلق میں مصروف۔" اس نے کڑھتے ہوئے سوچا اور قدم بڑھا دیے۔

ایک خلاف معمول بات یہ ہوئی کہ احمد اور حسام دونوں بہت خاموش تھے۔ جس پر ردا اور سمیعہ دونوں اظہار تشویش بھی کر چکی تھیں اور فکر تو ماہم کو بھی ہوئی جب دُجانے پروفیسر محسن نوید کی کلاس میں بھی نہیں پہنچا۔ حالانکہ وہ ان کی کلاس نہیں چھوڑتا تھا۔ کیونکہ پروفیسر صاحب حاضری کے معاملے میں بہت سخت تھے۔

ماہم نے سوچا' وہ حسام سے کلاس ختم ہونے کے بعد کسی بہانے سے دُجانے کے نہ آنے کی وجہ پوچھ لے گی۔ مگر اس کی نوبت نہ آئی۔ جیسے ہی پروفیسر محسن نوید لیکچر ختم کر کے کلاس سے نکلے اور لیکچر ہال میں کچھ ہلچل مچی' حسام کی آواز نے ان سب کو متوجہ کر لیا۔

"پلیز..... آپ سب ایک منٹ رک جائیں اور خاموشی سے ہماری بات سنیے۔" سب حسام کے لہجے کی سنجیدگی پہ حیران ہوتے ہوئے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"میں آپ سب کو جو خبر سنانے جا رہا ہوں وہ ہے تو بری خبر۔ لیکن مجھے پوری امید ہے کہ آپ سب کے تعاون سے سب کچھ اچھا ہو جائے گا۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور اپنے لب کاٹنے لگا۔ لیکچر ہال میں عجیب سا سناٹا چھا گیا تھا۔

"بات کیا ہے آخر؟" ردا نے اس خاموشی سے گھبرا کر پوچھ ہی لیا۔ لیکن حسام نے کچھ کہنے کے بجائے دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ احمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"وہ بات دراصل یہ ہے کہ دُجانے..... ہمارا دوست دُجانے....." اس کی آواز رندھ گئی اور وہ بھی خاموش ہو گیا۔ دجانے کے نام پہ سب چونک گئے۔ ماہم کو تو اپنا دل رکتا ہوا محسوس ہوا۔ دُجانے کے بارے میں وہ لوگ کیا بری خبر سنانے والے تھے۔

"کیا ہوا دجانے کو؟" مختلف آوازیں ابھریں۔ صرف ایک اسی کے ہونٹ سل گئے تھے۔

"دُجانے کو دل کی خطرناک بیماری ہو گئی ہے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں' اس کا فوری علاج ضروری ہے..... ورنہ....." احمد بھرائی ہوئی آواز میں بتاتے ہوئے رک گیا۔

ماہم کے تو زمین آسمان ہی گھوم گئے۔

"اب کیسا ہے' کدھر ہے وہ؟" نعمان پوچھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے..... گاؤں گیا ہوا ہے۔ کل آئے گا۔ آپ سب سے ہماری درخواست ہے کہ آپ اس کے علاج کے سلسلے میں ہم سے تعاون کریں۔ علاج بہت مہنگا ہے۔ ہمیں اس کی مالی مدد کرنی ہوگی۔ ہم اپنے دوست کو ہر صورت بچانا چاہتے ہیں۔ پلیز! ہمارا ساتھ دیں۔ دجانے نے ہمیشہ اپنا نقصان بھلا کر دوسروں کا فائدہ چاہا ہے۔ ہمارا فرض بنتا ہے' اسے اس موڑ پر ہم تنہا نہ چھوڑیں۔"

کچھ نے اسی وقت جو کچھ جیب میں تھا' نکال کر احمد اور حسام کی طرف بڑھا دیا۔ کسی نے وعدہ کیا کہ وہ اس کی مالی مدد کریں گے۔ ماہم کے والٹ میں اس وقت کتنی رقم ہے' اسے یاد نہیں تھا۔ اس نے یوں ہی نوٹ نکال کر احمد کی طرف بڑھا دیے اور ڈگمگاتے قدموں سے باہر نکل آئی۔ وہ تینوں بھی اس کے پیچھے پیچھے آئیں۔

"اف..... اتنے ہنستے مسکراتے زندہ دل لڑکے کو ایسی بیماری..... یقین ہی نہیں آتا۔" ردا کہہ رہی تھی۔

"دیکھنے میں تو ماشاء اللہ بالکل صحت مند لگتا ہے۔" سمیعہ کو ابھی تک یقین نہ آرہا تھا۔

"تمہاری کلاس کی اتنی تھوڑی سی رقم سے کیا ہوگا۔ ہمیں ہر ڈپارٹمنٹ میں جاکر اس کے علاج کے لیے رقم جمع کرنی چاہیے۔" ردا نے کہا۔

"ہاں.... احمد اور حسام فارغ ہوں تو ان سے بات کرتے ہیں۔" سمیّہ نے تائید کی۔

"اف.... وہ تو کلاس کی رونق ہے۔ ایک دن نہ ہو تو اداسی چھا جاتی ہے۔ اگر وہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا تو...." ماہم نے دہل کر سمیعہ کی صورت دیکھی۔

"اللہ نہ کرے۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ردا اور سمیّہ نے بھی اتنی بری بات منہ سے نکالنے پر سمیعہ کو ڈانٹنا شروع کردیا۔ وہ آہستہ سے ان کے بیچ سے نکل کر باہر جانے والے رستے پر چل پڑی۔

☆ ☆ ☆

ہاسٹل میں آدھی آدھی رات تک بھی لڑکیاں دن کیے رکھتی تھیں اور اب تو وہ بھی اپنے اپنے کمروں میں بند ہو چکی تھیں۔ پورا ونگ اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ برآمدے کی روشنیاں بھی لڑکیوں کو الجھن کرتی تھیں۔ وہ اکثر ان کو بھی بند کردیتی تھیں۔ پھر واش رومز سے آنے والی ہلکی روشنیاں باہر کے اندھیرے کو بساط بھر کم کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ اسی ہلکی پیلی روشنی میں چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں میں گھٹنوں پہ سر دیے وہاں تنہا بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پہ بکھرے موتی اس اندھیرے اور روشنی کے سنگم میں جھلملاتے دکھائی دے رہے تھے۔

"وہ میں دُجانے عثمان ہوں۔"

اس کی نگاہوں کے سامنے ایک فلم چل رہی تھی۔

"نائس نیم.... کس نے رکھا؟" سر سرمد اس سے پوچھ رہے تھے۔

"امی ابو دونوں نے۔ امی نے ایک صحابی ابودُجانہ کے نام پہ رکھا اور ابو نے ایک افریقن حسینہ دجانے کے نام پہ۔ جس سے انہیں اپنے دورہ افریقہ کے دوران محبت ہوگئی تھی۔"

یہ تھا دُجانہ عثمان کا ان کی کلاس میں پہلا تعارف جس نے ہر طرف ہنسی بکھیر دی تھی۔

"Sir if you dont mind may i do"

اس نے کھڑے ہو کر اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے متجسس کے اس سوال کو حل کرنے کی اجازت چاہی جس میں سر کمال خود پھنس گئے تھے۔

یہ تھی اس کی کمال کی خوداعتمادی اور کمال کی ذہانت کا پہلا مظاہرہ۔

"ابے یار! رات بھر فیصل کے سر پہ پٹیاں رکھیں پھر جاکر اس کا بخار کم ہوا۔ صبح صبح اس کا بھائی اسے لینے آگیا تو اسے ناشتا کرا کے آیا ہوں' اسی لیے لیٹ ہوگیا۔" وہ پیچھے بیٹھا اپنے دوستوں سے کہہ رہا تھا۔

یہ تھا اس کا انسانیت بھرا دل۔ جو ایک چڑیا سی کا بازو پکڑ کر اس پہ آئے زخم پر تشویش کا اظہار کرتا ہوا اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر مرہم پٹی کے لیے لے گیا تھا۔

"دُجانے نے ہمیشہ اپنا نقصان بھلا کر دوسروں کو فائدہ چاہا ہے۔ ہمارا فرض بنتا ہے کہ اسے اس موڑ پر تنہا نہ چھوڑیں۔"

اس نے اپنے بھیگے چہرے کو گھٹنوں میں چھپا لیا۔

"اف.... وہ تو کلاس کی رونق ہے۔ ایک دن نہ ہو تو اداسی چھا جاتی ہے۔ اگر وہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا تو...."

ماہم نے بے چین ہو کر سر اٹھایا اور ہر طرف دیکھا۔ ونگ کے اندھیرے سے اسے وحشت ہونے لگی۔ اس نے تیزی سے اٹھ کر کاریڈور کا ایک بلب روشن کردیا۔

"کیسا احسان... یہ تو ایک مسلمان' ایک پاکستانی' ایک کلاس میٹ ہونے کے ناطے میرا فرض ہے۔" اپنی مسکراہٹ چھپا کر ڈھٹائی کے ساتھ کہتا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"دُجانے۔" وہ روتی چلی گئی۔ "دُجانے! مجھ پہ ایک

احسان اور کرو۔ پلیز! تم بالکل ٹھیک ہوجاؤ۔"

☆ ☆ ☆

طیب یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں مزید گھرا رہنا نہ چاہتا تھا اس لیے اگلے دن سجیل سے اس کی گاڑی مانگنے پہنچ گیا۔ اس نے بہانہ یہ بنایا کہ اس کے کسی کولیگ کی شادی ہے اور اسے وہاں جانا ہے۔

"اچھا! مگر ایک احسان کرنا' بلیو مون کو نہ بتا دینا۔ میری اکلوتی گاڑی ہے۔" چابی اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے وہ بولا۔ طیب نے اس سے نظریں چرائیں اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

ٹول پلازہ سے باہر آکر اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ آج شاید وہ کسی کشمکش سے نکل آتا۔ بلیو مون کا بتایا ہوا بورڈ نظر آنے کے بعد اس نے گاڑی سڑک سے اتاری اور اس چھوٹی کچی پکی سڑک پہ گاڑی دوڑانے لگا۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ ایک شاندار سے فارم ہاؤس کے سامنے کھڑا تھا۔ جس کا پتا بلیو مون نے بتایا تھا۔

تو بلیو مون یہاں تک تو سچی تھی۔

"صاحب تو یہاں نہیں ہیں۔ اپنی والدہ کی میت کے ساتھ اپنے گاؤں گئے ہیں۔" مسلح گارڈ نے اس کے پوچھنے پہ بتایا۔

"ان کی والدہ کا انتقال کب ہوا؟" اس نے پوچھا اور گارڈ نے جو دن بتایا' اس جواب پہ وہ کچھ لمحوں کے لیے ساکت سا رہ گیا۔

"ان کی بیٹی.... وہ ہیں یا وہ بھی ساتھ گئی ہیں۔"

"ہم کو جتنا بتانے کی اجازت ہے' ہم نے بتادیا۔ اب جاؤ تم یہاں سے۔" چوکیدار کا رنگ اس کے سوال سے اڑا۔ صاحب نے صرف نوکری سے نہیں نکالنا تھا' بلکہ آخری سانس تک الٹا لٹکا دینا تھا۔ اس معاملے میں ان کی ہدایات بہت سخت تھیں۔ خاص طور پر اس دن کے بعد سے جب وہ لڑکا اس فارم پہ آیا تھا' جس کی آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک تھی اور جب لوٹ رہا تھا تو کیسی بجھی تھیں وہ آنکھیں۔ اور پھر ہر دفعہ وہ امید کے دیپ آنکھوں میں جلا کر آتا اور واپسی پہ یہ دیپ بجھ چکے ہوتے۔

طیب نے اس سے کچھ اگلوانے کی کوشش کی مگر وہ منہ کھولنے کو تیار نہ تھا۔ وہ وہاں سے لوٹ آیا' مگر رنج اور تاسف کا گہرا احساس بھی واپسی میں اس کے ساتھ تھا۔ بلیو مون جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ اس کی سچائی پہ ایک اور مہر ثبت ہوئی تھی مگر طیب کے دل پہ بوجھ بڑھ گیا۔ وہ اس دن وقت پر ڈاکٹر کو لے کر پہنچ نہیں پایا تھا اور اس کی دادی کی طبیعت اتنی بگڑی کہ وہ اگلے دن انتقال کر گئیں۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن وہ بغیر ناشتا کیے بغیر ردا کا انتظار کیے پوائنٹ کے آنے سے بھی آدھا گھنٹہ پہلے گیٹ پر پہنچ گئی۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ گیٹ پار کرکے پیدل ہی چلتی چلی جائے اور شاید ایسا کر بھی لیتی اگر اسے یقین ہوتا کہ سامنے ہی اسے دُجانے کی صورت نظر آجائے گی۔

آج چودہ فروری تھا۔ اکثر لڑکیوں نے سرخ اور دوسرے شوخ رنگ پہن رکھے تھے مگر اسے لگ رہا تھا کہ یہ خبر سننے کے بعد اس کی زندگی سے سارے رنگ ہی ختم ہوگئے ہیں۔ ڈپارٹمنٹ پہنچنے کے بعد اس کی بے قرار نظریں اس کو تلاشتی رہیں۔ سب کلاس فیلوز دُجانے کی بات ہی کر رہے تھے' سب ہی اس کی صحت کے بارے میں فکر مند تھے اور اس کے علاج کے خرچے کے لیے ایک کمپین شروع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ چپ چاپ کرکے ان کی صورت دیکھ رہی تھی۔ پہلی دو کلاسز کے بعد حسام اور احمد نے ان کو ڈپارٹمنٹ کے بیرونی لان میں چلنے کو کہا جہاں وہ سب مل کر دُجانے کے علاج کے بارے میں ڈسکس کرکے آگے کا پلان کر سکیں۔

"تم لوگ پلان کرلو' کیا کرنا ہے ۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" آفاق نے احمد کے کندھے پہ تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ اس کو اپنی پڑھائی کی فکر زیادہ تھی۔ اس کے ہمنوا اسی کے ساتھ بیٹھے رہے اور جن کو دُجانے کی زیادہ فکر تھی' وہ لیکچر ہال سے نکل آئے۔

"اب ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟" فہد' احمد کے ساتھ چلتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"آج رپورٹس آئیں گی۔" اس نے پست آواز میں جواب دیا۔

وہ سب لوگ باہر کے لان میں پہنچے تو وہاں کے رنگ دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گئے۔ عاقب جوان تینوں کا مشترکہ دوست تھا' مگر اس کا ڈپارٹمنٹ ماس کمیونیکیشن تھا' وہ وہاں کیک' پزا' پاستا اور بھی کئی چیزیں سجائے بیٹھا تھا۔ بیچ میں گلاب کے پھولوں کا گل دستہ رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے ٹکر ٹکر ایک دوسرے کی صورتیں دیکھیں۔

"آج دُجانے کی برتھ ڈے ہے۔ ہم اسے سرپرائز دیں گے۔" احمد بمشکل مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ خوشی کی گھڑیوں کو امر کرلے۔"

ماہم کو اپنے آنسو پینے دوبھر ہوئے۔ وہ نامحسوس انداز میں سب کے پیچھے ہوئی۔

وہ سب بے دلی سے اپنی اپنی جگہ پہ بیٹھے ہی تھے کہ ماہم کی نظر سیاہ گاڑی پر پڑی۔ اس کی نظریں پھر وہاں سے ہٹ نہ پائیں۔ گاڑی پارک کرکے وہ باہر نکلا۔ سیاہ پینٹ کے ساتھ سفید شرٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ان کی طرف آتے ہوئے ان کی طرف دیکھتے ہوئے وہ مسکرا رہا تھا۔ جو شگفتگی اس کے مزاج کا خاصا تھی' وہ آج بھی برقرار تھی۔

"پلیز! دُجانے کے سامنے اس کی بیماری کی کوئی بات نہیں کرنا۔ اسے تکلیف ہوگی۔" فہد کہہ رہا تھا۔ سب اس کی بات سے متفق ہوئے تھے۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔"

وہ مسکراتا ہوا ان تک پہنچا تو سب یک زبان ہو کر گانے لگے۔ عاقب نے اس کے ہاتھ میں چھری دی۔

"ارے واہ! مجھے نہیں پتا تھا' تم لوگ میرے ساتھ میرا برتھ ڈے اور ویلنٹائن ڈے منانے کو یہاں بیٹھے ہو۔" اس نے کیک کاٹنے کے بعد ایک ٹکڑا لے کر نعمان کے منہ میں ٹھونس دیا۔ "کھاؤ ناں تم سب۔"

اس کے کہنے پہ سب نے اپنی پلیٹ میں اس کا دل رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ ڈالا۔ ماہم نے بھی ایک چھوٹا سا پیس لیا مگر اسے کھانا بھی ہے' یہ بھول گئی۔ اس کی نظریں بھٹک کر دُجانے پہ اٹھتیں اور ضبط کی کوشش میں لب کچل ڈالتی۔

"دشمنوں کے پیسے پہ برتھ ڈے منانے کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ ویسے وہ ہے کہاں۔" دُجانے نے آہستہ سے حسام کے کان میں کہا۔

"کلاس لے رہا ہے۔"

"ہوں... تم سب کھاؤ ناں یار! وہ گلی سڑی سبزیوں والے سموسے' پکوڑے تم لوگوں کو بہت اچھے لگتے ہیں اور اتنے مزے کی چیزیں لے نہیں رہے۔ کھاؤ ناں پلیز! سمیعہ' ردا' کھاؤ ناں تم لوگ بھی کچھ اور ماہم...."

"دُجانے! تمہیں کون سی ہارٹ ڈزیز ہے۔" اس سے مزید ضبط نہ ہوا تو اس نے پلیٹ ایک طرف رکھ کر پوچھ ہی لیا۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے بھری ہوئی تھیں اور چہرہ ضبط کی کوشش میں سرخ پڑ رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

محترم ڈاکٹر سجیل احمد کو ڈاکٹر ثنا مراد پسند آگئی تھی جس نے ساتھ کام کرتے ہوئے اس کے دل پہ جمپ لگادی تھی۔ کہاں تو وہ شادی کے معاملے کو ہنس کر ٹالتا تھا' کہاں ایک ہفتے کے اندر منگنی کرا کے چھوڑی۔ پھوپھو بھی آئی تھیں۔ ویسے تو وہ کم آمیز تھیں اور کسی کو لفٹ کم ہی کرواتی تھیں' مگر بسمہ کے ساتھ ان کا معاملہ الگ ہوتا تھا۔ اس بھتیجی کو پیار بھی خوب کرتی تھیں اور اس کے لیے تحفے بھی دل کھول کر لاتی تھیں۔ اس لیے اس کی باقی کزنز اسے چھیڑتی تھیں کہ پھوپھو کے ارادے اسے بہو بنانے کے لگتے ہیں۔ وہ

ان کو گھور کر رہ جاتی مگر سچ تو یہ تھا کہ پھوپھو کا التفات دیکھ کر اس کا دل بھی خوش فہم ہو اٹھتا۔

"اے شاہدہ! اب تو بھی دیر نہ کر۔ تیرا بیٹا اتنے بڑے شہر میں اکیلا رہتا ہے' اس کی فکر کر۔ تم نے جنتو کے لڑکے کا نہیں سنا۔ ساتھ والے فلیٹ کی لڑکی نے پھانس لیا تھا۔ دو بچوں کی ماں تھی۔ مگر لڑکے کی ضد کہ بیاہ کرنا ہے تو اسی سے۔ اور پھر کرکے چھوڑا۔" سجیل کی منگنی کے اگلے دن منورہ خالہ عادت کے مطابق شاہدہ پھوپھو کو بڑے روشن پہلو دکھا رہی تھیں۔

"اچھا ہے نہ خالہ! بیوہ کی زندگی سنور گئی۔" ثانیہ نے بسمہ کی فرنچ ناٹ بناتے ہوئے کہا۔

"کتنی بار کہا ہے' لڑکیاں ایسی باتوں میں نہیں بولتیں۔" منورہ خالہ نے اسے جھڑکتے ہوئے شاہدہ پھوپھو کی طرف دیکھا جو بسمہ کو دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں تھیں۔

اسی وقت طیب انہیں لینے چلا آیا۔ وہ اب بھی کراچی آتیں تو اپنے بھائی کے گھر ہی سیدھی آتیں۔ یہ اور بات کہ پھر طیب انہیں وہاں رکنے نہ دیتا۔ شاہدہ کا دم فلیٹ میں گھٹتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ طیب پہلے یہی فلیٹ خریدنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اب اس نے پلاٹ لے کر گھر بنوانا شروع کیا تھا تاکہ اس کی ماں اس کے پاس خوشی سے رہ سکے۔

ماموں' مامی کے روکنے کے باوجود وہ امی اور ثانیہ کو لے آیا تھا۔ ابو تو کل فنکشن اٹینڈ کرکے آج صبح ہی واپسی کے لیے نکل گئے تھے۔ گھر آتے ہی اس نے ثانیہ کے ساتھ وہی سلوک کیا جو بسمہ کے ساتھ کرتا تھا۔ اسے کام پہ لگایا اور خود امی کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔

"آپ شادی کیوں نہیں کرلیتے؟" ثانیہ کوکنگ کرتے ہوئے چڑ کر کہنے لگی۔

"اگر تم اس لیے یہ مشورہ دے رہی ہو۔" اس نے کاؤنٹر کے پھیلاوے کی طرف اشارہ کیا۔ "تو اس کے لیے شادی کرنے کیا ضرورت ہے۔ تم اور بسمہ ہو ناں یہ کام کرنے کے لیے۔"

"پھر تم نے کیا سوچا ہے بسمہ کے بارے میں؟" امی نے اس کے منہ سے بسمہ کا ذکر سن کر موقع مناسب جانا۔ وہ اپنی اس خواہش کا ذکر اس کے سامنے بارہا کر چکی تھیں۔

"امی! ابھی آپ ثانیہ کے بارے میں سوچیں۔"

"اس کا کیا سوچوں۔ اپنی خالہ کے گھر جائے گی۔ تم کوئی فیصلہ کرو تو دونوں کی شادی ساتھ کردوں۔"

"آپ کو ہم سے جان چھڑانے کی بڑی جلدی ہے؟" ثانیہ وہیں سے بولی۔

"امی! پلیز ابھی نہیں۔"

"اچھا! شادی جب مرضی کرلینا' مگر مجھے بھائی صاحب سے بات تو کرنے دو۔"

"اگر مجھے تب تک کوئی اور پسند آگئی تو؟" اس سے بات مزید کرنا بے کار تھا۔ امی خاموشی کے ساتھ چائے پینے لگیں۔

وہ رات میں آن لائن ہوا تو یہ دیکھ کر مایوس ہوا کہ بلیو مون آج بھی آن لائن نہ تھی۔ اس دن ان کے بیچ وہ آخری چیٹ تھی۔ اس کے بعد وہ پھر آن لائن نہ ہوئی۔ شاید وہ اس سے شدید خفا ہوگئی تھی اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ کسی پر اتنا بڑا الزام لگادیا جائے تو اسے خفا ہونے کا حق تو بہرحال ہے ناں۔

وہ بلیو مون سے معذرت کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے گھر کا جو نمبر دیا تھا' اس پہ کوئی بھی اسے بلا کر نہ دیتا تھا اور اس کے میسجز کا وہ کوئی جواب دیتی نہ تھی۔ شاید وہ ناراض ہو کر اسے بلاک کرچکی تھی۔ عجیب سی بے سکونی نے اسے پھر آگھیرا۔

✲ ✲ ✲

اسے دُجانے پر بے حد غصہ تھا۔ ایسا جان لیوا مذاق بھی بھلا کوئی کرتا ہے۔ چوبیس گھنٹوں کا ایک ایک پل عذاب بن کر گزرا اور وہ ان سب کو بے وقوف بنا کر قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ راستے میں بار بار اپنی آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کو صاف کرتی۔ اس نے سوچ لیا تھا' اس سے کبھی بات نہیں کرے گی۔ جو اس پہ بھی

دل کھول کر ہنس رہا تھا، جب اس نے پوچھا تھا۔
"دُجانے! تمہیں کون سی ہارٹ ڈزیز ہے۔" دُجانے اس کی لبالب بھری آنکھیں دیکھتا رہا اور پھر کھلکھلا کر ہنس دیا۔
"ہے ایک برا مرض.... دل کا۔"
"کون سا مرض یار؟" فہد نے پوچھا۔
"محبت۔" دُجانے نے شرارتی نظروں سے احمد اور حسام کی طرف دیکھا اور پھر تینوں یک زبان ہو کر بولے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہوئے جو ہنسے تو ان کے قہقہوں سے پورا لان گونج اٹھا۔ سب منہ کھول کر انہیں دیکھ رہے تھے اور جب ان کی سمجھ میں آیا کہ ان کو بے وقوف بنایا گیا ہے تو اس پہ چڑھ دوڑے۔ لڑکیاں تو چراغ پا ہو گئیں۔ ماہم صرف قہقہے لگاتے ہوئے دُجانے کو دیکھ رہی تھی۔
"لڑکیوں! یہ تم لوگوں کا اس دن کا بدلہ ہے، جب ہم لوگوں نے احمد کی برتھ ڈے پہ دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا اور عین ٹائم پر تم اور وہ آفاق، سر نوید محسن کی کلاس اٹینڈ کرنے پہنچ گئے تھے جس پہ انہوں نے ہمارے گروپ کو ایک ہفتے کے لیے اپنی کلاس سے باہر کر دیا تھا۔" حسام کہہ رہا تھا۔
"یعنی کہ برتھ ڈے، ویلنٹائن ڈے اور ریوینج ڈے (بدلے کا دن) ایک ساتھ.... وہ بھی تم لوگوں کے پیسے پہ۔" پھر ایک قہقہہ پڑا تھا۔ اب احمد اس خبر کو سننے کا بعد ہر ایک کا ردعمل بتا رہا تھا۔
"اور یہ فہد.... پلیز! دُجانے کے سامنے اس کی بیماری کی کوئی بات نہیں کرنا۔ اسے تکلیف ہو گی۔" وہ ہنستے ہوئے اس کی نقل اتار رہا تھا۔ فہد نے اسے مکا دے مارا۔
"اور نعمان کی رات کال آئی۔ پلیز! دجانے کا بہت خیال رکھنا۔ بے چارہ آج کل کمزور بھی بہت لگ رہا ہے۔" اب بے چارے نعمان پہ ہنسا جا رہا تھا۔ "اور یہ لڑکیاں.... بے چاری آج لال رنگ پہننا بھول گئیں۔"
"بہت ذلیل ہو تم سب...." مستی پھنکاری۔

"بدتمیز.... پتا ہے کل شام میں اور ماہم تمہاری ہی باتیں کرتے رہے۔"
"اچھا۔" دُجانے جو دونوں بازو پیچھے کو رکھے ان کے زور پہ بیٹھا ہوا تھا، ایک دم سیدھا ہوا۔
"اور کیا.... پھر جب میں کل کیفے گئی اور ماہم کے کیبن میں نظر پڑی تو بے چاری دل کے امراض اور ان کے علاج پہ کوئی آرٹیکل پڑھ رہی تھی۔" ایک اور قہقہہ پڑا۔
"اچھا ماہم! پھر کیا جانا تم نے دل کے بارے میں اور...." وہ براہ راست اس سے مخاطب ہوا تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور وہاں سے جانے لگی۔ ضبط کی کوشش میں اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔
"ارے! رکشے کا کرایہ تو لیتی جاؤ۔ سنا ہے تمہارے والٹ میں جو کچھ تھا، تم نے میرے علاج کے لیے دے دیا تھا۔" دُجانے پیچھے سے چلایا۔
"یار! تیری رپورٹس ٹھیک نہیں آئیں۔" ماہم کو پیچھے سے حسام کی آواز آئی تھی۔
اس کی آنکھ سے جو پہلا موتی وہاں گرا تو پھر اپنے کمرے تک یہ خزانہ لٹاتے ہوئے آئی تھی۔ دُجانے عثمان، ماہم نور کے لیے کیا تھا، یہ تو وہ جانتی تھی۔ اور ماہم نور، دجانے عثمان کے لیے کیا تھی بھلا، یہ آج جان گئی تھی۔
محض ایک تفریح ایک مذاق۔
دجانے عثمان نے اس کے ماں باپ سے بھی بڑھ کر اس کا دل دکھایا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنے تمام تر غصے کے باوجود اس کے دل میں جو سکون اترا تھا، اس کا بیان ہی الگ تھا۔ اس نے شکرانے کے نوافل ادا کیے تھے کہ دجانے بالکل ٹھیک ہے۔
شام کو وہ صالحہ کے ساتھ سوسائٹی آئی تو باوجود بے حد خفا ہونے کے اس کی نظریں دجانے کی گاڑی کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ سڑک پہ

نظریں دوڑاتے ہوئے اسے خیال آ رہا تھا کہ وہ سب کتنے بے وقوف تھے۔ جو لڑکا اپنی گاڑی پہ گھومتا تھا، بہترین موبائل رکھتا تھا، دوستوں کو بہترین کھانے کھلاتا تھا، اسے بھلا ان کے جمع کیے ہوئے پیسوں سے علاج کروانا تھا۔ پھر بھی اس کی بیماری کا سن کر وہ سب حواس باختہ ہو گئے تھے یا ویسے ہی انجانے میں ثابت کیا تھا کہ وہ اسی عوام سے تعلق رکھتے ہیں جو بے وقوف بننے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اور تو اور آفاق نے بھی اپنا ظرف دکھانے کے چکر میں جیب خالی کی تھی۔
وہ لوگ گیٹ پر پہنچنے والے تھے، جب اس کی نظریں سامنے اٹھیں تو بس پھر اٹھی رہ گئیں۔ گاڑی سے ٹیک لگائے وہ گیٹ کے سامنے ہی کھڑا تھا اور اس کی روم میٹ سے کوئی بات کر رہا تھا۔ شاید وہ اسے بلانے کو ہی کہہ رہا ہو گا۔
اسے دجانے پہ غصہ بہت تھا، اسے دیکھنے کی شدید ترین خواہش بھی تھی اور اب جب وہ سامنے تھا تو اس کے قدم سست پڑ رہے تھے۔ وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی اور اُسے خوب سنانا بھی چاہتی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کے قریب سے گزر کر اندر چلے جانا چاہتی تھی اور اس کے منہ سے اپنے نام کی پکار بھی سننا چاہتی تھی۔
"ماہم!" مگر اس نے پکار لیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ صالحہ بھی رک گئی اور اچنبھے سے اسے دیکھنے لگی۔ آج تک تو اس نے ماہم کے پاپا کو ہی دیکھا جو اتنی رعب دار شخصیت کے مالک تھے کہ صالحہ کا تو انہیں دیکھ کر دم ہی نکلنے لگتا تھا۔
"ماہم! پلیز میری بات سنو۔ پلیز ماہم!"
اور ماہم نور کی دجانے عثمان کے ساتھ کوئی نسلوں پرانی دشمنی تو تھی نہیں اور نہ ہی اس نے قسم کھالی تھی کہ دجانے عثمان کی منتوں پہ بھی اس کی بات نہیں سنی۔ پھر کہاں تک اس کا غصہ غالب رہتا۔ اس کے اس سے کبھی بات نہ کرنے کے ارادے ہوا ہو گئے۔
"صالحہ! میں آتی ہوں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا شاپر اس کی طرف بڑھایا تو صالحہ نے سر ہلاتے ہوئے شاپر پکڑ لیا اور گیٹ سے اندر چلی گئی۔
"شکر ہے! تم نظر آئیں۔ پتا ہے ماہم! آج میری شدید ترین خواہش تھی کہ ایک بار تمہیں دیکھ لوں تمہیں مل لوں۔" وہ چپ رہی۔
"تم یوں خفا ہو کر کیوں آ گئی تھیں ماہم؟" ماہم نے ایک دم نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔
"ماہم! تم اس لیے رو رہی ہو کہ دل کے امراض پہ تمہارا ہوم ورک ضائع گیا، مجھے کوئی بیماری کیوں نہیں ہے؟" وہ بے حد معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ ماہم کو اس پہ اتنا شدید غصہ آیا کہ اس نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔ حالانکہ وہ دونوں چلتے ہوئے جمنازیم کی سڑک کی طرف آ گئے تھے۔
"اچھا.... سوری، سوری۔" وہ گھوم کر اس کے سامنے آیا۔ وہ پھر ایک بار اس کے سامنے بے بس ہوئی۔
"وہ صرف ایک مذاق تھا ماہم!"
"مذاق۔" اس نے تاسف سے اسے دیکھا۔ "تم جانتے ہو اس مذاق نے کیسے مجھے سولی پر لٹکائے رکھا؟ ایک ایک لمحہ کیسی قیامت بیتی مجھ پر۔ ساری رات سو نہیں پائی میں۔" اس کی آنکھوں سے ساون کی جھڑی لگ گئی۔ "آنکھیں بند کرتی تو کچھ برا ہو جانے کے خیال سے لرز اٹھتی.... اور تم کہہ رہے ہو، وہ صرف ایک مذاق تھا۔"
وہ بہت خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ان موتیوں کو اپنے پوروں پہ چن لے، اپنی مٹھیوں میں بھر لے۔ یہ آنسو پانی کے نمکین قطرے نہ تھے، دجانے عثمان کے لیے متاع جاں تھے۔
"ابھی تک تو میں تم سے شرمندہ تھا کہ تمہیں ستایا، مگر اب ریلیکس ہوں۔ بھئی! اگر کچھ اچھے انکشاف اس بہانے ہو جائیں تو کیا برا ہے۔" وہ تازگی بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ وہ جھینپ کر رہ گئی اور جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے۔

"ویسے ہم نے کوئی ایسا جھوٹ بھی نہیں بولا تھا۔ احمد نے بتایا ناں کہ مجھے دل کی یہ بیماری ہوئی ہے کہ محبت ہو گئی ہے۔" دجانے نے ڈھلتے سورج کے ساتھ اس کا یہ روپ دیکھا اور مسکرایا۔ "اور تم نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ دجانے عثمان تمہیں کس سے محبت ہوئی ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے سامنے سے آنے والے جوڑے کو دیکھنے لگی۔ اس کے لبوں پہ شرمگیں مسکراہٹ تھی۔

کچھ سوال پوچھنے کی ضرورت کہاں ہوتی ہے' کچھ جواب دینے کہاں لازم ہوتے ہیں۔ دو دل ایک تال پہ دھڑکتے ہوئے یہ کام خود کر لیتے ہیں۔

دجانے نے اس کی مسکراہٹ اور جھکی نظروں کو اپنے دل میں اتارا اور پھر ایک دم سڑک کے اس پار گیا اور وی سی کے بنگلے کے سامنے لگے پودے پہ سے سرخ اور نارنجی رنگ کا ایک خوشنما پھول توڑ لیا۔

"وی سی پہ کچھ حق ہمارا بھی ہے۔" گارڈ کے گھورنے پہ وہ اسے مزید جوش و خروش کے ساتھ گھورتے ہوئے بولا اور سڑک پار کر کے ماہم کی طرف آگیا جواب کھل کر مسکرا رہی تھی۔

"آپ کے لیے۔" اس نے وہ چھوٹا سا پھول اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے کچھ شرماتے' کچھ مسکراتے ہوئے تھام لیا۔ اب اس کی زندگی میں ہر طرف رنگ ہی رنگ تھے۔

☼ ☼ ☼

"بچوں کا ایک گھر ہوتا ہے ان کے ماں باپ کا گھر۔ مگر میں نے ہوش سنبھالتے ہی دو گھر دیکھے۔ ایک ماں کا گھر ایک باپ کا گھر۔ ان کی علیحدگی تب ہی ہو گئی تھی' جب میری عمر سات ماہ تھی۔ میں ساری عمر ان دونوں کے بیچ کا سفر طے کرتی رہی۔ ممی نے دوسری شادی کر لی تھی اور پاپا بھی چار سال بعد نئی بیوی لے آئے۔ دونوں کے مزید بچے ہو گئے۔ دونوں کو شاید میری ضرورت نہ رہی۔ مگر میں ان دونوں کی انا تھی۔ اس لیے دونوں اسے اپنے اپنے سرے سے پکڑ کر کھینچتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میرا وجود بیچ سے چر جائے گا۔ دو ٹکڑے ہو جائے گا۔ پھر میں کبھی مکمل ماہم نور نہ بن پاؤں گی۔"

وہ آڈیٹوریم کی سیڑھیوں پہ بیٹھی گھٹنوں پہ بازو رکھے' ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ لیے بول رہی تھی اور دجانے کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کے پاس الہ دین کا وہ چراغ آجائے جس سے ظاہر ہونے والے جن کو حکم دے کہ اس کی ماہم کی زندگی سے وہ دو جن نکال دو جنہوں نے اس کا بچپن اس سے چھینا اور اب بھی اسے ہولانے اور ڈرانے کو اس کے گرد پھیرے لگاتے رہتے ہیں۔

"انہوں نے کبھی نہیں سوچا کہ میری بھی کوئی عزت ہے' عزت نفس ہے۔ پیار نہیں دے سکتے' عزت نہیں دے سکتے تو دوسروں کی نظر میں میری جو عزت اور بھرم ہے' وہ تو ختم نہ کریں' مگر دونوں ہر جگہ میرا تماشا ہی بناتے آئے ہیں۔ تم نے شاید دیکھا ہو یا سنا ہو' انہوں نے ڈپارٹمنٹ کے باہر بھی ایک ہنگامہ مچایا تھا۔ میں جو یونی میں پورے اعتماد کے ساتھ چلتی تھی' اس دن کے بعد سے وہ بھی ختم ہوا۔ اب یہ وہم ہو یا حقیقت مگر مجھے لگتا ہے کہ بہت سی ہمدردی بھری اور بہت سی مذاق اڑاتی نظریں مجھ پہ اٹھتی ہیں' میرا تعاقب کرتی ہیں۔"

وہ اپنے ماں باپ کے بارے میں کیا سوچتی ہے' ان کے رویوں کو کیسے محسوس کرتی ہے' کبھی کسی کو نہ بتاتی تھی' اپنی دادی کو بھی نہیں جو سال میں ایک دفعہ ان کے پاس آتیں اور ایک بار وہ ان کے پاس گاؤں جاتے اور ان کے سینے سے لگ کر اسے احساس ہوتا کہ چھاؤں کیا ہوتی ہے۔ وہ ان کی گود میں سر رکھ کر بہت باتیں کرتی مگر دل کا یہ حال ان سے بھی کبھی نہ کہہ پاتی۔ یہ گھاؤ انہیں بھی نہ دکھا پاتی۔ مگر ہوتا ہے کوئی ایک شخص ایسا جس سے ہر اچھی' ہر بری بات' ہر مثبت ہر منفی سوچ شیئر کرنے کو جی چاہتا ہے' اپنا ظاہر باطن آپ اس کے سامنے کھول دیتے ہیں۔ اور ماہم نور کی

زندگی میں ایسا شخص دجانے عثمان تھا۔ وہ سانس بھی لیتی تھی تو اس کا دل کہتا کہ اس کی خبر دجانے عثمان کو دے آئے۔

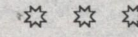
"پتا ہے دُجانے! میری زندگی میں تم واحد شخص ہو جس کے ساتھ میں یہ سب شیئر کر رہی ہوں۔" وہ اس کی بات سن کر ہلکا سا مسکرا دیا۔ اس نے اسے یہ نہ بتایا تھا کہ کرنل عبدالحمید اور ندرت جہاں آرا کا یہ روپ وہ بھی دیکھ چکا ہے۔ وہ سارا دن بے کل، بے قرار رہا تھا اس کا بس نہ چلتا تھا کہ ابھی ماہم کے پاس جائے اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے ایسی جگہ لے جائے جہاں ان دونوں کا سایہ بھی اس پر نہ پڑے۔

"تمہارے اسٹیپ فادر اور مدر کیسے ہیں؟" وہ اس سے خود چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ماہم کے اندر جو بھی تلخیاں، جو بھی محرومیاں ہیں وہ لفظ بن کر اس کے اندر سے باہر آجائیں۔ پھر شاید وہ اتنی اداس نہ رہا کرے۔

"میں نے سگی ماں اور سگے باپ کو سوتیلے بنتے دیکھا ہے، پھر سوتیلوں کے رویوں کا میں کیا غم کروں۔" اس کے لہجے میں اتنا کرب تھا کہ دجانے کے اندر تک گہرے دکھ کا احساس سرایت کر گیا۔

"ممی کے ہزبینڈ تو دبئی ہوتے ہیں۔ جب وہ آتے ہیں تو ممی مجھے نہیں بلواتیں۔ اس لیے میرا ان سے سامنا کم ہی رہا ہے۔ ویسے وہ مجھے ذرا بھی پسند نہیں۔ شاید اپنے باپ کی جگہ دنیا کا کوئی بھی مرد کبھی اچھا نہیں لگتا۔ مما.... پاپا کی مسز.... وہ بری نہیں ہیں۔ بس وہ میرا نمبر فردا اور ارمغان کے بعد رکھتی ہیں۔ پتا ہے دجانے! جب مما مجھے اگنور کر کے ارمغان اور فردا سے پیار کرتی ہیں تو مجھے دکھ نہیں ہوتا۔ مجھے خوشی ہوتی ہے کہ ایک ماں اپنے بچوں سے پیار کر رہی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں جھلمل کرتی نمی دُجانے کا دل چیر رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وہ کیا ایسا کرے کہ ماہم کی تمام محرومیوں اور کمیوں کو دور کردے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے اپنی امی کے پاس لے جائے گا اور جب امی اس کو ویسے ہی پیار کریں گی جیسے سارہ آپی کو کرتی ہیں تو ممتا کے لیے ترسی ہوئی ماہم کی تشنگی خود بخود مٹ جائے گی۔ جب ابو اس کے سر پہ شفقت بھرا ہاتھ رکھیں گے تو وہ اپنے باپ سے ملنے والی ہر تکلیف بھول جائے گی۔ یہ ایک ایسا خواب تھا جس کی تعبیر ماہم کو ملتی تو وہ خوش ہوتی مگر دُجانے اسے سوچ کر ہی خوش ہو اٹھا تھا۔



اس دفعہ امتحانات رمضان میں آرہے تھے۔ دوسرے اسٹوڈنٹس تو مشکل میں تھے ہی مگر ہاسٹل میں تو اور بھی تپے بیٹھے تھے۔ رمضان میں ہاسٹل میں رکنا ویسے ہی مشکل لگتا تھا، اس پر امتحان بھی۔ اس ماہ میں امتحانات رکھنے پر وائس چانسلر کو اپنی ہمت اور استطاعت کے مطابق ہر کوئی کوس رہا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ عبادت کی جائے یا اپنے پیپر کی تیاری۔ پھر سحری افطاری کے مسئلے الگ۔ میس کا کھانا تو ایک ہفتے بعد ہی ایک ذائقے کا لگنے لگتا۔ کم سے کم افطاری میں تو وہ کھانے کو بالکل جی نہ چاہتا۔

اس دن اس نے سحری کے بعد کچھ دیر تلاوت کی اور پھر پیپر کی تیاری کرنے لگی۔ جب ڈپارٹمنٹ پہنچی تو دجانے ابھی پہنچا نہیں تھا۔ آج تو ہمیشہ کی طرح وہ دس پندرہ منٹ پہلے بھی پہنچ نہیں پایا تھا۔ وہ پریشان ہوتے ہوئے ایگزامینیشن ہال میں آگئی۔ پیپر شروع ہو گیا اور دجانے نہ پہنچا۔ اس کی فکر عروج پہ پہنچ گئی۔ ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا کہ اس نے پیپر چھوڑ دیا ہو۔ اس نے پریشان ہوتے ہوئے پیپر شروع کیا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد دجانے ہال میں داخل ہوا۔ اگر وہ ٹیچرز کا لاڈلا نہ ہوتا تو اس کو ہرگز اجازت نہ ملتی کہ وہ پیپر میں بیٹھے۔ سر عدنان نے اسے گھورتے ہوئے پیپر اور آنسر شیٹ اس کے حوالے کی۔ آفاق کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ آدھے گھنٹے بعد دُجانے کھڑا ہو چکا تھا۔ جب سر عدنان اور میڈم عطیہ نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میرا پیپر ہو گیا۔" میڈم عطیہ کی طرف اپنی شیٹ بڑھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

کئی اور اسٹوڈنٹس کے ساتھ ماہم نے بھی اس کی طرف دیکھا، مگر وہ کسی کی طرف بھی متوجہ ہوئے بغیر ہال سے باہر نکل گیا۔ باقی پیپر ماہم نے غصے میں ہی کیا۔ سارا دن اسے دجانے پہ غصہ رہا۔ کبھی وہ اپنی پڑھائی کو سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ ایسے بھلا اس کا کیا رزلٹ رہتا اور کیا مستقبل ہوتا۔ اگلے پیپر میں وہ اس سے الجھ پڑی۔

"تمہیں احساس نہیں؟ اپنے کل کی پروا نہیں؟"

"کیا ہو گیا بھئی۔" وہ بالکل نارمل لہجے میں پوچھ رہا تھا جیسے اسے خبر ہی نہ ہو کہ ماہم اتنی تپی ہوئی کیوں ہے۔

"اس دن ایک تو تم اتنا لیٹ آئے۔ پھر آدھے گھنٹے میں پیپر دے کر چل بھی دیے۔ میں پوچھتی ہوں کہ آدھے گھنٹے میں تم نے کیا کر لیا جبکہ ہمیں تو تین گھنٹے بھی کم لگ رہے تھے۔"

"بھئی! مجھے جتنا آرہا تھا، اتنا کر لیا۔"

"تم نے پڑھا کیوں نہیں تھا؟"

"ماہم! میری امی مت بنو۔" اس نے اسے گھور کر کہا۔

"تم نے پڑھا کیوں نہیں تھا؟" اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"میرا کزن سپلی دینے آیا ہوا تھا، میں اسے اس کے پیپر کی تیاری کرا رہا تھا۔" وہ بہت آرام سے بتا رہا تھا۔ ماہم کو اتنا غصہ آیا کہ وہ کچھ دیر تک بول ہی نہ پائی۔

"کیا ہے ماہم! پاس ہو جاؤں گا۔ فکر مت کرو۔"

"پاس۔" اس کے سامنے اپنے پاپا کا چہرہ گھوما، جن کے معیار ہی اپنے تھے۔ اسے دُجانے کے لیے ایک جنگ کرنی تھی ان کے ساتھ۔ مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اسے ان لوگوں سے بہتر بنا کر پیش کرے جو اس کے امیدوار بنے بیٹھے تھے۔ اور دجانے .... اس کا رزلٹ، اس کی غیر سنجیدگی.... ماہم کا دماغ گھوم گیا۔

"دجانے تمہیں کیوں احساس نہیں کہ تمہارا اچھا رزلٹ کتنا میٹر کرتا ہے، ہمارے فیوچر کے لیے؟ تم ہو کہ خدمت خلق سے فرصت نہیں۔"

"پاگل! اچھا فیوچر مارکس شیٹس کو دیکھ کر تھوڑی بنتا ہے۔" وہ ہنسا۔

"بنتا ہے، کہیں کہیں مارکس شیٹ اور پوزیشن بہت اہم ہو جاتی ہیں۔"

"چلو! وہ میں آفاق کی چرا لوں گا۔"

"آفاق کی کیوں... آفاق کوئی آسمانوں سے اتر کر نہیں آیا۔ دُجانے! تم آفاق سے کئی گنا زیادہ ذہین ہو، قابل ہو۔ بس کچھ سیریس ہو جاؤ۔ پڑھائی کو مکمل وقت دو۔ پھر آفاق بھلا تمہارے سامنے کیا چیز ہے۔" دجانے پھر ہنس دیا اور جب ماہم کا موڈ خراب ہی دیکھا تو اس کے ساتھ سنجیدگی سے وعدہ کرنے لگا کہ اب وہ پڑھے گا۔ اور ماہم کو امید کم ہی تھی کہ وہ عمل بھی کرے گا۔

"اچھا! موڈ خراب مت کرو۔ پتا ہے اگلی عید پہ میں تمہیں بہت اچھا تحفہ دینے والا ہوں۔"



"طیب طاہر... طیب طاہر۔"

کسی نے اس کو پیچھے سے پکارا تھا۔ وہ گردن موڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ ایک لڑکی بھاگتے ہوئے اس کی طرف آرہی تھی۔

"تم طیب طاہر ہی ہو ناں۔" وہ ہانپتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔ طیب نے حیران ہوتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں نے تمہیں وہاں سے دیکھا۔" اس نے اوپر والے فلور کی طرف اشارہ کیا۔ "بھاگی.... کہ کہیں تم چلے نہ جاؤ۔" اس نے اپنا سانس کسی حد تک بحال کیا۔ "کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔ سوری! تم نے تو مجھے نہیں پہچانا ہوگا۔ طیب طاہر! آئی ایم بلیو مون۔"

طیب اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ایک دن اس کے سامنے یوں کھڑی

______ مگر بلیو مون اس کے سامنے کھڑی تھی اور پہلی نظر ہی میں دیکھ کر کوئی بھی بینا بتا سکتا تھا کہ وہ لڑکی ڈاکوؤں کی ساتھی نہیں ہو سکتی۔

"میں جانتی ہوں تم مجھ سے بہت خفا ہو؟" وہ اسے مسلسل چپ دیکھ کر شرمندہ سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں' آپ مجھ سے بہت خفا ہیں۔" وہ بھی کم شرمندہ نہ تھا۔

بلیو مون نے دوبارہ اسے کہیں بیٹھ کر بات کرنے کی درخواست کی۔ وہ ایک منٹ اسے رکنے کا کہہ کر سامنے والی دکان میں آیا اور سجیل کو بتایا کہ وہ کچھ دیر کے لیے غائب ہو رہا ہے۔ وہ پوچھتا رہ گیا کہ وہ جا کہاں رہا ہے مگر طیب اسے ہاتھ ہلا کر باہر نکل آیا۔ وہ دونوں فوڈ کورٹ کی طرف آ گئے اور ایک میز کے گرد رکھی کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تو دونوں چپ رہے۔ پھر بلیو مون کی شرمندگی میں ڈوبی آواز ابھری۔

"طیب طاہر! میں آپ سے نظریں نہیں ملا سکتی کہ میری وجہ سے آپ اتنی مشکل میں پھنسے۔"

"نہیں بلیو مون! میں آپ سے شرمندہ ہوں کہ اس دن وقت پہ پہنچ نہیں پایا اور آپ کی دادی کو بروقت طبی امداد نہیں مل سکی۔"

"شاید ان کو یوں ہی جانا تھا۔" وہ اداس ہوئی۔ "اس دن پاپا اور ماما لاہور میں تھے۔ جب دادو کی طبیعت اچانک خراب ہوئی تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ جس ڈاکٹر کو ہم فارم پر بلاتے ہیں۔ وہ ان دنوں تھائی لینڈ گئے ہوئے تھے۔ پھر میں نے آپ پر اعتماد کیا۔ میں نے دوستی بھی آپ کے نام کی وجہ سے کی اور آپ پہ اعتماد بھی آپ کے نام کی وجہ سے کیا۔" طیب نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس پہ شک کیا تھا' مگر وہ اس پہ کتنا یقین کرتی تھی' وہ شرمندہ ہوا۔

"جب آپ بہت دیر تک نہ آئے تو میں نے ہمت کر کے اپنے ملازم کو ساتھ لیا اور دادو کو اسپتال لے گئی۔" وہ بہت دھیمے لہجے میں بول رہی تھی اور طیب سحر زدہ سا اسے سن رہا تھا۔

"رستے میں ڈرائیور ایک جگہ سے پانی لینے اترا تو اس نے بتایا کہ آج اس رستے پہ ڈاکوؤں نے دو گاڑیاں چھین لی ہیں۔ اس روٹ پہ ایسی وارداتیں مہینے دو مہینے بعد سننے میں آ جاتی ہیں۔ اس وقت میں دادو کی وجہ سے اتنی پریشان تھی کہ زیادہ دھیان نہ دیا اور بس سلامتی کے ساتھ اسپتال پہنچنے کی دعا کرتی رہی۔ یقین کریں طیب طاہر! میں نہیں جانتی تھی کہ ان میں سے ایک آپ کی گاڑی ہے۔ اگر میری سوچ میں بھی یہ امکان آتا کہ رستے میں آپ کے ساتھ کچھ برا ہو سکتا ہے تو میں آپ کو کبھی نہ بلواتی۔"

"آپ کراچی میں کہیں ٹھہری ہوئی ہیں یا آج ہی آپ کو واپس چلے جانا ہے؟" طیب مزید اسے شرمندہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے فوراً" بات بدل دی۔

"نہیں! میں یہاں ایک وومن ہاسٹل میں رہتی ہوں جاب کے سلسلے میں... طیب طاہر! آپ کی کون سی گاڑی گئی ہے؟" جواب دینے کے بعد وہ اس سے سوال کر رہی تھی۔ وہ اس کے ہونے والے نقصان کا اندازہ کرنا چاہتی تھی۔

"بلیک گاڑی۔" بلیو مون کے ہاتھ میں جوس کا لمبا سا گلاس پوری طرح ہل کر رہ گیا۔

"میری نہیں' میرے کزن کی تھی۔ وہ ابھی ایک ٹریننگ کے لیے ملائیشیا گیا ہوا ہے۔ اگلے ہفتے لوٹے گا تو جان نکال لے گا میری۔"

"اچھا! میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا اب چلتی ہوں۔" وہ ایک دم اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"ایسی بات نہیں۔ مجھے آپ سے مل کر بہت اچھا لگا... اور یوں روبرو چیٹ کر کے بھی بہت اچھا لگا۔" وہ بھی اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"مجھے بھی۔" بلیو مون نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے کہا۔ طیب کو اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی محسوس ہوئی اور وہی خیال آیا جو اسے دیکھتے ہی آیا تھا۔

"ایک سوال پوچھوں بلیو مون؟" بلیو مون نے

کندھے پہ اپنے بیگ کا اسٹرپ ٹھیک کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ نے اپنا نام بلیو مون رکھا ہے' جس کی وجہ آپ کی نیلی آنکھیں ہیں۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔ "یا پھر ان آنکھوں میں سے جھانکتی گہری اداسی؟"

بلیو مون کے لبوں سے مسکراہٹ اسی پل غائب ہو گئی۔

✡ ✡ ✡

"اداس مت ہوا کرو۔"

میسج پڑھ کر اس نے نگاہ موبائل سے ہٹا کر سامنے دیکھا تو میچ شروع ہونے سے پہلے لائن اپ ہوتی ٹیم میں کھڑا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ آج کل کلاسز نہیں ہو رہی تھیں تو ہاسٹلرز جو گھر نہیں گئے تھے' وہ اسپورٹس میں لگے ہوئے تھے۔ آج دجانے نے اسے اپنا میچ دیکھنے کی دعوت دی تھی تو وہ پویلین چلی آئی جہاں اور بھی کچھ ہاسٹلرز موجود تھیں۔

وہ آج بہت ______ اداس تھی اور یہ بات اتنے لوگوں میں صرف اسے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کون تھا' محض دو سال پہلے اس کی زندگی میں آنے والا ایک شخص اور جو دو لوگ ہمیشہ سے اس کی زندگی میں تھے' وہ کبھی اس کے لیے کچھ کیوں محسوس نہ کرتے تھے۔

اس کی نظریں دُجانے پر جم سی گئی تھیں۔ وہ چار لوگوں میں کھڑا ہوتا یا دس میں یا پھر سو لوگوں میں' سب سے ممتاز' سب سے اچھا لگتا اور اسے یقین تھا کہ وہ کروڑوں میں بھی کھڑا ہو گا تو اتنا ہی منفرد اتنا ہی اچھا لگے گا۔

ایک دفعہ اس نے یہی بات اس سے کہہ بھی دی تو وہ ہنس دیا تھا۔

"بات صرف تمہاری نظر کی ہے میرے چاند!"

جب سے اسے اس کے نام کا مطلب پتا چلا تھا' وہ کبھی کبھار گنگناتے ہوئے سے انداز میں "میرے چاند" کہتا۔

میچ کے فرسٹ ہاف میں ان کی ٹیم کو برتری حاصل رہی تھی۔ وہ بھی اس کی بہترین پرفارمنس پہ خوش تھی مگر اندر کی اداسی کم ہونے کو ہی نہ آتی۔

ان دنوں ممی اپنے ہزبینڈ کے پاس دبئی گئی ہوئی تھیں اور پاپا مما لاہور چلے گئے تھے۔ مما کے چھوٹے بھائی کی شادی تھی۔ یونیورسٹی میں ویک اینڈ کے ساتھ کچھ اور چھٹیاں مل کر چار چھٹیاں آ گئی تھیں اور اب اکثر لڑکیوں کو ان چھٹیوں کے ساتھ تین دن کی اپنی چھٹیاں کر کے پورا ہفتہ ہاسٹل نہیں آنا تھا۔ تقریباً" خالی ہاسٹل میں یہ سوچ اسے پاگل کیے ڈالتی کہ اس کی اوقات کیا ہے' کبھی تو ماں باپ اسے ساتھ لے جانے کے لیے جانوروں کی طرح لڑتے ہیں اور کبھی اپنی دنیاؤں میں مگن اسے فالتو جان کر ایک طرف ڈال جاتے ہیں۔

وقفے میں وہ اس کے قریب آ کر پویلین کی سیڑھیوں پہ بیٹھا تو وہ اپنے خیالوں سے چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

دجانے بھی گھر گیا ہوا تھا مگر وہ چوتھے دن واپس آ گیا تھا۔ اس کی خاطر... اس کے ماں باپ کبھی بھی اس کی خاطر کیوں کچھ نہیں کرتے۔

"جب تم اداس ہوتی ہو تو پتا ہے کیا لگتی ہو؟"

وہ کچھ نہ بولی' بس اسے دیکھتی رہی۔

"بلیو مون (اداس چاند)۔" اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور گراؤنڈ کی طرف چلا گیا۔

"ماہم! تم ابھی سوئی نہیں۔" رابعہ ریلنگ سے ٹکی نیچے جھانکتی ہوئی اس سے پوچھ رہی تھی۔ وہ چونکی اور سامنے دیکھنے لگی۔

وہاں کوئی گراؤنڈ تھا' نہ کوئی میچ اور نہ ہی کوئی دُجانے عثمان۔

دو سال پہلے بھی دجانے عثمان یوں ہی اس کی زندگی سے غائب ہو گیا تھا' ایک دم' بہت خاموشی کے ساتھ۔

ان دونوں کی کہانی بھی یونیورسٹی کی فضاؤں میں جنم لینے والی دوسری پریم کہانیوں کی طرح وہیں کہیں جامشورو کی پہاڑیوں تلے دفن ہو کر رہ گئی۔

”تو دجانے عثمان غلطیاں بھی میری تھیں‘ پھر سزا بھی تو مجھے ہی ملنی تھی نا۔ یہ میری غلطی ہی تو تھی کہ میں تم سے محبت کرتی رہی‘ تمہارے خواب دیکھتی رہی اور تم مجھے بھی ایک مذاق‘ ایک تفریح سمجھتے رہے۔ تمہارا قصور نہ تھا۔ تمہاری تو عادت تھی کبھی بھی کسی بھی معاملہ میں سنجیدہ نہ ہونے کی‘ پھر میں نے کیسے سوچ لیا کہ تم میرے لیے سنجیدہ ہو۔ میں تمہارے انداز کو‘ تمہارے لہجوں کو‘ تمہاری ان کہی باتوں کو محبت سمجھتی رہی اور تم میرے ساتھ کھیلتے رہے۔“

”ماہم! تمہیں صبح آفس نہیں جانا کیا؟“ رابعہ پھر ریلنگ سے جھکی پوچھ رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے سرہلایا‘ اپنے آنسو صاف کیے اور اندر چلی گئی۔

✡ ✡ ✡

پیپرز ہو چکے تھے۔ اکثر لڑکیاں گھر جا چکی تھیں۔ فائنل ایئر کی لڑکیاں آنسو بہاتے ہوئے اور باقی خوش خوش۔ ہاسٹل میں اب بہت کم لڑکیاں نظر آتیں۔ ان میں سے کچھ ایم فل اور دو پی ایچ ڈی کی اسٹوڈنٹس تھیں جن کو ان کے سپروائزرز کی طرف سے انہی فارغ دنوں میں زیادہ وقت اور توجہ ملتی تھی‘ جس کی وجہ سے ان کی ریسرچ میں تیزی آجاتی۔ باقی لڑکیاں آئی ٹی اور کمپیوٹر سائنس کی تھیں جنہیں ابھی پروجیکٹ کا مرحلہ طے کرنا تھا۔ ردا اور وہ دونوں مل کر پروجیکٹ بنا رہی تھیں۔ دُجانے کو اس نے ان دنوں میں جب بھی دیکھا‘ پتا نہیں کیوں اسے کچھ پریشان سا لگا۔ اس نے جب بھی پوچھا اس نے مسکرا کر کبھی اس کا وہم قرار دے دیا۔ کبھی وہ یہ کہہ دیتا کہ پروجیکٹ میں مصروف ہے۔ تھیسس میں لگا رہا‘ نیند پوری نہیں ہوئی۔

ماہم اس کے کسی بھی جواب سے مطمئن نہ ہوتی تھی۔ مگر نہ چاہ کر بھی یقین کرتی رہی کیونکہ وہ اکیلا پروجیکٹ تیار کر رہا تھا حالانکہ چار اسٹوڈنٹس تک ایک گروپ بنایا جاسکتا تھا مگر دجانے نے کوئی گروپ نہ بنایا تھا‘ اس لیے اسے سب کام خود ہی کرنا تھا۔

”آج کل تو تم بلیو مون لگ رہے ہو۔“ ماہم نے ایک دن کہا تو وہ بہت دیر تک اس کی صورت دیکھتا رہا اور پھر ہلکا سا مسکرا کر کوئی اور بات کرنے لگا۔

جس دن پروجیکٹ کی نمائش تھی‘ اس دن سب کی جان نکلی ہوئی تھی۔ وی سی کو دجانے عثمان کا پروجیکٹ سب سے زیادہ پسند آیا۔ وہ آدھے گھنٹے تک اس سے بات چیت کرتے رہے۔ انہوں نے اس کی پریزنٹیشن بھی بہت دلچسپی کے ساتھ اٹینڈ کی۔ بعد میں ماہم کو پتا چلا کہ اسے اس ڈپارٹمنٹ میں لیکچرر شپ کی آفر وہ اسی دن دے گئے تھے۔

اس دن وہ بہت خوش ہوئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ خوامخواہ وہ دجانے پر غصہ کرتی رہتی تھی۔ اسے تو رزلٹ آنے سے بھی پہلے کامیابی مل گئی تھی۔ مگر دجانے کی خوشی کہیں سے ظاہر نہ ہو رہی تھی۔ اور جب اس نے اس پیشکش کی بابت پوچھا کہ اس کا کیا فیصلہ ہے تو بھی اس نے ”ابھی سوچا نہیں۔“ کہہ کر ٹال دیا۔

وہ سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ ماہم منتظر ہی رہی‘ مگر دجانے پہلے کی طرح جاتے ہوئے باتوں باتوں میں کوئی ایسا خوبصورت سا جملہ نہ کہہ کر گیا جو اس کو گھر میں بھی ہر وقت خوش رکھتا۔ کوئی امید کا جگنو اس کے ہاتھ میں تھما کر نہ گیا‘ جو اس کی زندگی کو روشن کردیتا۔ پھر بھی وہ خواب دیکھتی رہی۔ مسکراتی رہی۔ اسے دجانے عثمان پہ بھروسا جو تھا۔

✡ ✡ ✡

کانووکیشن ختم ہونے کے بعد وہ سب ڈگریاں ہاتھوں میں لیے خوشی خوشی آڈیٹوریم سے باہر نکلے۔ توقع کے عین مطابق آفاق نے فرسٹ پوزیشن لی تھی۔ گورنر کے ہاتھ سے ڈگری لے کر اس کی گردن میں کلف لگ چکا تھا۔ ماہم دوسرے نمبر پر اور سمیعہ تیسرے نمبر پر رہی۔ تینوں کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ کوئی بھی پوزیشن نہ لینے کے باوجود پروجیکٹ میں سب سے زیادہ نمبر دُجانے کے تھے‘ مگر وہ اسی طرح

سنجیدہ تھا جس طرح پروجیکٹ کے دنوں میں نظر آرہا تھا۔

کرنل عبدالمجید بھی کانووکیشن اٹینڈ کرنے آئے تھے۔ ماہم نے انہیں سب سے ملوایا۔ آج وہ سب کو ذرا بہتر موڈ میں لگے۔ خلاف توقع آفاق بہت خوش اخلاقی سے ان سے ملا‘ جبکہ دُجانے بہت نارمل انداز میں۔

آج کے بعد سب کو اپنی اپنی زندگی میں مگن ہو جانا تھا۔ پھر جانے کس کی کس سے کب کہاں کبھی ملاقات ہوتی۔ اس لیے سب نے کچھ دیر کے لیے مل بیٹھنے کا پروگرام بنایا۔ ماہم نے پاپا سے اجازت لی‘ سب سندھو دریا کے کنارے بنے ”المنظر“ چلے آئے۔ آفاق اور اس کا گروپ عام طور پر انہیں جوائن نہیں کرتے تھے‘ مگر آج وہ بھی ان کے ساتھ تھے۔

”ساتھیو! آج ہم میں کوئی شاید آخری بار مل رہا ہے اور کسی کو شاید عمر بھر ساتھ رہنا ہے۔“ المنظر کی چھت پر بیٹھ کر جب وہ پلا (دریائے سندھ کی خاص مچھلی) کا آرڈر دے چکے اور خود ان کی اپنی آوازوں سے چھت تو کیا نیچے لان میں بیٹھے بندے بھی اوپر دیکھنے پہ مجبور ہو گئے تھے تو آفاق نے کھنکھار کر بات شروع کی۔

ماہم دجانے کو دیکھ کر مسکرا دی۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا ہلکے سے مسکرا دیا۔

”ہاں! وہ بے فکری کے عیش کے دن گئے اب تو ٹف پریکٹیکل لائف شروع۔“ نعمان بھی بہت اداس ہو رہا تھا۔ چار سال کا ساتھ کم نہیں ہوتا۔

”کچھ سالوں بعد جب ہمیں ان میں سے کوئی لڑکی نظر آئے گی تو وہ ہمیں پہچاننے کی ذرا صلاحیت نہیں رکھتی ہوگی۔ گود میں چڑھے بچے نے اس کا برا حال کر رکھا ہوگا۔“ حسام ہنسا۔

”تم لوگوں نے تو جیسے ابا نہیں بننا۔ تب تم لوگ اپنی بیویوں کی موجودگی میں بڑی شرافت کے ساتھ ہمیں ”آدی“ کہہ کر پکارو گے۔“ ردا کیوں پیچھے رہتی۔ سب نے ہنستے ہوئے‘ کچھ اداس ہوتے ہوئے مستقبل کے نقشے کھینچے۔

”بھئی! ہم کو تو پتا نہیں اب عملی زندگی میں قدم رکھتے ہوئے کتنے دھکے کھانے ہیں۔ لیکن دُجانے کا مستقبل بہت شاندار ہے۔ یہ تو ابھی سے ظاہر ہے..... نہ دھکے‘ نہ کوئی رکاوٹ اور سیدھا امریکہ۔“ آفاق کے کہنے پر ماہم نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ دجانے نے تو اسے کبھی اپنا ایسا ارادہ نہیں بتایا۔ ماہم کو وہ لب بھینچے بہت سنجیدہ لگا۔

”امریکہ‘ مائیکرو سوفٹ اور پھر گرین کارڈ ہولڈر بیوی۔ واہ دجانے! تمہیں تو آئیڈیل لائف مل گئی۔“

المنظر کی چھت زمین بوس ہوئی اور ماہم نور بھی اسی کے ساتھ بہت اوپر سے بہت نیچے گری۔

دُجانے کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ ہر کوئی اسے منہ کھولے تک رہا تھا اور پھر ان کی نظریں ماہم پہ اٹھیں۔ یہاں موجود دجانے اور ماہم کے دوست تو جانتے ہی تھے‘ مگر باقی سب کو بھی اندازہ تھا کہ ماہم اور وہ چاہے عام جوڑوں کی طرح ہر وقت لان کے کسی گوشے میں ایک دوسرے کے ساتھ سر جوڑے نہ بیٹھتے ہوں‘ کیمپس میں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے نہ گھومتے ہوں‘ مگر ایک دوسرے کے ساتھ سنجیدہ ہیں۔

دُجانے کی خاموشی کیا ظاہر کر رہی تھی؟ کلاس میٹس حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اس وقت ماہم کا دل شدت سے یہ چاہا تھا کہ ابھی آفاق قہقہہ لگائے اور کہے ”میں تو مذاق کر رہا تھا۔ حیران کیوں ہوتے ہو..... کیا مذاق صرف دُجانے کر سکتا ہے۔“

اس وقت اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہی تھی کہ دجانے اٹھے اور آفاق کا گریبان پکڑ کر کہے۔ ”تمہاری ہمت کیسے ہوئی ایسا گھٹیا مذاق کرنے کی؟“

مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ آفاق نے قہقہہ لگایا‘ نہ ہی دجانے نے اٹھ کر اس کا گریبان پکڑا۔

ماہم سے مزید ایک لمحہ بیٹھنا بھی ناممکن ہوا۔ وہ اٹھ کر بھاگتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ کسی کی

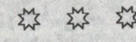
آئی ہمت نہ ہوئی کہ اسے روک سکے اس کے پیچھے جاسکے۔ یہاں تک کہ دجانے عثمان بھی اپنی جگہ سے انچ بھر حرکت نہ کرپایا۔ وہ المنظر سے نکل آئی۔ ایک دفعہ تواس کا جی چاہا' وہ اس دریا میں چھلانگ لگادے۔

آفاق نے بھاگ کر سیڑھیاں اترتے ہوئے ماہم نور اور چپ چاپ بیٹھے دجانے عثمان کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پہ وہی مسکراہٹ در آئی جو ایک فاتح کے چہرے پہ ہوتی ہے۔

کیا کہا تھا ماہم نور نے اس دن کاریڈور میں کھڑے ہوکر۔

"آفاق کوئی آسمانوں سے اتر کر نہیں آیا۔ دجانے! تم آفاق سے کئی گنا زیادہ ذہین ہو' قابل ہو۔ بس کچھ سیریس ہوجاؤ۔ پڑھائی کو مکمل وقت دو۔ پھر آفاق بھلا تمہارے سامنے کیا چیز ہے۔"

اس دن وہ بھی پیپر دے کر وہاں آپہنچا تھا اور یہ الفاظ سن کر اس کے سینے میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ آج اس لمحے بھڑک اٹھنے والی آگ پر چھینٹے پڑ گئے تھے۔ اس نے تعلیمی میدان میں ان کو ہرادیا تھا اور زندگی میں بھی۔ آج آفاق ندیم کی دوہری جیت تھی۔



وہ امریکہ سے واپس آنے کے بعد اس کینٹ گیا تھا' جہاں کرنل عبدالمجید کی پوسٹنگ تھی۔ وہاں سے ان کی ریٹائرمنٹ کا پتا چلا۔ اس فارم کا کسی کو پتا نہ تھا' پھر وہ پنجاب ان کے آبائی شہر گیا۔ وہاں سے اسے اس فارم کا پتا چلا۔ یہ زمین انہیں ریٹائرمنٹ کے بعد گورنمنٹ کی طرف سے الاٹ ہوئی تھی۔ جب وہ وہاں پہنچا تو ریٹائرڈ کرنل عبدالمجید کے پاس اس کا تعارف پہلے ہی بہت غلط لفظوں میں پہنچ چکا تھا۔

اسے بعد میں پتا چلا کہ آفاق' ماہم سے شادی کی خواہش لے کر ریٹائرڈ کرنل عبدالمجید کے پاس پہنچا تھا۔ وہ خود تو ان کے معیار پہ پورا نہ اترا' ساتھ ہی ساتھ دجانے کا امیج بھی خراب کرگیا تھا۔ ان کے نزدیک ماہم کا ہر آنے والے رشتے سے انکار کرنے کی وجہ یہ دجانے عثمان ہی تھا۔

آفاق اس کا وہ حریف تھا جو کھل کر دشمنی کا اظہار نہ کرتا تھا' مگر پیٹھ پیچھے وار کرتا تھا اور اس دشمنی کی وجہ اس کا حسد اور جلن تھی۔ اساتذہ اور طلبہ میں دجانے عثمان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ وہ کتنی بھی محنت اور کوشش کرتا' پھر بھی اس کی طرح ہر دل عزیز نہ ہوتا تھا۔ اسے یہ راز پتا نہ تھا کہ کتابی کیڑا بن کر' سب سے زیادہ نمبر لے کر دل میں نہیں اترا جاتا۔ اس کے لیے حساس دل رکھنا' خادم انسانیت ہونا اور سب سے بڑھ کر عاجزو خاکسار ہونا ضروری ہے۔

اگر آفاق اس دن "المنظر" میں ماہم کے سامنے وہ کچھ نہ کہتا تو حالات تو شاید پھر بھی وہی رہتے' مگر ماہم یوں ایک نظر اس پہ ڈال کر اس کی زندگی سے نہ نکل جاتی۔

کیا نہیں تھا اس ایک نظر میں۔ شکوہ' ٹوٹتے خوابوں کی کرچیاں' تکلیف' رنج اور پتا نہیں کیا کیا.....

اس ایک نظر نے اس کا ہر جگہ' ہر لمحہ سکون برباد کیے رکھا۔ اگر وہ خود اپنی زبان سے سارے حالات بتاتا تو شاید وہ اس کی مجبوری سمجھ جاتی۔ وہ مجبوری جس نے اس کی اولین چاہت کو اس سے دور کردیا تھا۔ دو سال تک بے چین و بے سکون کیا تھا۔ اس مجبوری کا نام تھا قندیل.....

قندیل اس کی کزن اور بڑی بہن سارہ کی نند بھی تھی۔ وہ امریکہ سے ان دنوں آئی ہوئی تھی' جن دنوں دجانے فائنل ایگزامز سے فارغ ہوکر پروجیکٹ شروع کرنے سے کچھ دن پہلے گھر گیا تھا۔ قندیل کافی جذباتی سی لڑکی تھی۔ دجانے عثمان بھا گیا تو بس' پھر واپس جاکر پورے گھر کو نچا ڈالا۔ وہی روایتی سی کہانی شروع ہوئی۔ پہلے تایا تائی نے بہت پیار سے ان کا رشتہ طے کرنے کو کہا۔ جب دجانے نے منع کردیا تو سارہ کو طلاق کی دھمکی دی۔ اگر ایسا ہوجاتا تو قیامت ہی آجاتی۔ ماں باپ نے پہلے دجانے کو پیار سے سمجھایا' وہ نہ مانا' پھر غصہ دکھایا' وہ نہ مانا۔ آخر انہوں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ اب بھی اگر وہ نہ مانتا تو ایک

اچھا بیٹا تو نہ ہوتا نا۔ اس نے ماں کے ہاتھوں کو تھام کر انہیں گلے سے لگالیا۔ وہ ایک اچھا بیٹا بن گیا۔ ایک اچھا بھائی بن گیا۔ اب ماہم کے لیے اسے برا بننا تھا۔ وہ روز اسے بتانے کا سوچتا اور روز اس کی ہمت دم توڑ دیتی۔

وہ اس لڑکی کی آنکھوں میں آنسو کیسے دیکھ پاتا جسے وہ "اداس مت ہوا کرو۔" کہتا تھا۔ وہ کیسے دیکھ پاتا اس چہرے کو تاریک ہوتے ہوئے جسے وہ "میرا چاند" کہتا تھا۔

وہ اسے نہ بتاپایا اور پھر ایک دن آفاق نے بتادیا۔ وہ چلی گئی کچھ بھی کہے بغیر محض ایک نظر ڈال کر۔ اور وہ اسے آواز دے کر' اس کے پیچھے جاکر' اس کا ہاتھ تھام کر اسے روک بھی نہ سکا۔

اس کی منگنی قندیل سے کردی گئی۔ وہ اسے امریکہ بلوانا چاہتی تھی اور دجانے امریکہ چلا گیا مگر اس کے بل بوتے پر نہیں بلکہ اپنی انٹرن شپ کی بنیاد پر۔ ایئرپورٹ پہ قندیل' دجانے سے جس بے باکانہ انداز میں ملی اس نے دجانے کے چھکے چھڑا دیے۔ وہ کئی روز یہ سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ اگر قندیل کے انداز دلربائی آگے بھی یہی رہے تو وہ اپنے ماں باپ کے سامنے تو کم سے کم اس کے ساتھ نہیں جائے گا۔ دو ماہ تک قندیل ہر ویک اینڈ پہ اس سے ملنے آتی رہی اور کم سے کم بھی چھ گھنٹے روزانہ اس کے ساتھ فون پہ بات کرتی رہی۔ دجانے کو اس سے ملنا اس سے بات کرنا پسند ہے یا نہیں' اس سے قطع نظر وہ وہی کرتی تھی' جو اس کا جی چاہتا تھا۔ دجانے اعتراض کرنے پر آتا تو قندیل میں ہر شے قابل اعتراض تھی۔ اس کا لباس' اس کے بے باکانہ انداز' اس کی واہیات قسم کے لڑکے لڑکیوں سے دوستیاں' مگر دجانے نے اپنا منہ بند ہی رکھا ہوا تھا۔ اس نے شاید قندیل کے روپ میں اپنے لیے سزا کو قبول کرلیا تھا..... سزا جو ماہم جیسی لڑکی کو دکھ دے کر ملنی ہی چاہیے۔

تایا تائی نے ان دونوں کا نکاح جلد ہی کرنا چاہا' مگر دجانے کو امریکہ آئے ابھی تین ماہ ہی ہوئے تھے کہ قندیل سلیمان نے ایک دن انگوٹھی اتار کر سارہ کے سامنے پھینک ڈالی۔ اسے کوئی اور پسند آگیا تھا۔

تایا تائی بے حد شرمندہ ہوئے اور دجانے کے دل میں لڈو پھوٹے۔ اگر ماہم اس کی زندگی میں نہ آئی ہوتی تو بھی وہ قندیل جیسی لڑکی کے پیچھے ٹلنے پہ لاکھ شکر ہی ادا کرتا۔ وہ اپنے ماں باپ کو نچا رکھتی تھی تو باقی اس کے سامنے کیا حیثیت رکھتے تھے۔

یہ وہ رشتہ تھا جس کے ٹوٹنے پہ خوشی زیادہ محسوس کی جارہی تھی۔ سارہ' امی اور ابو سب ہی خوش تھے۔ امی نے اسے کہا تھا کہ وہ جیسے ہی پاکستان واپس آئے گا' وہ ماہم کے گھر چلیں گے۔ وہ بہت خوش امید ہوکر پاکستان واپس آیا تھا۔ اس کے دل میں ایک بار بھی یہ خیال نہ آیا کہ اگر ماہم اسے نہ ملی تو.....



ڈیفنس میں بنے اس بنگلے میں وہ تین ماہ پہلے آئی تھی۔ یہ مسز نصرت ہاشم کا گھر تھا۔ وہ بیوہ تھیں اور ان کے بچے ملک سے باہر رہتے تھے۔ ان کا خود باہر دل نہ لگتا تھا۔ وہ گھوم پھر کر وطن واپس لوٹ آتیں۔ تنہائی سے گھبرا کر انہوں نے اپنے گھر کو وومن ہاسٹل میں تبدیل کرلیا تھا۔ اب یہاں دوسرے شہروں سے آکر کراچی میں نوکری کرنے والی سات لڑکیاں رہتی تھیں۔ ماہم ان میں سے ایک تھی۔ وہ ریٹائرڈ کرنل عبدالمجید سے ناراض ہوکر یہاں آگئی تھی۔ وہ اسے کیپٹن اسداللہ کے لیے "ہاں" کرنے پر اسے مجبور کررہے تھے۔ اس کے مسلسل انکار پر انہوں نے اسے دجانے عثمان کا طعنہ دے ڈالا تھا۔

آفاق ندیم اس کے لیے اپنا رشتہ لے کر آیا تھا۔ اس نے پتا نہیں پاپا سے کیا کیا کہا تھا کہ پاپا کئی دفعہ اسے دجانے عثمان کے حوالے سے کرید چکے تھے' مگر یوں کھل کر طعنہ پہلی بار دیا تھا۔

"تم اس گھٹیا شخص کے لیے اپنی زندگی برباد کرنا چاہتی ہو۔"

"آپ کیا کررہے ہیں میرے ساتھ۔ آپ بھی تو

میری زندگی برباد ہی کرنا چاہتے ہیں اس گھٹیا ترین شخص کو میرے لیے چن کر۔" پاپا کے منہ سے دجانے کے لیے ایسے الفاظ وہ برداشت نہ کرپائی اور پہلی بار باپ کے سامنے یوں چلائی۔

پھر وہ وہاں سے چلی آئی۔ اسے اب اپنی ماں کے پاس بھی نہ جانا تھا۔ وہ رابعہ کے پاس چلی آئی جو کراچی میں ملازمت کرتے ہوئے اس ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔ ایک ماہ کی خواری کے بعد یہ نوکری اسے مل گئی۔ پاپا کو پتا نہیں اس گھر کا ایڈریس کس نے دے دیا تھا۔ اس ایک ماہ کے دوران وہ کئی دفعہ اس کے پاس آئے تھے مگر وہ ان کے ساتھ واپس جانے کو تیار نہ ہوئی۔

جب وہ کسی طور پاپا کے ساتھ جانے کو راضی نہ ہوئی تو انہوں نے ممی کو اس کے پاس بھیجا۔ لیکن اس نے ممی کے ساتھ جانے سے بھی صاف انکار کردیا۔ اسے اس گھر میں نہیں جانا تھا جہاں ممی کو اپنے لاڈلے بیٹے صائم کے علاوہ کوئی اور نظر ہی نہیں آتا ہے اور وہ بدتمیز اور اکھڑ مزاج لڑکا ہمیشہ ماہم سے بدتمیزی کرتا۔ ممی بجائے اسے روکنے کے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کئی جتن کر ڈالتیں اور ماہم کی آنکھوں میں آنسو انہیں نظر ہی نہ آتے۔ وہ اس ماں کے ساتھ جا کر کرتی بھی کیا جس کے پاس اس کے لیے وقت تھا نہ ہی پیار۔

اب وہ ایک خود مختار لڑکی تھی۔ اب سانس لینے کے لیے کرنل عبدالمجید یا ندرت جہاں آرا کی ضرورت نہ تھی۔ اب اسے جینے کے لیے دجانے عثمان کی ضرورت نہ تھی۔

✡ ✡ ✡

وہ سیٹی کی دھن بجاتا بسمہ کے سامنے آیا۔

"بسمہ! مجھے بلیو مون مل گئی ہے۔" وہ چپ رہی۔ یہ خوش خبری اسے سجیل سنا چکا تھا۔

"میں کہتا تھا نا کہ بلیو مون ایسی نہیں۔ وہ دھوکا دے ہی نہیں سکتی۔" اس کا اطمینان اور اس کا یقین جیت چکا تھا۔ بسمہ نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔

"بندے کا پتا ایک جملے میں ایک ملاقات میں چل جاتا ہے۔"

"اچھا... پھر میرے بارے میں تمہیں کیا لگتا ہے؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"کیا مطلب؟"

"مجھے تو بچپن سے دیکھ رہے ہو؟"

"چھوڑو بھئی! میں ماسیوں پہ اتنی توجہ نہیں دیتا۔ بسمہ! تم اس کی نیلی آنکھیں دیکھ لو تو... تو... آئی کانٹ ٹیل یو یار۔" بسمہ کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتری۔

"اور اس کی آواز... مائی گاڈ، اتنی اچھی آواز بھلا کسی کی ہو سکتی ہے۔ پتا ہے بسمہ! اس نے کیا کہا؟ اس نے کہا، وہ بھی مجھ پر اتنا ہی یقین اتنا ہی اعتبار کرتی ہے، تب ہی تو اس نے مشکل میں مجھے پکارا۔"

بسمہ نے گہری سانس لی اور اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو اس سے چھپانے کے لیے رخ موڑ لیا، مگر جلد احساس ہوا کہ اگر وہ ایسا نہ بھی کرتی تو طیب کو کون سا محسوس ہوتا۔ اسے آج بلیو مون کے علاوہ کچھ اور نظر کب آرہا تھا۔ اگر وہ اتنی گہری نگاہ رکھنے والا ہوتا تو اس کی نظر کسی اور لڑکی کی طرف اٹھتی ہی نہ۔

✡ ✡ ✡

رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ طیب پوری طرح طیب بنا ہوا تھا۔ نماز روزے کے ساتھ ساتھ قرآن کی تلاوت میں بھی باقاعدگی آگئی تھی۔ سحری کے لیے خود کچھ نہ کچھ بنا لیتا۔ افطاری ماموں کے گھر پہ کرتا۔ سجیل کی ڈیوٹی آج کل بہت سخت ہو گئی تھی۔ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے اسپتال میں ہوتا تھا۔ آج ساتویں روزے پہ پہلی بار بے چارے کو گھر میں افطار کرنے کا موقع ملا تھا۔ طیب واپسی پہ اسے ساتھ کھینچ لایا۔

"میری گاڑی نکال۔" دروازہ کھلتے ہی اس کے سینے پہ کسی نے ہاتھ رکھا اور اسے چوکھٹ پہ ہی روک دیا۔

"ارے! تم کب آئے؟" طیب کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

"اس بات کو چھوڑ۔ میری گاڑی نکال۔" وہ سجیل سے گلے ملتے ہوئے بھی اسی سے مخاطب تھا۔

"وہ تو ڈاکوؤں کے پاس ہے۔"

"تجھے کیوں نہیں لے گئے ڈاکو۔ میری ہی گاڑی نظر آئی تھی انہیں؟" وہ لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر بولا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں نے تمہاری گاڑی جتنے پیسے جمع کر لیے ہیں۔" طیب نے مسکرا کر کہا تو وہ راستے سے ہٹ گیا۔

"پر اب ان سے میں نے اپنے لیے گاڑی لے لی ہے۔" آگے قدم بڑھاتے ہوئے اس نے اطمینان سے کہا۔

"ابے تجھے تو..." اس نے اسے صوفے پہ پیچھے دھکا دے کر گرایا۔ "میری گاڑی پہ ڈاکا ڈلوا کر اپنی گاڑی لے لی۔"

"ڈاکا نہ کہو، وہ تو صدقہ تھا بلیو مون کے سر کا۔" سجیل ہنسا۔

اس کا ہاتھ مکا بنا جہاں تھا، وہیں کا وہیں رہ گیا۔ پھر وہ سلو موشن میں پیچھے کو ہوا۔ طیب نے سیدھا ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔

"تم... تم میری ماہم کو جانتے ہو؟"

"ماہم؟؟؟" سجیل سوالیہ نشان بنا۔

"طیب! تم ماہم کو کیسے جانتے ہو؟" وہ بے قراری سے پوچھ رہا تھا۔ جبکہ طیب پہ اس سال میں یہ دوسری بار سکتہ طاری ہوا تھا۔

"سجیل! تم نے تو ابھی بلیو مون کا نام لیا نا۔" وہ سجیل کی طرف مڑا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ میری ماہم ہی تو ہے۔"

"تجھے کس نے کہا کہ وہ تیری ماہم ہے؟" سجیل حیرت سے بولا۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ ماہم ہے۔ میں ہی تو اسے "بلیو مون" کہتا تھا۔ طیب... طیب!" وہ بے قراری سے اس کی طرف بڑھا۔ "طیب! پلیز بتاؤ، ماہم کہاں ہے؟ میں اسے ڈھونڈ ڈھونڈ پاگل ہو گیا ہوں۔ طیب پلیز مجھے اس کا پتا بتا دو۔" طیب ابھی بھی کچھ کہنے جوگا نہ تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کی منت کرنے لگا۔

"دیکھ... میں اپنی گاڑی بھول جاؤں گا۔ فلیٹ کا پورا کرایہ میں دوں گا۔ گھر کے سارے کام میں کر دوں گا۔ دیکھ تو صرف مجھے اس کا پتا بتا دے۔"

"اگر تو نے اتنی گولڈن آفرز دینی ہیں تو بلیو مون کا پتا میں بتا دیتا ہوں۔" سجیل اس کے نزدیک ہوا۔ "مجھے اس کے فارم کا پتا ہے۔"

"گولی مار اس کے فارم ہاؤس کو... اس کا کمینہ باپ مجھے اس سے ملنے نہیں دیتا۔" وہ جھنجھلایا اور طیب کی طرف دوبارہ پلٹا۔ "طیب! تم اس سے کہاں ملے ہو؟ کیا تم اس کی ممی کے گھر کا پتا جانتے ہو؟"

وہ صوفے کے پاس نیچے اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے شدید مضطرب و بے چین پوچھ رہا تھا اور طیب کو یقین تھا کہ اگر اس کا منہ اب بھی بند رہا تو وہ اس کے پیروں کو بھی ہاتھ لگا دے گا۔ اس نے اسے کسی ماہم نور کے لیے اتنا ہی دیوانہ دیکھا تھا۔ اتنا ہی سچا دیکھا تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ آفس کی گاڑی سے نکل کر جیسے ہی مڑی، بت بن کر رہ گئی۔ سامنے وہ شخص کھڑا تھا جو اسے ہر وقت، ہر جگہ نظر آتا تھا اور جس کے اس وقت یہاں ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

وہ بھی اسے اسی طرح دیکھ رہا تھا۔ اسی طرح سحر زدہ سا کھڑا تھا۔

آخر وہ اس کے سحر سے نکلی اور چند قدم چل کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی، جس سے نفرت کرنے کی بھرپور کوشش کے باوجود کبھی اسے بھلا نہ پائی تھی۔

"کیسے ہو دجانے؟" وہ اپنے لہجے کو ہر ممکن حد تک نارمل رکھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر لرزش پھر بھی باقی رہی۔

"ماہم! میں تم سے کتنی دفعہ ملنے تمہارے فارم ہاؤس گیا۔ تم مجھ سے ملی کیوں نہیں؟" وہ اس کے

سوال کو نظر انداز کیے پوچھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں استعجاب سمٹ آیا۔

"مجھے پتا تھا' مجھے پتا تھا تمہارا باپ کبھی تمہیں نہیں بتائے گا کہ دجانے عثمان نے اس کے در کے کتنے چکر لگائے؟"

"تم مجھ سے ملنے کیوں آتے تھے؟" اسے اپنے پاپا کے بارے میں اس طرح بات کرنا اچھا نہیں لگا۔

"کیوں کہ مجھے تم سے بات کرنی تھی۔"

"کیوں بات کرنی تھی؟"

"ماہم! اجنبیوں کی طرح بی ہیو مت کرو۔" وہ چیخا۔

"اندر آؤ' بیٹھو' پھر بات کرتے ہیں۔" وہ نرمی سے کہہ کر مڑ گئی۔ وہ دجانے عثمان تھا جو اسے پل میں پگھلا کر موم کر دیتا تھا۔

وہ اسے اپنے کمرے میں ہی لے آئی۔

"بیٹھو! میں چائے....."

"ماہم! پلیز مجھ سے اجنبی بن کر مت بات کرو۔ مجھے کچھ کھانا پینا نہیں' صرف تم سے بات کرنی ہے۔"

"بیٹھو۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور خود بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔

"ماہم! تم کہاں چلی گئی تھیں؟ کتنا ڈھونڈا میں نے تمہیں؟" ماہم نے شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہارے فارم ہاؤس گیا۔ تمہارے پاپا نے تم سے ملنے ہی نہیں دیا۔" وہ جانتی تھی کہ ایسا ہی ہوا ہو گا۔

"میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا اور دیکھو! تمہارا پتا ملا بھی تو کس سے' اپنے ہی گھر کے بندے سے۔" ماہم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"طیب..... کزن ہے وہ میرا۔"

"اوہ! تو وہ بلیک ہونڈا سوک جو ڈاکو لے گئے....." وہ فوراً بولی۔ اس لمحے اسے وہ اپنی پہلی والی ماہم لگی تھی۔

"وہ میری تھی۔" دجانے مسکرایا۔ جبکہ اسے تکلیف ہوئی۔ اس گاڑی کے ساتھ بھی اس کی ایک جذباتی وابستگی تھی۔

"اسی کے "خون بہا" کے طور پہ تو اس سے تمہارا ایڈریس لیا ہے میں نے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے دجانے؟" دجانے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ ایک بار پھر اجنبیت کے خول میں بند ہونے جا رہی تھی۔

"تاکہ اپنے پیرنٹس کو تمہارے گھر بھیج سکوں۔"

"کیوں؟"

"تاکہ تمہیں بہو بنانے کی درخواست تمہارے پاپا یا ممی کو پیش کر سکیں۔"

"کیا مطلب.....؟" وہ ایک دم بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تمہاری..... تمہاری شادی ہوئی نہیں کیا؟"

"نہیں۔" وہ مزے سے اس کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

"تو کیا آفاق جھوٹ بول رہا تھا؟ اور وہ تمہاری خاموشی؟ جھکی نظریں؟"

"آفاق جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس وقت وہی سچ تھا۔" وہ اسے ساری بات بتاتا چلا گیا اور وہ دم سادھے سنتی گئی۔ اسے ساری بات بتانے کے بعد وہ پھر ایک بار کاسۂ دل اس کے سامنے پھیلائے کھڑا تھا۔

"میں کیسے تم پہ اعتبار کر لوں دجانے عثمان۔ کل کوئی مجبوری آئی' تم مجھے پھر چھوڑ جاؤ گے۔"

"نہیں ماہم! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ویسے ہی جیسے پہلے ہو چکا ہے۔" وہ اس سے نفرت نہ کرتی تھی تو اب اعتبار بھی نہ کرتی تھی۔

"ماہم.....!"

"پلیز دجانے! اگر تم چاہتے ہو کہ ہم دوستوں کی طرح ہی ایک دوسرے کے ساتھ بات کریں تو پھر اس ٹاپک کو اب ہمارے بیچ نہ لانا۔ وہ ماہم نور اور تھی جس نے اس دجانے عثمان کے ساتھ کے خواب سجائے تھے۔ وہ دجانے عثمان جو کسی بھی مجبوری میں اسے چھوڑ کر جا سکتا ہے۔"

وہ بت بنا اس کا یہ روپ دیکھ رہا تھا۔ ماہم نور اب وہ نہ رہی تھی۔ ماں اور باپ کے بیچ ڈولتی ماہم' اس کے ساتھ کے سپنے آنکھوں میں سجاتی ماہم۔ اس کے

سامنے وہ ماہم نور کھڑی تھی جس نے اب رشتوں کے بغیر رہنا سیکھ لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کون کہتا ہے اکلوتے ہونے کا فائدہ ہوتا ہے..... دونوں گھروں نے مجھے ماسی سمجھ رکھا ہے۔" بسمہ طیب کے کمرے سے نکلی۔

"اور ایک یہ....." اس نے سجیل کی طرف اشارہ کیا۔ "ڈاکٹر ہی پسند کر ڈالی۔ لوگوں کی بھابیاں آتی ہیں' عیش کراتی ہیں اور اس کی بیوی کی بس صبح شام صورت ہی نظر آیا کرے گی۔ مجھے عیش کیا خاک کرائے گی۔"

"وہ ڈاکٹر ہے' قوم کی خدمت کرے گی۔" سجیل نے ولولہ انگیز انداز میں بیان داغا۔

"ہاں! اور ساس' نندیں قوم میں کب شامل ہوتی ہیں۔" وہ تپتے ہوئے طیب کے کمرے میں چلی آئی۔

"طیب کہاں ہے؟ میں نے اس کا منہ چومنا ہے۔" دجانے گھر کے اندر گھستے ہی سجیل کو پرے ہٹا کر ادھر ادھر جھانکنے لگا۔ اس پہ نظر پڑی تو بانہیں پھیلا کر اس کی طرف بڑھا۔ "طیب! میری جان! آئی وانٹ ٹو کس یو یار!"

"گھٹیا انگریزی فلمیں دیکھ دیکھ کر تو نے ایسی ہی بے غیرتی دکھانی ہے۔" سجیل کی بات پہ دھیان دیے بغیر اس نے طیب کو قابو کر کے اس کا سر اور منہ چوم ڈالا۔ طیب ایسی افتاد کے لیے تیار نہ تھا۔

"طیب تو کتنا پیارا ہے' تو میرا شہزادہ ہے۔"

"گھر سے نکلتے وقت تو تم بالکل نارمل تھے۔" سجیل کی بات اب بھی اس نے نہ سنی تھی۔

"تیری وجہ سے میری ماہم پھر سے میری زندگی میں آئی۔ میں تیرا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

طیب کو اس کی "چومیاں" ڈنک مارنے لگیں۔ اس نے رگڑ رگڑ کر اپنے گال صاف کیے۔

"وہ میری بلیو مون ہے۔"

"وہ میرا چاند ہے۔"

"وہ میری بلیو مون ہے۔"

"وہ میرا چاند ہے۔"

"جب تم دونوں فیصلہ کر لو تو مجھے بتا دینا۔ میں نکاح کے چھوارے کھانے پہنچ جاؤں گا۔" سجیل نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر لیا اور صوفے پہ اطمینان سے جم کر بیٹھ گیا۔

"فیصلہ کی کیا بات ہے' بلیو مون میری ہی ہے۔ یہ دجانے خوامخواہ میرے اور بلیو مون کے بیچ میں آ گیا۔"

بسمہ دروازے پر ہی بت بن کر کھڑی رہ گئی۔

"تم میرے اور میرے چاند کے بیچ آئے ہو طیب جان!"

"میں بلیو مون کو پسند کرتا ہوں۔" اس کے اتنے واضح اظہار پہ بسمہ کا رنگ فق ہوا۔

"اور ماہم؟ ماہم کسے پسند کرتی ہے' سوال تو یہ اٹھتا ہے۔" دجانے کا اطمینان عروج پر تھا۔

"وہ مجھے ہی پسند کرتی ہے..... اس نے کہا کہ..... کہ میں شریف لڑکا ہوں۔" دجانے نے اس طفل مکتب کی بات سن کر قہقہہ لگایا۔ طیب کو اس سے زیادہ خبیث وہ پہلے کبھی نہ لگا تھا۔

"تم دیکھ لینا' وہ مجھ سے ہی شادی کرنا چاہے گی۔"

"تم دیکھ لینا' وہ میرے علاوہ کسی اور کی طرف دیکھے گی بھی نہیں۔" ماہم نے بے شک اسے صاف انکار کر دیا تھا۔ مگر وہ اس کی آنکھوں میں اپنے نام کے دیپ جلتے دیکھ رہا تھا۔ وہ خفا تھی تو کیا ہوا' وہ اسے منا لے گا۔ اسے کامل یقین تھا۔ بے شک وہ رشتوں کے بغیر جینا سیکھ گئی ہو۔ مگر محبتوں کے بغیر..... محبتوں کے بغیر بھی بھلا جیا جا سکتا ہے۔

"دیکھ لوں گا۔"

"ہاں.....! میں بھی دیکھ لوں گا۔"

دونوں منہ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک دوسرے کو چیلنج کر رہے تھے اور بسمہ صرف طیب کی صورت دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بلیو مون! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

طیب نے اس کے آن لائن ہوتے ہی اسے پروپوز کر ڈالا۔ اب وہ مزید کسی تاخیر میں پڑ کر دجانے کو راستہ دینے کے موڈ میں نہ تھا۔

"مگر میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں۔" بلیو مون کے الفاظ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ بھونچکا رہ گیا۔ وہ اس کی طرف سے اتنے صاف جواب کی امید نہ رکھ رہا تھا۔

"کون ہے وہ....؟" اس کے سینے میں درد اٹھا۔

"دُجانے عثمان۔" جواب آنے میں ایک پل بھی نہ لگا تھا اور طیب طاہر کا دل ٹوٹنے میں شاید اس سے بھی کم وقت۔ اس کے سینے کا درد بڑھ کر بائیں بازو تک پھیل گیا۔

"وہ... وہ... بلیو مون! وہ کوئی شریف بندہ نہیں ہے۔ اس کے تین لڑکیوں سے افیئر رہ چکے ہیں۔"

"نہیں.... اس کے افیئر چار لڑکیوں سے تھے۔ وہ مجھے بتا چکا ہے۔" اطمینان بھرا جواب آیا۔

طیب نے بے اختیار اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ تکلیف تھی کہ بڑھتی جارہی تھی۔

"دیکھو بلیو مون.... اس کی منگنی ہو چکی تھی۔"

"جواب ٹوٹ چکی ہے۔" طیب سے سانس لینا بھی مشکل ہوا۔ وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کر نیچے کو جھکا۔ اس کا دل جواب دینے کو تھا۔

"بٹ آئی لو یو بلیو مون!" وہ زندگی کی بازی ہارنے سے پہلے ایک کوشش پھر کرنا چاہتا تھا۔

"بٹ آئی لو دجانے عثمان۔"

اس نے تکلیف سے اپنا سینہ مسلنا شروع کر دیا۔ اس کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ اس نے لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیے۔ سجیل اندر آیا تو اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ وہ تیزی سے آیا۔

"مجھے لگ رہا ہے میری زندگی کی آخری سانسیں ہیں۔ میرے ہارٹ فیل ہونے والا ہے۔" اس نے اپنا سینہ زور سے مسلا۔ اس کے چہرے پہ پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ سجیل نے تیزی سے اسے طبی امداد پہنچانے کی کوشش کی۔

"الوداع.... الوداع بلیو مون۔" اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھر اس کی نگاہوں کے سامنے بسمہ کا رویا رویا سا خفا خفا سا چہرہ آیا۔

"بسمہ.... ! بسمہ کہاں ہے سجیل؟" اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔

"وہ اعتکاف میں بیٹھی ہے۔"

"اوہ بسمہ! مجھے ایک اور زندگی مل جاتی تو عمر بھر تمہارے پیار کی قدر کرتا۔ تمہیں یوں رلا کر خفا کر کے نہیں جاتا... مجھے معاف کر دینا۔" اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ ایک منٹ بعد سجیل نے اسے دھکا دے کر پرے پھینکا۔

✲ ✲ ✲

بلیو مون تو حیران رہ گئی اور وہ اس سے زیادہ حیران۔ اگر بلیو مون نے اسے انکار نہیں کیا تھا تو وہ کون تھا جس کو اس نے ماہم سمجھ کر پروپوز کر ڈالا تھا۔

"میرا اکاؤنٹ تو پچھلے ہفتے سے ہیک (Hack) ہو چکا ہے۔ اسی لیے تمہیں کل موبائل پہ میسج کیا تھا۔" یہ سن کر کہ اس نے اسے چیٹ کے دوران پروپوز کیا تھا' وہ بتا رہی تھی۔ "ویسے بھی مجھے ابھی شادی نہیں کرنی طیب! اس لیے اگر میں ہی آن لائن ہوتی تو بھی میرا جواب بھی وہی ہوتا۔"

انکار کا جھٹکا طیب کو دو دن پہلے لگ چکا تھا۔ اس لیے اس انکار کو ذہنی طور پر دو دن سے قبول کر چکا تھا۔ اس وقت تو وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آخر کس نے بلیو مون کا اکاؤنٹ ہیک کیا ہو گا۔ تھوڑے گھوڑے دوڑانے کے بعد ہی اس نے دانت پیسے۔

"دجانے.... خبیث.... پرسوں رات کتنے مزے سے پوچھ رہا تھا کہ "ماہم نے تمہیں ریجیکٹ کر دیا۔" اور تب وہ کتنا دکھی ہو کر سوچ رہا تھا کہ ماہم نے انکار کیا' سو کیا' اس کمینے کو کیوں بتا دیا۔ حالانکہ ماہم کو تو اس پروپوزل کی خبر ہی نہ تھی۔ تو دجانے کو کیسے پتا چلا۔"

اس کا مطلب تھا بلیو مون کے اکاؤنٹ سے وہی

آن لائن ہوا تھا۔

دو دن وہ اسے گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ مگر منہ بند ہی رکھا۔ حالانکہ زبان تو کیا اسے دیکھ کر اس کا اپنے ہاتھ پاؤں کھولنے کا بھی بہت جی چاہتا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے اب اسی کے انداز میں مزا چکھائے گا۔ دو دن بعد جب بلیو مون آن لائن ہوئی بلکہ "ہوا" تو وہ اسکرین کو گھورتے ہوئے سیدھا ہو بیٹھا۔

"گھٹیا' خبیث! دفع ہو میری نظروں سے۔" اس نے بلیو مون کو میسج بھیجا۔

"طیب طاہر! تم مجھے گالیاں دے رہے ہو؟" بلیو مون کی طرف سے میسج آیا۔

"ہاں! کیونکہ تو ہے ہی گالیوں کے قابل۔" طیب نے ایک دو گالیاں مزید بھیج دیں۔ اپنے دل کو ہلکا کیا اور بلیو مون کو بلاک کر دیا۔ سکون سا اس کے اندر اتر آیا۔

✲ ✲ ✲

وہ اور سجیل عید کی شاپنگ کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح سجیل کی شاپنگ اسے بور کر رہی تھی۔ وہ جس دکان میں گھستا' جب تک سیلز مین کو عاجز نہ کر دیتا' وہاں سے نہ نکلتا اور آج تو موصوف کی اپنی شاپنگ کے ساتھ ثنا کے لیے گفٹ کا سوال بھی تھا تو کیسے جلدی فارغ ہو جاتا۔ مال میں پہنچتے ہی اس نے سجیل کو آزادی دی یا سجیل نے اسے۔ یوں وہ اپنی اپنی شاپنگ کرنے لگے۔ جب وہ جوتوں کی دکان میں داخل ہونے لگا' اس کی نظر بلیو مون پر پڑی۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچتا' بلیو مون آگے بڑھ گئی۔ وہ اس کے نظر انداز کرنے پہ حیران رہ گیا۔

"شاید آج اس کے ساتھ جو لڑکی تھی' اس کی موجودگی میں اس کے ساتھ بات نہ کرنا چاہتی ہو۔" وہ یہ سوچ کر اس کے پیچھے نہیں گیا۔ مگر اس کا دھیان بلیو مون کی طرف ہی تھا۔ اسے خود سے کیا اپنا وعدہ یاد آیا کہ اب اسے بلیو مون کے بارے میں مزید کچھ نہیں

سوچتا۔ پھر بھی اسے مستقل سوچتے ہوئے بے توجہی سے اس نے شاپنگ کی اور پھر یوں ہی باہر آکر ریلنگ پہ دونوں بازو رکھ کر نیچے دیکھنے لگا۔ اپنی شاپنگ کر کے وہ یوں ہی سجیل یا دجانے کے فارغ ہونے کا انتظار کیا کرتا تھا۔

اسے محسوس ہوا کہ اس کے دائیں طرف کوئی خاموشی سے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے آہستگی کے ساتھ گردن گھما کر دیکھا تو بلیو مون تھی۔

"آپ کس قسم کی زبان استعمال کر رہے تھے طیب.... میں تو یقین ہی نہیں کر رہی تھی کہ یہ میرا دوست طیب طاہر ہے۔" اس کا لہجہ شکوہ لیے ہوئے تھا۔

"کک.... کیا مطلب؟"

"آپ نے اس دن آن لائن ہوتے ہی مجھے گالیاں دیں۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ کبھی آپ سے بات نہیں کروں گی۔ مگر پھر آپ کی طرف چلی آئی۔ میں آپ سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکتی کہ کیا ہمارا تعلق بھی ویسا عام سا تھا، جیسا کسی بھی لڑکے، لڑکی کے بیچ ہوتا ہے۔ میں نے آپ کو انکار کر دیا تو آپ نے دوستی بھی ختم کر ڈالی اور ایسی زبان استعمال کی۔"

چند لمحے تو وہ کچھ بولنے کے قابل نہ رہا۔

"آپ.... آپ کا تو اکاؤنٹ ہیک ہو گیا تھا نا۔"

"ہاں.... مگر دُجانے نے ری کور (recover) کر دیا۔" وہ اپنے بالوں کی لٹ کان کے پیچھے اڑستے ہوئے معصومیت کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

"خبیث۔" طیب دانت پیس کر رہ گیا۔

"یو نو.... یہ تو اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔"

"جی.... جی۔" طیب کا بس نہ چل رہا تھا کہ اس کو جا کر تیسری منزل سے نیچے دھکا دے دے۔

"وہ اصل میں، میں تو گالیاں اس ہیکر کو دے رہا تھا۔ مجھے کیا پتا آپ کا اکاؤنٹ ری کور ہو گیا ہے۔"

اسے بروقت وجہ سوجھی جو کہ تھا تو ایک سچ ہی نا۔ گالیاں تو وہ اس خبیث کو ہی دے رہا تھا۔

"اچھا...." اس کے چہرے پہ ایک دم چمک آئی۔

"وہی تو.... میں سوچتی تھی کہ طیب ایسے ہو ہی نہیں سکتے۔" وہ آج بھی اس پہ یقین کرتی تھی۔ طیب اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"اچھا ہوا کہ میں نے غلط فہمی دور کر لی۔ ورنہ ایک اچھے دوست سے محروم ہو جاتی۔ وہ دوست جس پہ مجھے بہت اعتبار ہے۔"

"آپ کو اتنا یقین، اتنا اعتبار ہے میرا؟"

"ہاں۔" وہ بغیر سوچے فوراً بولی۔

"تو پھر میری ایک بات کا اعتبار کریں گی۔" وہ بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ بلیو مون نے ہلکے سے سر اثبات میں ہلایا۔

"دجانے کے ساتھ واقعی زبردستی ہوئی تھی۔" بلیو مون کے چہرے کا رنگ ایک دم بدلا اور وہ نظریں جھکا گئی۔

"اپنی بہن کا گھر بچانے کے لیے اس ضدی لڑکی کی خواہش پر دجانے کو خالہ، خالو کی بات ماننی پڑی تھی۔ میں اس بات کا گواہ ہوں اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کسی کلاس میٹ کو بہت پسند کرتا تھا اور وہ آپ تھیں، یہ اب جانا ہے۔" اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔ "جب ایک دفعہ آپ بحث کر رہی تھیں کہ مرد کبھی بھی مجبور نہیں ہوتا۔ وہ صرف بہانے بناتا ہے تو میں نے آپ کو اپنے ایک کزن کے بارے میں بتایا تھا نا کہ کیسے مجبور ہو کر وہ اپنی خواہش سے پیچھے ہٹا۔ میں دُجانے کی بات ہی کر رہا تھا۔" اس نے اپنی کسی پرانی چیٹ کا حوالہ دیا۔

"بلیو مون! میں غلط نہیں کہہ رہا۔"

بلیو مون نے نظریں اوپر اٹھائیں تو ان نیلے سمندروں میں طوفان کی پیش گوئی تھی۔ وہ اپنے لب کچلتے ہوئے شاپنگ بیگ اٹھا کر وہاں سے چل دی۔ طیب اسے چاہ کر بھی روک نہ سکا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تیرے لیے قربانی دے دی ہے.... تیرا رشتہ دے آیا ہوں آج بلیو مون کو۔" تراویح ادا کر کے

دونوں گھر میں داخل ہوئے تو لاک کھولتے ہوئے طیب نے اسے مطلع کیا۔

"تم.... تم ملے تھے کیا ماہم سے؟" اس نے بے چینی سے پوچھا اور پھر ٹون ایک دم بدل گئی۔ "مگر تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے اجازت لیے بغیر میری ماہم سے ملنے کی؟"

"وہ مجھے مال میں ملی تھی۔ وہیں تیرے نام کا وظیفہ پڑھ کر آیا ہوں۔" اس نے فریج میں سے پانی نکالتے ہوئے اس پہ احسان جتایا۔

"اچھا! پھر ٹھیک ہے۔" اس نے اطمینان سے سر ہلایا اور پھر غور سے طیب کی طرف دیکھنے لگا۔ "ایک بات پوچھوں طیب؟"

"پوچھ۔"

"کیا میں واقعی تمہارے اور ماہم کے بیچ آگیا ہوں۔"

"نہیں! میں تمہارے اور ماہم کے بیچ آگیا تھا۔" طیب نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ دجانے نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔

"میں بہت سیریسلی پوچھ رہا ہوں طیب! تمہاری انوالومنٹ ماہم میں کس حد تک ہے؟"

"اس حد تک جتنی ایک دوست کی بہت اچھے اور سچے دوست میں ہوتی ہے۔"

"تم نے تو اسے پروپوز کیا تھا نا طیب؟"

"ہاں...." طیب نے سر ہلایا۔ "کیونکہ میں اس کو کھوجنا چاہتا تھا۔ اس کا جواب جاننا چاہتا تھا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جس حد تک میں نے تمہیں اس کے لیے فائٹ کرتے ہوئے، پھر اسے تلاش کرتے ہوئے دیکھا ہے، کیا وہ بھی تمہارے لیے اتنی ہی پاگل ہے۔"

"تو پھر تمہیں کیا لگتا ہے، وہ میرے لیے کس حد تک پاگل ہے؟" مطمئن ہو کر دجانے مسکرایا۔

"وہ تو اس کا جواب تمہیں ہی دے گی۔ میں نے تو تمہارے نام پہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہی دیکھے ہیں۔ وہ آنسو جو تم نے دیے ہیں اور تمہیں ہی چننے ہیں۔"

"ہاں! وہ مجھ سے ناراض ہے، بہت.... میں نے اس کا بھروسا ختم کیا۔"

"تو تم اس کو مناتے کیوں نہیں؟"

"وہ مان جائے، اگر ہمارے بیچ سے اس کا کرنل پاپا، اس کی چیف آف آرمی اسٹاف ممی اور اس کا گھٹیا نیٹ فرینڈ نکل جائے۔"

"تم نے مجھے گھٹیا کہا۔" طیب نے بوتل کاؤنٹر پہ ماری۔ "ٹھیک ہے، میں ہی پاگل تھا جو تیری دکھ بھری داستانیں سنا کر تیرے لیے اس کا دل موم کر رہا تھا۔ اب میں اسے بتاتا ہوں تیری اصلیت اور یہ کہ اس کا اکاؤنٹ بھی تو نے ہیک کیا تھا۔" وہ جو چائے بنانے کا ارادہ کر رہا تھا، اب اپنے کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا۔

"اچھا سوری!" دجانے فوراً لائن پہ آیا۔ "دیکھ! میں تیرے لیے کھانا لگا رہا ہوں، چائے بناتا ہوں اور برتن بھی میں ہی دھوؤں گا۔"

"ہوں.... ایک اور کام۔ میں نے تیری طرف سے اس کا دل صاف کیا ہے تو میری طرف سے کرے گا۔ اسے بتائے گا کہ وہ گالیاں میں نے واقعی ہیکر کو دی تھیں۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے میرے بھائی! بتادوں گا۔ تیرا دل چاہے تو دو گالیاں اور دے لے۔ ہیکر تیرے سامنے کھڑا ہے۔ مگر یاد رکھنا! شادی کے فوراً بعد اس کا یہ اکاؤنٹ ختم کرادوں گا۔ کیونکہ میرے ساتھ وہ "بلیو مون" نہیں "ہنی مون" ہوگی اور ہنی مون والے اکاؤنٹ میں وہ تجھے ایڈ نہیں کرے گی۔"

"ہاں ہاں! مجھے بھی تیری ہنی مون میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہوگا۔" وہ ہاتھ نچا کر بولا اور پھر مانیٹر کی اسکرین پہ نظریں جماتے ہوئے اپنی آنکھوں میں آئے پانی کو نامحسوس انداز میں صاف کیا۔

بلیو مون اور اس کا غم کا ساتھ تھا۔ خوشی کے دنوں میں وہ اس کی زندگی میں آنا چاہتا بھی نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی خوشیوں کو مکمل اپنے جیون ساتھی کے نام ہی کرے۔

☼ ☼ ☼

چاند نظر آگیا تھا۔ بسمہ اعتکاف سے نکلی تو ہر طرف سے پیار اور مبارک باد وصول کرنے لگی۔ اس کے چہرے پہ انوکھی سی چمک اور سکون تھا۔ پھوپھو نے خود سے لپٹا کر جی بھر کر اسے پیار کیا۔ امی کچن سے نکل کر نند کے پاس جا بیٹھیں اور اس کو کچن میں انٹری مارنی پڑی کہ سجیل کے سسرالی بھی اسے اعتکاف کی مبارک باد دینے آدھے گھنٹے تک آرہے تھے۔

"افطاری کے بعد اتنا کھانا بھلا کون کھاتا ہے؟" اس نے سجیل کی لسٹ دیکھ کر کہا۔ جو اس کے سسرالیوں کے لیے ترتیب دیا گیا مینیو تھا۔

"کھائیں نہ کھائیں' ڈائننگ ٹیبل تو سجا ہونا چاہیے۔" وہ سجیل کو گھورتے ہوئے ان کے لیے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ وہ کام وام تو کوئی کراتا نہیں تھا۔ مگر ہر دو منٹ بعد کچن میں پہنچا ہوتا۔

"ثنا کی ممی کے لیے مرچیں کم رکھنا۔" پھر نئی ہدایت لیے آکھڑا ہوتا۔

"ثنا کے بھائی کو چپلی کباب بہت پسند ہیں۔"

"ایسا کرو' یہ بھی بتا دو ثنا کے ڈرائیور کو کیا پسند ہے؟" اپنے پیچھے کسی کی پھر موجودگی محسوس کرکے وہ بری طرح چڑ گئی اور تلملا کر کہتے ہوئے مڑی تو ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ پہ جم سی گئی' پھر اس نے نگاہ پھیرلی۔

"میں نے کہا چاند مبارک۔ اعتکاف مبارک۔" وہ بالوں کے پیچھے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے سامنے آیا۔

"خیر مبارک۔" مختصر سا جواب دے کر وہ پھر سے بریانی مسالے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"میں نے کہا' کچھ میٹھا ہو جائے۔" بسمہ نے اس کی طرف نہیں دیکھا اور فریج سے چاکلیٹ نکال کے سامنے رکھ دی۔

"میں نے کہا.... آپ کے ہاتھ کا بنا شیر خورمہ ہو جائے تو....."

"پھر اس کے لیے انتظار کرو کہ مجھے شیر خورمہ بنانا آجائے۔"

"میں نے کہا' پھر جلدی سیکھ لو۔"

"کیوں؟" وہ مڑی اور بازو باندھ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"جب بہو پہلی بار میٹھا بناتی ہے تو تم شیر خورمہ ہی بنانا۔"

"مجھے بہو بننے کا کوئی شوق نہیں۔" اندر اس کا دل ڈولا۔

"اچھا! امی تو اسی ارادے سے اپنا گھر چھوڑ کر عید گزارنے یہاں آئی ہیں۔"

"یہ ان کا میکا ہے۔ وہ پہلے بھی کئی بار عید یہاں کرچکی ہیں۔"

"مگر اس دفعہ ان کا ارادہ کچھ اور ہے۔"

"ان کو بلیو مون کا ایڈریس دے دو۔"

"ہاہ....." طیب نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "بلیو مون کی زندگی میں میرا جو کردار تھا' وہ میں ادا کرچکا ہوں۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی اداسی محسوس کرکے بسمہ کو تکلیف ہوئی۔

"مجھے تو تمہارا ایڈریس ہی یاد رکھنا ہے' کیونکہ میرا ہر راستہ تمہاری طرف ہی جاتا ہے۔" وہ اس پہ نظریں جمائے کہہ رہا تھا۔ سفید اور پیلے پرنٹڈ سوٹ میں بہت اچھی' بہت پیاری' بہت اپنی اپنی لگ رہی تھی وہ۔

بسمہ بھی اسے دیکھ کر رہ گئی۔ آخر اس کی دعائیں اسے اس تک لے آئی تھیں۔ طیب نے بلیو مون کو اپنے بل بوتے پہ حاصل کرنا چاہا تھا اور بسمہ نے اسے اللہ سے مانگا تھا۔ جیت تو اس کی ہی ہونی تھی نا۔

"تم اپنے فیصلے پر مطمئن ہو؟" بسمہ نے آہستہ سے رخ موڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں....." اطمینان بسمہ کی رگ و جان میں سرائیت کرنے لگا۔ "اب مجھے ماسی' کک اور سویپرس (بھنگن) کو تنخواہ نہیں دینی پڑے گی۔"

"طیب!" بسمہ بیلنا لے کر اس کی طرف بڑھی۔

اسی وقت سجیل ایک بار پھر دروازے پہ نمودار ہوا۔

"ایک بات تو بتانا بھول گیا۔ ثنا کا ڈرائیور صرف ماش کی دال کھاتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"ماہی! میری جان گھر آجاؤ۔ پاپا تمہارے بغیر بہت اداس ہیں۔" اس کی آنکھ سے موتی گرنے لگے۔

"ماہی! فردا اور ارمغان بھی بہت اداس ہیں.... ماہی! پاپا کا اور امتحان نہ لو بیٹا۔" اسے لگ رہا تھا کہ پاپا رو رہے ہیں۔ اس نے اپنے باپ کو ہمیشہ رعب ڈالتے' چلاتے ہوئے سنا تھا۔ ان کی یہ آواز اس کے دل پر سے غصے اور خفگی کی جمی تہہ کو اکھاڑ رہی تھی۔

"تمہیں کیپٹن اسد اللہ نہیں پسند تو نہ سہی۔ میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کروں گا۔" ہمیشہ اپنی ضد میں تن کر کھڑا ہونے والا شخص آج بیٹی کے لیے جھک رہا تھا۔ ندرت جہاں آرا بھی تو تھیں' جنہوں نے پھر پلٹ کر نہ پوچھا تھا اور عمرہ کرنے چلی گئی تھیں۔ کل سعودی عرب میں عید تھی اور آج یہاں۔ دونوں دن ان کا فون نہ آیا تھا۔ شاید اب ان کی "انا" شانت تھی کہ ماہم اگر ان کے ساتھ نہیں تو اپنے باپ کے ساتھ بھی نہیں ہے۔

"پاپا! آپ مجھے لینے کب آئیں گے؟" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ابھی..... ابھی میری جان! میں ابھی نکلتا ہوں۔" ان کے بے قراری سے دیے جواب سے لگا کہ وہ اٹھ کر چل بھی پڑے ہوں گے۔ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرادی۔ موبائل کان سے ہٹاتے ہوئے وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہی تھی۔

اس نے مسکراتے ہوئے اٹھ کر پردے پیچھے کیے۔ روشن دن کی تابناکی کو محسوس کیا اور پلٹ کر وارڈ روب کی طرف آگئی۔ اس نے اپنے لیے گہرے نیلے رنگ کا شیفون کا لباس نکالا۔ اسے پہن کر ہلکا سا تیار ہوئی۔ پاپا کے پہنچنے میں ابھی کم سے کم بھی آدھا پونا گھنٹہ تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی۔ یہاں سے اسے پاپا کی گاڑی دور ہی سے نظر آجاتا تھی۔ مگر یہ کیا' یہاں سے تو اسے دجانے کی گاڑی نظر آرہی تھی۔ وہ گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اسی لمحے اس نے بھی سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ دونوں کچھ دیر سحر زدہ سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے' پھر وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر نیچے چلی آئی۔

"میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ اپنے پیرنٹس کو تمہارے پاپا کے گھر لے کر آؤں یا تمہاری ممی کے گھر؟" جیسے ہی وہ گیٹ سے باہر نکلی' وہ آگے آتا ہوا بولا۔

بے ساختہ مسکراہٹ ماہم کے لبوں کو چھو گئی۔ دجانے نے گہرا سانس بھر کر تھوڑی کو شہادت کی انگلی سے مسلا۔ آخر اس کا چاند نظر آہی گیا تھا۔

"عید مبارک۔" کوئی بھی جواب دینے کے بجائے اس نے عید کی مبارک باد دی۔

"کیسی عید....." دجانے چڑا۔ "میری عید تب ہوگی ماہم! جب تم میرا چاند بنو گی۔"

"تم مجھے اس عید پر کیا سرپرائز دینے والے تھے؟" وہ موضوع تبدیل کرنے کے لیے اس سے پوچھ رہی

ی۔

"مجھے پتا تھا تم بھی کچھ نہیں بھولی ہو۔" وہ مطمئن ہو کر مسکرایا۔ "میں نے وہ تحفہ سنبھال کر رکھا ہوا ہے' لایا ہوں تمہارے لیے۔۔۔ ویٹ۔" وہ گاڑی کی طرف بڑھا۔

ماہم کی نظریں اس پہ جا ٹھہریں۔ آج وہ کچھ ڈھنگ سے تیار ہوا تھا۔ اس نے سفید شلوار کے ساتھ سیاہ کرتہ پہن رکھا تھا جو اس پہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتی چلی گئی۔

"باقاعدہ جملہ حقوق اپنے نام کرالو' پھر جتنا چاہے دیکھتی رہنا۔" وہ اس کے سر پہ پہنچ چکا تھا۔ اس نے جھینپ کر اس پر سے نظریں ہٹائیں۔

"یہ لو اپنا تحفہ۔" خوب صورت سی پیکنگ میں اس نے ایک گفٹ اس کی طرف بڑھایا۔ ماہم نے جھجک کر اسے تھام لیا۔

اس نے آہستہ سے اس کا گفٹ ریپر اتارا۔ اندر سے ایک خوب صورت سا سلور فریم نکلا۔ اسے سیدھا کیا تو دم بخود رہ گئی۔ وہ سی سی این پی (CCNP) کا سرٹیفکیٹ تھا۔

"تم بہت فکر مند رہتی تھیں نا کہ میں پڑھتا نہیں۔ اپنے فیوچر کو سیریس نہیں لیتا' تو دیکھو سی سی این پی میں نے تمہارے لیے کیا تھا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آج کسی ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ دجانے عثمان اس کے سامنے ایک کامیاب شخص اور آئی ٹی کے ایک ماہر کی حیثیت سے کھڑا تھا اور سب کے سامنے اپنے آپ کو منوا چکا تھا۔

"اور اس عید کا تحفہ کہاں ہے؟" فریم پہ دھیرے دھیرے انگلیاں پھیرتے ہوئے خود پہ قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو تم دو گی۔" وہ اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ ماہم نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ "صرف تمہاری ایک مسکراہٹ' صرف تمہاری ایک ہاں۔۔۔ بس اتنا سا خواب ہے۔" آخر میں وہ گنگنایا تو وہ بے اختیار مسکرا دی۔

"ایک خواب تو تعبیر پا گیا' اب یہ بتاؤ کہ امی کو کہاں لے کر آؤں تمہارے۔۔۔"

"پاپا کے گھر۔" اس نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے جواب دیا تو وہ ہنس دیا۔

"سوچ لو! انہوں نے پہلے چار دفعہ مجھے بے عزت کر کے نکالا ہے۔"

"اب نہیں نکالیں گے۔" اس کے لہجے میں یقین تھا۔

"اچھا۔۔۔ ارے یاد آیا وہ اس طبیب بے چارے کو معاف کرو۔ وہ بڑا بیبا بچہ ہے۔ کسی غلط فہمی میں اس نے غلط زبان استعمال کی۔"

"ہاں۔۔۔ مجھے پتا ہے وہ اس ہیکر کو گالیاں دے رہا تھا۔" ماہم نے مسکراتے ہوئے کہا تو دجانے نے زور زور سے سر ہلایا۔ "وہ ہیکر تھا ہی ان گالیوں کے قابل۔"

"جی۔۔۔ جی۔" دل میں طبیب کو کوستے ہوئے مسکرا کر اسی طرح سر ہلاتے ہوئے وہ اس کے پیچھے چل دیا۔ ماہم نے حاجی عبدالعزیز کے بیرونی لان سے سرخ رنگ کا ایک چھوٹا سا پھول توڑا۔

"پڑوسیوں پہ کچھ حق ہمارا بھی ہے۔" چوکیدار کے گھورنے پہ وہ اسے مزید جوش و خروش کے ساتھ گھورتے ہوئے بولی اور وہ سرخ پھول دجانے کی طرف بڑھاتے ہوئے مسکرا دی۔ اداس چاند کو اس کے سورج نے روشن کر دیا تھا۔

اس کے ہاتھ سے پھول لیتے ہوئے دُجانے نے اس کی دمکتی ہوئی من موہنی صورت دیکھی اور خود سے وعدہ کیا کہ اب وہ کبھی اپنے چاند کو اداس نہیں ہونے دے گا۔



نعیمہ ناز سلطان

اتنے مانوس صیاد سے ہوگئے

ڈھائی گھنٹے کی معمول کی لوڈشیڈنگ کے بعد بجلی آچکی تھی۔

"اللہ تیرا شکر!" صائمہ کے منہ سے بے اختیار کلمہ شکر نکل پڑا۔ یہ کلمہ شکر چوبیس گھنٹوں میں تین بار ادا ہوتا تھا۔ جب بجلی ڈھائی گھنٹے غائب رہنے کے بعد آجاتی، ایک بار پھر جانے کے لیے۔

صائمہ نے جلدی سے واشنگ مشین کا بٹن گھمایا۔ کپڑوں کا آخری راؤنڈ تھا بس، پندرہ منٹ کی تاخیر سے مشین لگائی تھی جس کی پاداش میں ڈھائی گھنٹے تک اسے رکنا پڑا، ورنہ اب تک وہ کپڑے کھنگال کر پھیلا چکی ہوتی اور مشین دھو دھا کر رکھ چکی ہوتی۔ صبح آٹھ بجے شوہر کے نکلتے ہی وہ مشین لگالیتی تھی، تین گھنٹے بعد لائٹ جاتی تھی تو ان تین گھنٹوں میں وہ مشین لگا کر کپڑے دھو کر سمٹ جاتی تھی مگر آج شوہر کے جاتے ہی چھوٹے بیٹے نے الٹی اور دست کی ایسی لائن لگائی کہ اس کو سنبھالنے کے چکر میں مشین تھوڑی دیر سے لگی اور آخری راؤنڈ کے کپڑے اس نے ڈالے ہی تھے کہ کچھ دیر بعد بجلی اپنے ٹائم پر غائب۔

مگر اب بجلی آچکی تھی۔ اس نے پھرتی سے کام نبٹایا اور کھانا پکانے کچن میں گھس گئی۔ گھر کی صفائی کرچکی تھی، اب صبح کا پھیلا ہوا کچن اس کا منتظر تھا۔ ایک طرف ہنڈیا چڑھائی اور ساتھ ساتھ برتن دھو کر کچن بھی صاف کرتی جارہی تھی۔ بچوں کے اسکول سے آنے سے پہلے پہلے کھانا تیار کرنا تھا۔ گرمی اور بھوک کی شدت سے نڈھال بچے آتے ہی "مما بھوک لگ رہی ہے" کا نعرہ لگاتے اور مما ہمیشہ کی طرح انہیں تسلی بخش جواب دیتیں کہ "چینج کرکے ہاتھ منہ دھو کر آؤ میں بس ابھی کھانا لگاتی ہوں۔"

دال میں بگھار لگا کر چاول دم پر رکھے۔ اور سلاد بنانے لگی۔

چاروں بچے اسکول سے آگئے۔ حسب معمول چینج کرکے، ہاتھ منہ دھو کر کمرے میں آئے۔ سمیرا میٹرک کی طالبہ تھی، گھر کے کچھ نہ کچھ کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹا ہی لیتی تھی، اس نے جلدی سے دسترخوان بچھایا اور برتن لگانے لگی۔

"مما! چٹنی بنائی؟" وہ ٹھنکی۔

دال چاول کے ساتھ چٹنی اور سلاد نہ ہو تو اس کے حلق سے کھانا نیچے نہیں اترتا تھا۔

"ارے بیٹا! طلحہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کو بھی سنبھالتی رہی کھانا پکانے کے ساتھ ساتھ چٹنی بنانا بھول ہی گئی، اچار ہے وہ نکال لو۔"

"نہیں! میں چٹنی کھاؤں گی۔ خود پیس لیتی ہوں، آپ چٹنی کا سامان نکال دیں۔" سمیرا گرائنڈر نکالنے لگی۔

"جلدی کریں مما! لائٹ جانے والی ہے۔" سمیرا کی نظر گھڑی کی سوئیوں پر پڑی تو وہ زور سے چیخی۔

"ایک منٹ بیٹے!" اس نے جلدی سے زیرہ نکالا۔ باقی سب اشیا وہ پلیٹ میں نکال چکی تھی۔

سمیرا نے پھرتی سے ساری اشیا جگ میں ڈالیں اور گرائنڈر کا بٹن دبایا، مگر اس سے پہلے محکمۂ بجلی کے فرض شناس کارکن نے اپنی ڈیوٹی اور ذمہ داری نبھاتے ہوئے عین اسی لمحے سوئچ آف کردیا۔ دن کی تیسری لوڈشیڈنگ کا آغاز ہوگیا تھا۔

"دفع ہوجاؤ۔" سمیرا نے بے حد غصے سے گرائنڈر کو گھورتے ہوئے کہا۔

"کسے دفع کررہی ہو آپی! کھانا لے آؤ، بھوک کے مارے چوہے دوڑ رہے ہیں پیٹ میں۔" عفان نے کچن میں جھانکا۔

"یہ لو عفان! یہ لے جاؤ میں چاول لارہی ہوں۔" صائمہ نے دال کا ڈونگا بیٹے کو تھمایا اور ڈش میں چاول نکالنے لگی۔

"اب چٹنی بعد میں پس جائے گی تم کھانا کھالو۔" اس نے سمیرا کو ہدایت کی۔

"ظاہر ہے، اب بعد میں ہی پسے گی، یہ لوڈشیڈنگ والے بھی بس ایسا لگتا ہے سوئچ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ مجال ہے جو مقررہ وقت سے ایک سیکنڈ بھی اوپر ہوجائے۔" سمیرا بڑبڑاتے ہوئے کھانا کھانے چل دی۔

سب لوگ کھانا کھا چکے تو سمیرا نے دسترخوان سمیٹ دیا۔ برتن دھو دھا کر رکھے اور لیٹ گئی۔ گرمی میں بھلا نیند کیا آتی تھی مگر اور کرتی بھی کیا؟ اسکول سے آنے کے بعد تھکن ہو جاتی تھی۔ ابھی لائٹ آنے میں پورے دو گھنٹے باقی تھے۔ وہ ہاتھ کا پنکھا جھلتی رہی۔ دونوں بھائی اور چھوٹی بہن گیم کھیلنے میں مگن ہو گئے دو گھنٹے گزارنے کا یہی ایک مصرف تھا ان کے پاس۔ صائمہ، طلحہ کے لیے فیڈر بنانے لگی، جو اپنی نیند پوری کر کے اٹھ گیا تھا۔

"شکر ہے کہ صبح کے بعد اس نے دوبارہ نہ تو الٹی کی تھی، نہ ہی موشن۔" صائمہ سکون کا سانس لیتے ہوئے بیٹے کے لیے فیڈر بنا رہی تھی۔ بیٹے کو فیڈر پلا کر اس نے گیم کھیلتے ہوئے بچوں کے پاس لٹا دیا اور خود بھی وہیں لیٹ گئی۔

"میری آنکھ لگ جائے تو طلحہ کو دیکھتے رہنا، اچھا۔" غنودگی میں جاتے ہوئے اس نے بچوں کو ہدایت کی۔ "اچھا" گیم میں مگن بچوں نے کورس میں جواب دیا۔ صبح چھ بجے کی اٹھی ہوئی صائمہ تھکن سے چور تھی اب جا کے ذرا کمر ٹکائی تو اسے نیند کی آغوش میں جاتے ہوئے دیر نہیں لگی تھی کہ بچوں کے ایک نعرۂ مستانہ سے اس کی آنکھ کھلی۔

لائٹ آنے پر بچے بے اختیار چیخے تھے۔

"چپ ہو جاؤ، سونے دو۔" سمیرا نے نیند میں ڈوبی آواز میں چھوٹے بہن بھائیوں کو ڈانٹا اور کروٹ بدل کر آرام سے سو گئی۔

صائمہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، کپڑے استری کرنے تھے میاں کے کپڑے اور بچوں کے یونیفارم۔ صبح نانی کے گھر جانا تھا، وہ کپڑے بھی آج استری کر کے رکھ دیتی۔ وہ اٹھی ہی تھی کہ اعجاز کی بڑی پھوپھی اپنی بہو اور پوتیوں کے ساتھ چلی آئیں۔ محبت کرنے والی بھلی خاتون تھیں۔ گھر بھی بہت زیادہ دور نہیں تھا، مہینہ ڈیڑھ مہینے میں چکر لگا ہی لیتی تھیں۔ صائمہ، اس کے شوہر اور بچے ان کی آمد پر خوش ہی ہوتے تھے۔ اس نے کپڑے استری کرنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے انہیں خوش دلی سے خوش آمدید کہا اور شام کی چائے کے ساتھ کچھ لوازمات کی تیاری میں لگ گئی۔ سمیرا اور بچے بھی ایک ایک کر کے اٹھ بیٹھے، گھر اب مختلف آوازوں سے گونج رہا تھا۔ اعجاز بھی آ گئے تھے۔

کھانے پینے کی اشیا سے انصاف کر کے چائے پی کر فارغ ہوئے تو مغرب کا وقت ہونے کو تھا۔ پھوپھی نے مغرب کی نماز پڑھ کر گھر واپسی کا اعلان کیا۔

"اچھا بھئی دلہن! خوش رہو پھولو پھلو۔ اب اجازت دو۔" پھوپھی نے طلحہ کی چھوٹی سی مٹھی میں سو کا نوٹ پھنسایا اور صائمہ سے مخاطب ہوئیں۔

"کھانا کھا کر جایئے گا پھوپھی جان! اور یہ آپ ہر بار کیا تکلف کرتی ہیں۔ آپ کا اپنا گھر ہے، یہ سب ہر بار ضروری نہیں۔" صائمہ نے انہیں روکتے ہوئے کہا۔

"بچے ہیں۔ میری طرف سے آئس کریم کھلا دینا۔" وہ اکثر کچھ نہ کچھ لے کر آتیں، ورنہ ایک سرخ نوٹ جاتے وقت کسی بچے کی ہتھیلی پہ رکھ جاتیں۔

"ارے یہ بھی میرے پوتے، پوتیاں ہیں۔ ان کا اتنا تو حق بنتا ہے۔" وہ مسکرائیں اور کھڑی ہو گئیں۔

"کھانا کھا کر جایئے گا۔" اب کے اعجاز نے اصرار کیا۔

"ارے بیٹا! ابھی ماشاء اللہ اتنا کچھ کھا لیا۔ اب بالکل بھی گنجائش نہیں کھانے کی۔ اللہ تمہارے رزق میں برکت دے۔ اب تم آنا بیوی بچوں کے ساتھ، بہت دن ہو گئے تمہیں آئے ہوئے۔" پھوپھی اللہ حافظ کر کے رخصت ہو گئیں۔

"اب استری کا بکھیڑا کیا پھیلاؤں، لائٹ تو جانے والی ہے۔" صائمہ نے گھڑی دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ تیسری لوڈشیڈنگ کے ٹائم میں مشکل سے پانچ منٹ ہی رہ گئے تھے۔

"مما! چٹنی ابھی تک نہیں پیسی، میں بھول گئی تھی۔" چائے کے برتن دھوتے ہوئے سمیرا نے صائمہ کو اطلاع دی۔

"اب تو لائٹ جانے میں ایک، دو منٹ ہی ہیں۔ رات میں ہی پیس لینا۔ کچن کا کام جلدی سے ختم کر لو، پھر اندھیرا ہو جائے گا۔" صائمہ نے ہدایت کی۔

"بس ہو گیا میرا کام۔" وہ سنک دھو رہی تھی۔

"اب لائٹ آنے کے بعد کیا، کیا کام کرنے ہیں؟" صائمہ باآواز بلند کاموں کی فہرست بنا رہی تھی۔

"روٹیاں پکانی ہیں، کپڑے استری کرنے ہیں، چٹنی پیسنی ہے۔ لہسن، ادرک چھلا ہوا رکھا ہے، وہ پیسنا ہے۔"

"اور ہمیں کمپیوٹر پہ گیم کھیلنے ہیں۔ پورا ایک گھنٹہ۔" تینوں بیٹے ایک ساتھ بولے۔

"تمہیں کوئی اور کام نہیں ہے گیم کھیلنے کے علاوہ۔ اپنا ہوم ورک کب کرو گے؟" سمیرا نے انہیں گھورا۔

"لائٹ آنے کے بعد گیم کھیلنے کے بعد۔" ارسلان نے اطمینان سے جواب دیا۔

"لائٹ ابھی گئی ہے نہیں اور آنے کے بعد کے پروگرام طے ہو رہے ہیں۔" اعجاز مسکرائے۔

"ارے ہاں، پانچ منٹ تو اوپر ہو گئے، ابھی تک لائٹ گئی کیوں نہیں؟" صائمہ نے تشویش ناک نظروں سے پہلے گھڑی، پھر جملہ اہل خانہ کو دیکھا۔

"لگ رہا ہے فرض شناس کارکن کی آنکھ لگ گئی ہے۔"

"لائٹ آ جائے تو ہم بھی اپنا موبائل چارج پہ لگائیں۔" اعجاز نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"ابو! ٹی وی کھول لیں۔ ابھی تک تو لائٹ گئی نہیں۔" عفان کا دل للچایا کارٹون کے لیے۔

"نہیں، بجلی کا کچھ بھروسا نہیں، ٹائم تو ہو گیا ہے۔ کسی بھی وقت جا سکتی ہے۔ اس وقت ٹی وی مت کھولو۔" اعجاز نے سختی سے منع کیا۔ اس لوڈشیڈنگ میں وہ الیکٹرونکس کی تمام اشیا کا بے حد خیال رکھتے تھے۔

فریج، ٹی وی، کمپیوٹر سمیت ہر چیز کا بٹن آف کر دیا جاتا اور بجلی آنے پر کھولا جاتا۔ اکثر پاور تیز آنے پہ بہت سے گھروں میں کئی الیکٹرونکس اشیا جل چکی تھیں۔ اس لیے یہ دونوں بہت محتاط تھے۔

"خیریت تو ہے، پندرہ منٹ اوپر ہو گئے بجلی گئی نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات میں سونے کے ٹائم پہ لے لیں۔ ایک اور مصیبت۔" صائمہ فکرمندی سے بڑبڑائی۔

"نہیں، نہیں میرے پیارے اللہ! پلیز پلیز لائٹ جیسے جاتی ہے اس وقت ویسے ہی چلی جائے، رات میں گئی تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ رات کی لائٹ تو بڑی لمبی جاتی ہے۔ مجھے کمپیوٹر پر بہت سارا کام کرنا ہے۔ پھر گرمی میں سوئیں گے کیسے۔ صبح اٹھ کر اسکول بھی جانا ہے۔" سمیرا باآواز بلند اللہ تعالیٰ سے التجا کر رہی تھی۔

"ہاں اور کیا، ابھی جو ٹائم ہے اسی پہ چلی جائے تو اچھا ہے۔ رات بے رات کیا بھروسا، پھر تو لمبی ہی جائے گی۔ پوری رات کالی ہو جائے گی۔" صائمہ کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔

ایسا پہلے چند ایک بار ہو چکا تھا کہ اپنے مقررہ وقت پر لوڈشیڈنگ نہ ہوتی تو رات میں بجلی کئی گھنٹوں کے لیے غائب ہو جاتی۔ گرمی، حبس، پسینے، تھکن اور مچھروں کی یلغار سے بے حال لوگ کبھی حکومت کو کوستے، کبھی محکمہ بجلی کو اور کبھی اپنے نصیبوں کو۔

"یار! یہ تو واقعی گڑبڑ کے آثار ہیں۔" آدھا گھنٹہ ہونے والا تھا۔ اعجاز اپنے موبائل کی باقی ماندہ چارجنگ بھی ختم کر کے بڑبڑائے۔

"یا اللہ! بجلی ابھی چلی جائے، رات میں نہ جائے۔" صائمہ کے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی تھی، سیدھی عرش پہ پہنچی اور آدھ گھنٹے کی تاخیر سے ایک بار پھر لوڈشیڈنگ شروع۔

"اللہ تیرا شکر، لائٹ چلی گئی۔" صائمہ سمیت سب ہی کی زبانوں سے کلمۂ شکر ادا ہوا۔

"یار! ہم بھی کچھ عجیب و غریب قوم نہیں بنتے جا رہے...؟ بجلی آئے تو اللہ کا شکر، جائے تو اللہ کا شکر۔" اعجاز زور سے ہنسے۔

"عادی ہو گئے نا۔" صائمہ جھینپ کر مسکرا دی۔

اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے
اب رہائی ملی بھی تو مر جائیں گے

اعجاز گنگناتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

نمرہ احمد

جنت کے پتے

چھٹی قسط ٦

سلیمان صاحب کے دو بچے ہیں' حیا اور روحیل۔ روحیل پڑھائی کے سلسلے میں امریکہ گیا ہوا ہے۔ حیا سلیمان کو یورپی یونین نے اسکالرشپ کے لیے منتخب کیا۔ اب وہ پانچ ماہ کے لیے ترکی جارہی ہے۔ حیا سلیمان کا ایک برس کی عمر میں سبین پھپھو کے آٹھ سالہ بیٹے جہان سکندر سے نکاح ہوچکا ہے۔ سبین پھپھو ترکی میں رہتی ہیں۔ بائیس سال پہلے ہونے والے نکاح کو سب جیسے بھول چکے ہیں' مگر حیا کے لیے وہ رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

تایا فرقان کے بیٹے داور کی مہندی کے فنکشن میں حیا اور ارم (تایا فرقان کی بیٹی) کے ڈانس کی ویڈیو کوئی انٹرنیٹ پر چلا دیتا ہے۔ حیا بدنامی کے خوف سے سائبر کرائم سیل سے رابطہ کرتی ہے۔ وہاں میجر احمد سے میٹنگ ہوتی ہے۔ حیا کے شکایت کرنے پر وہ ویڈیو ہٹا دیتا ہے۔

تایا فرقان' سلیمان صاحب حیا کے نکاح کو بھول کر اس کی شادی اپنے دوست کے بیٹے ولید لغاری سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ولیمہ والے دن حیا سے بے ہودگی کرتا ہے تو ایک خواجہ سرا ڈولی اس کی عزت بچاتا ہے۔ یہ خواجہ سرا حیا کو اکثر اہم مواقع پر ملتا رہتا ہے۔

حیا کے ساتھ اس کی کالج فیلو خدیجہ عرف ڈی جے ترکی جارہی ہے۔ وہ دونوں بہت جدوجہد کرکے پاسپورٹ اور ویزا بنواتی ہیں۔ دونوں کی دوستی ہوجاتی ہے۔

مکمل ناول



اسلام آباد جاتے ہوئے فلائٹ میں انہیں عثمان شبیر ملتے ہیں۔ ابوظہبی ایئرپورٹ پر ایک حبشی فون بوتھ پر ان کی مدد کرتا ہے۔ چغتائی اور احمت انہیں ترکی میں ریسیو کرتے ہیں۔ پھر ترک لڑکی ہالے ہاسٹل تک ان کی رہنمائی کرتی ہے۔

ترک روایت کے مطابق خدیجہ اور حیا کی مسز عبداللہ اپنے گھر دعوت کرتی ہیں جو حیا کو پاشا کے متعلق بتاتی ہیں۔ ہالے، حیا کو جہان کے گھر لے جاتی ہے۔ جہان سکندر سرد مزاجی سے حیا سے ملتا ہے جبکہ سبین پھپھو محبت سے ملتی ہیں۔ جہان کے گھر میں حیا کو پھر سفید پھول ملتے ہیں، جس پہ جہان خفا ہوتا ہے۔

جہان نے حیا سے بات کرتے ہوئے ماضی کی یادوں کو دہرایا، تب حیا کو پتا چلا کہ جہان کو اس کا اور اپنا نکاح یاد ہے۔ جہان نے اسے بتایا کہ اس کا باپ ملک کا غدار ہے اور اسے اس پر شرمندگی ہے۔

ویلنٹائن کی رات حیا کو حسب معمول سفید پھول ملے تو اس کے دوست معتصم نے محسوس کیا کہ کاغذ کے کنارے پر لیموں کا رس لگا ہوا ہے۔ اس نے ماچس کی تیلی جلا کر کاغذ کو تپش پہنچائی تو وہاں "اے آر پی" لکھا ہوا نظر آیا۔

حیا جہان سے ملنے گئی تو وہ ایک لڑکی کے ساتھ تھا۔ اس نے حیا کو نظر انداز کر دیا۔ حیا ناراض ہو کر آگئی۔ جہان نے اسے منانے کے لیے ڈنر پر مدعو کیا۔

حیا نے جہان کے ساتھ مل کر جزیرہ بیوک ادا کی سیر کا پروگرام بنالیا۔

وہ تینوں وہاں گئے تو حیا کو ایک بنگلے پر "اے آر پاشا" لکھا نظر آیا۔

جزیرے سے واپس لانے والی آخری فیری جا رہی تھی۔ جہان اور ڈی جے اس میں سوار ہو گئے تو اسی وقت ایک بچہ حیا کا پرس جھپٹ کر بھاگا۔ حیا اس کے پیچھے گئی تو وہ اے آر پاشا کے بنگلے میں داخل ہو گیا۔ حیا اندر گئی تو دروازہ مقفل ہو گیا اور کسی شخص نے اسے عقب سے خوش آمدید کہا۔

بنگلے میں حیا کی ملاقات عبدالرحمٰن پاشا کی ماں سے ہوتی ہے۔ وہ حیا کو بتاتی ہے کہ پاکستان میں ایک چیریٹی شو میں عبدالرحمٰن پاشا نے حیا کو پہلی بار دیکھا تھا اور اسی رات پہلی مرتبہ وہ سفید پھول بھیجے تھے۔ میجر احمد سے پاشا نے ہی کہہ کر ویڈیو ہٹائی تھی۔ میجر احمد، کرنل گیلانی کا بیٹا ہے، جسے جہان کے ابا نے پھنسا دیا تھا۔ عبدالرحمٰن پاشا، حیا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ حیا کہتی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے اور عبدالرحمٰن سے قطعی شادی نہیں کر سکتی۔ پاشا کی ماں وعدہ کرتی ہے کہ پاشا آئندہ حیا کے راستے میں نہیں آئے گا۔ پاشا کی ماں حیا کا کلچ دے کر اسے جانے دیتی ہے۔ تایا فرقان کو ارم کے معاملے کی بھنک پڑ جاتی ہے۔

حیا عبدالرحمٰن پاشا سے فون پر بات کرتی ہے کہ جہان کی اس طرح مدد کر دے کہ اس کی ریسٹورنٹ کی مالکن اسے کچھ مہلت دے دے۔ پاشا مان جاتا ہے مگر کچھ ہی دیر بعد جہان کے ریسٹورنٹ پر توڑ پھوڑ کی خبر ملتی ہے۔ حیا سخت شرمندہ ہو جاتی ہے اور پچھتاتی ہے۔ ڈی جے کے سر میں درد اٹھتا ہے، حیا اسے اسپتال لے کر جاتی ہے مگر اسپتال میں ڈی جے انتقال کر جاتی ہے۔ اس کی میت کے ساتھ جہان اور حیا بھی پاکستان آجاتے ہیں۔

حیا کی والدہ کے علاوہ جہان سے ملتے ہوئے سب کے انداز میں سرد مہری تھی۔ تاہم آخر میں سلیمان صاحب کے دل میں بھی جہان کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جہان انہیں حیا کو دوبارہ ترکی بھیجنے پر راضی کر لیتا ہے۔ مہوش کی شادی والے دن پنکی، حیا کو ڈولی کی طرف سے ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبا دیتا ہے اور کہتا ہے یہ ایک پہیلی سے کھلے گا اور جب تک کھلے گا، ڈولی اس دنیا میں نہیں ہو گا۔ وہ بیمار ہے۔ وہ چھ حرفی کوڈ کھولنے کی حیا نے بہت کوشش کی۔ جہان سے بھی کھلواتی ہے، پھر ترکی لے آتی ہے۔

سلمیٰ، ہاشم کو پیسے اکٹھے کرنے کا ایک طریقہ بتاتی ہے۔ مگر ہاشم، پاشا کے خوف سے متذبذب ہو جاتا ہے۔

حیا مختلف جگہوں پر گھومتے ہوئے خدیجہ کی یاد تازہ کرتی ہے۔ وہاں اسے خدیجہ کا رجسٹرمل جاتا ہے۔ وہ ڈبا کھلوانے کے لیے حیا، معتصم کی مدد لیتی ہے۔ ڈبے کا کوڈ یونانی مفکر ہراقلیطس کے کسی فلسفے میں پوشیدہ ہے۔ وہ مسز عبداللہ کے گھر سے نکلتے ہوئے معتصم کو فون کر رہی ہوتی ہے تو کوئی اسے اغوا کر لیتا ہے۔

نرم لہجے کے ساتھ اسے سائیڈ ٹیبل پہ ٹرے رکھنے کی آواز آئی۔ وہ ہلی تک نہیں۔

"نیند اچھی ہے لیکن زیادتی اگر اچھی چیز کی بھی ہو تو نقصان دہ ہوتی ہے۔ یہ کھیرے کا سوپ ہے اور ساتھ ناشتہ۔"

حیا ہنوز آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی رہی۔

"اور یہ عبدالرحمٰن کی کال ہے، وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

اس نے بازو چہرے سے ہٹایا۔ سبز اسکارف چہرے کے گرد لپیٹے، نیچے سرمئی اور گلابی پھول دار اسکرٹ پہ لمبا سفید سوئیٹر پہنے وہ ہاتھ میں پکڑا کارڈلیس فون اس کی جانب بڑھائے ہوئے تھی۔

"لو، بات کرلو!" اس کے کم عمر چہرے پہ ایک معصومیت بھری شفافیت تھی اور اس کی آنکھیں جو رات میں حیا کو بھوری لگی تھیں، صبح کی روشنی میں سبز لگ رہی تھیں۔ وہ دنیا کا سب سے شفاف، سب سے خوبصورت چہرہ تھا۔

"مجھے اس سے بات نہیں کرنی۔" وہ بولی تو اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت چیخنے کے باعث اب گلا جواب دے گیا تھا۔

"وہ کہہ رہی ہے، اسے تم سے بات نہیں کرنی۔" اس نے فون کان سے لگا کر نرم لہجے میں انگریزی میں بتایا۔

"وہ کہہ رہا ہے، ایک دفعہ اس کی بات سن لو۔"

"اس سے کہو، جو اس نے میرے لیے کیا، میں اس کی احسان مند ہوں، شکر گزار ہوں، لیکن اگر اس کے بدلے میں وہ مجھے یوں اذیت دینا چاہتا ہے تو میں ابھی اسی وقت اس کے گھر سے چلی جاؤں گی۔" وہ بے حد رکھائی سے بولی۔ عائشے گل کا چہرہ جواباً" ویسا ہی نرم اور شفاف رہا۔ اس نے سن کر فون کان سے لگایا اور ساری بات من و عن انگریزی میں دہرا دی۔ پھر فون بند کر دیا۔

"وہ کہہ رہا ہے کہ وہ انڈیا میں ذرا پھنس گیا ہے، وہ ادھر نہیں آسکے گا، اور آئے گا بھی نہیں اگر تم یہ نہیں چاہتیں اور تم جب تک چاہے ادھر رہ سکتی ہو۔ میں یہاں بیٹھ جاؤں؟" اس نے کارڈلیس میز پہ رکھتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ نہ اجنبیوں سے جلدی گھلتی ملتی تھی اور نہ ہی اسے پاشا کے گھر والوں سے راہ و رسم بڑھانے میں دلچسپی تھی، مگر اس لڑکی کا چہرہ اتنا نرم اور دوستانہ تھا کہ خود بخود اس کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

"شکریہ۔" وہ اسی مدھر مسکراہٹ کے ساتھ کہتی کرسی پہ ٹیک لگا کر بیٹھی، سفید سوئیٹر میں مقید کہنیاں کرسی کے دونوں بازوؤں پہ رکھیں اور ہتھیلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے عادتاً" اپنی انگوٹھی انگلی میں گھمانے لگی۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" وہ کہنی کے بل ذرا سی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

"تم عبدالرحمٰن کی طرف سے پریشان مت ہونا اس نے کہا کہ نہیں آئے گا تو نہیں آئے گا۔ جو اس نے تمہارے لیے کیا، وہ اس کا فرض تھا۔ سفیر کی فیملی سے ہمارے پرانے تعلقات ہیں جب تم نے سفیر کو فون کیا تو اس نے فوراً" عبدالرحمٰن کو اپروچ کیا یوں پولیس کی مدد لے کر وہ تمہیں وہاں سے نکال لائے۔"

"مجھے کس نے اغوا کیا تھا؟" وہ بہت دیر بعد بس اتنا ہی کہہ پائی۔

"یہاں بہت سے ایسے گروہ ہیں جو روس، مالدووا اور یوکرائن سے لڑکیاں اغوا کر کے یا دھوکے سے ادھر لاتے ہیں، اس کے علاوہ ان ٹورسٹ لڑکیوں کو جن کا تعلق کسی ایسے غریب ملک سے ہو کہ ان کے گھر والے ترکی آکر زیادہ دیر تک کیس کا تعاقب نہ کرسکیں، ان کو بھی یہ اغوا کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ان کے پاس پہنچنے کے بعد سب لڑکیاں "نتاشا" بن جاتی ہیں۔ یہ ان نتاشاز کو آگے بیچ دیتے ہیں اور ان سے وائٹ سلیوری White Slavery کروائی جاتی ہے۔"

اس نے تکلیف سے آنکھیں موندلیں۔ اسے یاد

آلیا تھا۔ نتاشا ترکی میں کام کرنے والی روسی کال گرل کو کہتے تھے۔

"تم چھوڑو یہ سب' اپنے گھر فون کرلو۔ دو دن ہوگئے ہیں' تمہیں انہیں اپنی خیریت کی اطلاع تو دینی چاہیے۔"

اس نے جواب نہیں دیا۔ بس خالی خالی نگاہوں سے کھڑکی کے جالی دار پردے کو دیکھتی رہی جو ہوا سے ہولے ہولے پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کے پاس جواب تھا بھی نہیں۔

"میں اور بہارے جنگل تک جارہے ہیں' تم چلوگی؟"

اس نے بنا تردد کے نفی میں گردن ہلادی۔ عائشے کے چہرے پہ ذراسی اداسی پھیلی۔

"چلو' جیسے تمہاری خوشی۔ آج نہیں تو کل تم ضرور ہمارے ساتھ چلنا۔" اس نے فوراً" خود ہی نئی امید ڈھونڈ نکالی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ناشتہ ضرور کرنا' مہمان بھوکا رہے تو میزبان کا دل بہت دکھتا ہے۔" شگفتگی سے کہتے ہوئے اس نے کرسی واپس رکھی اور باہر چلی گئی۔

حیا نے کمبل اتارا اور اٹھ کرپاؤں نیچے رکھے۔ نرم گداز قالین میں پاؤں گویا دھنس سے گئے۔ وہ اپنے پیروں پہ کھڑی ہوئی تو کمر میں درد کی لہر اٹھی۔ کرسی سمیت گرنے سے اس کے کندھوں' کمر اور گھٹنوں پہ بہت سی چوٹیں آئی تھیں۔

وہ قالین پہ ننگے پاؤں چلتی ڈریسنگ ٹیبل کے قد آور آئینے کے سامنے جاکھڑی ہوئی۔ اس کا عکس بہت تھکا تھکا' نقاہت زدہ سا لگ رہا تھا۔ متورم آنکھوں تلے حلقے' ایک آنکھ کے نیچے گہرا جامنی سا نیل' پیشانی پہ چند خراشیں' ٹھوڑی پہ بڑی سی خراش' ہونٹ کا دایاں کنارہ سوجا ہوا اور..... اس نے انگلیاں اوپر سے نیچے اپنے بالوں پہ پھیریں۔

وہ ویسے ہی تھے' اتنے ہی لمبے اتنے ہی گھنے' مگر ان کی چمک کھو گئی تھی۔ وہ ریشمی پن جو ہمیشہ ان میں چمکتا تھا اب وہاں نہیں تھا۔

جانے کیسے عائشے نے وہ ویکس اتاری اور اس دوران کتنے بال ٹوٹے وہ نہیں جانتی تھی۔ ویکس ڈھل گئی مگر جو تکلیف اس نے سہی تھی' وہ ایسے نہیں ڈھل سکتی تھی۔

پولیس یا پاشا کے بندے' جو بھی اس وقت دروازہ توڑ کر اندر آئے تھے' انہوں نے اس کے فراک کے دامن کو آگ پکڑتے ہی بجھادیا تھا' مگر جتنا وہ پستہ قد روسی اسے جلاچکا تھا' حیا کو لگا وہ جلن ساری زندگی تکلیف دیتی رہے گی۔

وہ اس وقت ڈھیلے ڈھالے اسپتال کے گاؤن میں تھی۔ اس نے دائیں آستین دوسرے ہاتھ سے اوپر کندھے تک اٹھائی۔ بازو کے اوپری حصے پہ اوپر سے نیچے سیاہ راکھ کی طرح کے لکھے تین حروف ویسے ہی تھے۔ "WHO" اس نے زیر لب دہرایا۔ وہ کون تھی؟ کیوں کسی دوسرے کے گھریوں پڑی تھی' وہ بھی ایک ایسے شخص کے گھر جس کو وہ سخت ناپسند کرتی تھی۔ اس کا گھر کال کرنے یا واپس سبانجی جانے کا دل کیوں نہیں چاہا تھا؟

شاید اس لیے کہ اس رات پھپھو اس کا انتظار کررہی تھیں۔ انہوں نے اس کے نہ آنے پہ ان دو دنوں میں ہر جگہ پتا کیا ہوگا اور اب تک پاکستان میں یہ بات پہنچ گئی ہوگی۔ کیا اب وہ کبھی واپس جاسکے گی؟ عزت سے جی سکے گی؟ کسی کو منہ دکھا سکے گی؟ کیا ابا' تایا فرقان اور صائمہ تائی کا سامنا کرسکیں گے؟ یا اس نے اپنے ماں باپ کو سارے خاندان میں بے عزت کردیا تھا؟ کون اس کی دہائی سنے گا کہ وہ بھاگی نہیں تھی' اغوا ہوئی تھی۔ اس کے خاندان میں اور اس کے ملک میں اغوا ہونے والی لڑکی اور گھر سے بھاگنے والی لڑکی میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اسے لگا "شریفوں کا مجرا" بھرے بازار میں چلادیا گیا تھا۔ وہ واقعی بدنام ہوگئی تھی۔

وہ کھڑکی میں آکھڑی ہوئی اور جالی دار پردہ ہٹایا۔ پھر کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ سمندر کی سرد برفیلی ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی اور کھلے بال پیچھے کو

اڑانے لگی۔

وہ دوسری منزل کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ نیچے اسے باغیچہ نظر آرہا تھا اور اس کے پار لکڑی کا گیٹ جسے ایک بیتی شام اس نے ہذیانی انداز میں بھاگتے ہوئے پار کیا تھا۔

باغیچے میں ایک خوبصورت شاہانہ سی بگھی کھڑی تھی۔ اس میں ایک چکنا سفید گھوڑا جتا تھا۔ بگھی کے پیچھے ایک لکڑی کا صندوق نصب تھا جس کا ڈھکن کھولے کھڑی عائشے گھاس سے چیزیں اٹھا کر اس میں رکھ رہی تھی۔ آرے، کلہاڑے، چاقو اور ایسے کئی اوزار۔ چھوٹی بچی بہارے سرخ چمکتے سیبوں سے بھری ٹوکری لیے بگھی میں اوپر چڑھ رہی تھی۔ اندر بیٹھ کر اس نے ٹوکری گود میں رکھ لی۔ وہ جس حصے میں بیٹھی تھی، وہ حیا کے سامنے تھا۔ عائشے، صندوق کا ڈھکن بند کر کے پیچھے سے گھوم کر دوسری طرف آبیٹھی۔

دفعتاً" بہارے کی نگاہ اوپر کھلی کھڑکی میں کھڑی حیا پہ پڑی۔

"حیا!" اس نے جلدی سے ہاتھ ہلایا۔ اس کے پکارنے پہ اس کے بائیں جانب بیٹھی عائشے نے آگے ہو کر چہرہ بہارے کے کندھے سے اس طرف نکال کر حیا کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

وہ مسکرا نہیں سکی، بس تھوڑا سا ہاتھ اٹھا کر واپس گرا دیا۔

دفعتاً" عائشے نے جھک کر بہارے کے کان میں کچھ کہا تو بچی نے "اوہ" کہہ کر جلدی سے ٹوکری سے ایک سرخ سیب نکالا اسے اپنے فراک سے رگڑا اور "کیچ" کہتے ہوئے اوپر کی سمت اچھالا۔ لاشعوری طور پہ اس نے ہاتھ بڑھائے، مگر اڑ کر آتا سیب اوپر بالکونی کی ریلنگ میں اٹک گیا۔

"اوہ نو!" بہارے نے مایوسی سے گردن پیچھے کو پھینکی۔ اسی اثنا میں بگھی بان گھوڑے کو چابک مار چکا تھا۔ بگھی گھوڑے کے پیچھے کھنچتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔

وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔ بہارے کا سیب وہیں ریلنگ گرل کے ڈیزائن میں پھنسا رہ گیا۔

وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ لکڑی کے فرش کی چمکتی راہداری سنسان پڑی تھی۔ وہ ننگے پاؤں چلتی آگے آئی۔ راہداری کے سرے پہ ایک کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ اس کے آگے جہاں راہداری ختم ہوتی تھی وہاں ایک گول چکر کھاتا لکڑی کا زینہ تھا جو نیچے لونگ روم سے شروع ہو کر بالائی منزل کی راہداری، جہاں وہ کھڑی تھی، سے ہوتا ہوا اوپر تیسری منزل تک جاتا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر اس بلند و بالا سفید محل کو دیکھا۔ اگر کبھی اسے اس محل سے بھاگنا ہو تو سارے چور راستے اسے معلوم ہوں۔ اسے اب کسی پہ بھی اعتبار نہیں رہا تھا۔

حیا نے کمرے کا نیم وا دروازہ پورا کھول دیا۔ وہ ایک چھوٹا اسٹڈی روم تھا جس میں آبنوسی اور صنوبر کی لکڑی کے بک شیلف بنے تھے، وہاں بہت سی بیش قیمت کتب سجی تھیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر آئی۔

اسٹڈی کی دیواروں پہ جابجا بڑے بڑے فوٹو فریم نصب تھے۔ وہ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں انہیں دیکھے گئی۔ وہ سب اس کی تصاویر تھیں۔ کب لی گئیں کیسے لی گئیں، وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ تو بس مبہوت سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

وہ داور بھائی کی مہندی والے روز اپنے گیٹ سے نکل رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے لہنگا ذرا سا اٹھائے، دوسرے سے آنکھ کا کنارہ صاف کرتی ہوئی۔

وہ کار کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی تھی۔ ریڈ فراک میں ملبوس، بال کانوں کے پیچھے اڑستی، مضطرب سی کچھ کہتی ہوئی۔ داور بھائی کی شادی کی شام البتہ ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا ولید تصویر میں نہیں تھا۔

اور یہ تصویر جناح سپر کی تھی۔ وہ سر جھکائے، جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس نیم تاریک چبوترے کے سامنے چل رہی تھی۔ سڑک پہ دکانوں کی زرد روشنیوں کا عکس جھلملا رہا تھا اور بھی بہت سی

تصویریں..... بہت سے واقعات.....

وہ ایک دم پلٹی اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

✲ ✲ ✲

ہر سو آگ پھیلی تھی۔ زرد، سرخ لپٹیں کسی اژدہے کی زبان کی مانند لپک لپک کر اس کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ وہ وسط میں کھڑی تھی اور اطراف میں دائرے کی صورت الاؤ بھڑک رہا تھا۔ شعلے ہر گزرتے پل بڑھتے جا رہے تھے، ہر سو دھواں تھا۔ اس کے سیاہ فراک کا دامن جل رہا تھا۔ دھواں، سرخ شعلے..... ہراقلیطس کی دائمی آگ.....

گرمی کی حدت ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ وہ بری طرح سے جل رہی تھی۔

"پانی..... پانی ڈالو میرے اوپر....." وہ تکیے پہ بند آنکھوں سے گردن ادھر ادھر مارتی، ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اس کا سارا جسم پسینے میں بھیگا تھا۔ تنفس تیز تیز چل رہا تھا۔ گرمی..... اسے گرمی لگ رہی تھی۔

وہ لحاف پھینک کر تیزی سے باہر بھاگی۔ لکڑی کا گول چکر کھاتا زینہ اس نے دوڑتے قدموں سے عبور کیا اور بنا کسی طرف دیکھے، باہر کا دروازہ پار کر گئی باغیچے میں اتر کر وہ گیٹ سے باہر نکل گئی۔

رات ہر سو پھیلی تھی۔ بارش تڑاتڑ برس رہی تھی۔ سیاہ آسمان پہ کبھی کبھی چمکیلی بجلی نمودار ہوتی تو پل بھر کو سڑک اور سارے بنگلے روشن ہو جاتے، پھر اندھیرا چھا جاتا۔ وہ دونوں بازو سینے پہ لپیٹے اس برستی بارش میں سڑک پہ چلتی جا رہی تھی آسمان کے تھال گویا الٹ گئے تھے، بارش تڑاتڑ گرتی اس کو بھگو رہی تھی۔

اس کا پاؤں کسی پتھر سے ٹکرایا تو اسے ٹھوکر لگی۔ وہ گھٹنوں کے بل پتھریلی زمین پہ گر گئی۔ ہتھیلیاں چھل گئیں، گھٹنوں پہ بھی خراشیں آئیں۔ اس نے ہتھیلیاں جھاڑتے ہوئے اٹھنا چاہا، کمر میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ وہ واپس بیٹھ گئی، گھٹنوں کے بل، سڑک کے وسط میں۔

پانی سے اس کا لباس بھیگ چکا تھا۔ بال موٹی لٹوں کی صورت چہرے کے اطراف سے چپک گئے تھے، اس کے اندر کی آگ سرد پڑنے لگی تھی۔ جامنی پڑتے لب کپکپانے لگے تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کسی معمول کی طرح چلتی ہوئی وہ واپس اس سفید محل تک آئی تھی۔

لونگ روم کی انگیٹھی میں دو لکڑیاں جل رہی تھیں۔ اندھیرے کمرے میں آگ اور اوپر لگے مدھم سے زرد بلب کی روشنی نے عجب فسوں طاری کر رکھا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے یہ سب نہیں دیکھا تھا مگر اب چوکھٹ پہ کھڑی وہ دیکھ رہی تھی۔ عائشے بڑے صوفے پہ سر جھکائے بیٹھی، سامنے میز پہ رکھے کاغذ پہ پیمانے سے لکیر کھینچ رہی تھی۔ آہٹ پہ اس نے گردن موڑی۔

"آؤ، بیٹھو۔" وہ نرمی سے کہتی صوفے کے ایک طرف ہو گئی اور دونوں ہاتھوں سے وہ لمبا سا کاغذ رول کرنے لگی۔

"یہ آگ بجھا دو!" وہ آتش دان میں بھڑکتے شعلوں کو دیکھتے ہوئے بولی تو اس کی آواز بیوک ادا کی بارش کی طرح گیلی تھی۔

عائشے بنا تردد کے اٹھی، اور آتش دان کے ساتھ لگا سوئچ گھمایا۔ آگ بجھ گئی۔ مصنوعی انگارے سرخ رہ گئے جو دراصل ہیٹر کے راڈ تھے جس سے بھڑکنے والی آگ اس مصنوعی لکڑیوں کے اوپر یوں ابھرتی گویا اصلی لکڑیاں جل رہی ہوں۔

"اب آؤ۔" اپنی بات دہرا کر عائشے رول کر کے لپیٹے کاغذ پہ ربڑ بینڈ چڑھانے لگی۔

وہ میکانکی انداز میں چلتی آگے آئی اور صوفے کے دوسرے کنارے پہ ٹک گئی۔ اس کی نگاہیں بجھتے انگاروں پہ تھیں جو اپنا سرخ رنگ کھو رہے تھے۔

"اپنے گھر فون کر لو، وہ لوگ پریشان ہوں گے۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں سب کو کیسے فیس کروں گی؟" آتش دان پہ جمی اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سراسیمگی تیر رہی تھی۔

"جس اللہ نے تمہاری پہلے مدد کی ہے، وہ اب بھی

کرے گا۔"

"تین دن ہو گئے ہیں' اب تک سب کو پتا چل گیا ہو گا۔"

"جب تمہارا قصور نہیں ہے تو ڈرو بھی مت۔" عائشے نے کارڈلیس اس کی طرف بڑھایا۔ "اگر انہوں نے کوئی غلط بات کی تو میں دوبارہ نہیں کہوں گی مگر ایک دفعہ کوشش کرلو۔"

اس نے کارڈلیس پکڑتے ہوئے عائشے کو دیکھا۔ سیاہ اسکارف میں لپٹا اس کا چہرہ مدھم روشنی میں بھی دمک رہا تھا۔ اب اس کی آنکھیں گہری لگ رہی تھیں۔ سیاہی مائل گہری۔

اس نے وال کلاک کو دیکھا۔ یہاں آدھی رات تھی تو وہاں نو' دس بجے ہوں گے۔ گھر کا نمبر اسے زبانی یاد تھا' وہ بھیگی انگلیوں سے بٹن پش کرنے لگی۔ پھر فون کان سے لگایا۔

عائشے اپنے پیمانے' پرکار اور پنسل سمیٹ کر چھوٹی تھیلی میں ڈالنے لگی۔

"ہیلو۔" وہ فاطمہ کی آواز تھی۔

"ہیلو اماں؟ میں حیا....." اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ "کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں' سوری بیٹا! میں تمہیں اتنے دن فون ہی نہیں کر سکی۔ اصل میں مہوش کی دعوتیں ہو رہی ہیں آج کل پوری فیملی میں' کبھی کدھر تو کبھی کدھر۔ اتنی مصروف رہی کہ روز فون کرنا ہی رہ جاتا تھا۔"

"ابا..... ابا کدھر.....؟" اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"وہ یہ سامنے ہی بیٹھے ہیں' کراچی گئے تھے' آج ہی واپسی ہوئی ہے....." اماں اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس کے سینے میں اٹکی سانسیں بالآخر بحال ہوئیں۔ دکھتے سر میں درد ذرا کم ہوا۔

کسی کو پتا نہیں چلا تھا۔

اماں سے پھپھو کا نمبر لے کر اس نے انہیں کال کی۔

"اچھی بھتیجی ہو تم بھی۔ کھانے کا کہہ کر غائب ہی ہو گئیں۔ میں پہلے تو اتنی پریشان رہی' سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ جہان کو پوری رات سخت بخار رہا' اس کو بھی نہیں اٹھا سکتی تھی۔ تمہارے دونوں نمبرز بھی بند تھے۔ صبح ہوتے ہی تمہارے ہاسٹل گئی تو وہ جو فلسطینی لڑکا ہے نا....."

"معتصم المرتضیٰ؟"

"ہاں وہی' اس نے بتایا کہ تم نے اپنی ہوسٹ آنٹی کے گھر رکنا تھا' مجھے بتا تو دیا ہوتا حیا....." پھپھو فکر مند سی تھیں' مگر معتصم..... وہ اس پزل میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ حیا نے پھپھو کے گھر رکنا ہے یا ہوسٹ آنٹی کی طرف۔ ان کی تسلی تشفی کروا کر' پرس میں پانی جانے سے دونوں فونز خراب ہونے کی یقین دہانی کروا کر جب اس نے فون بند کیا تو عائشے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"میں نے کہا تھا نا' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تم آرام سے ڈھیر سارے دن ہمارے ساتھ رہو۔ کل ہم تمہیں اپنے ساتھ جنگل لے جائیں گے' چلو گی نا۔"

"ہاں..... چلوں گی۔" وہ ذرا سا مسکرائی۔ اس کے بالوں کے سروں سے قطرے ابھی تک ٹپک رہے تھے۔

"آگ سے مت ڈرا کرو۔ آگ سے اسے ڈرنا چاہیے جس کے پاس اللہ کو دکھانے کے لیے کوئی اچھا عمل نہ ہو۔ تم تو اتنی اچھی لڑکی ہو' تم کیوں ڈرتی ہو؟"

اس نے ویران نگاہوں سے عائشے کا چہرہ دیکھا۔ ذہن کے پردے پہ ایک ویڈیو لہرائی تھی اور اس کے نیچے لکھے کمنٹس۔

"میں اچھی لڑکی نہیں ہوں۔"

"کوئی لڑکی بری نہیں ہوتی' بس اس سے کبھی کبھی کچھ برا ہو جاتا ہے اور تم سے بہت کچھ اچھا بھی تو ہوا ہے نا۔ تم نے ایک امیر اور طاقت ور شخص کے لیے اپنے شوہر کو نہیں چھوڑا' تم نے وفا نبھائی۔ اس سے بڑی اچھائی کیا ہو گی؟"

"میری دنیا تمہاری دنیا سے مختلف ہے عائشے! ہم میں بہت فرق ہے۔"

"چلو پھر تم ڈھیر سارے دن میری دنیا میں رہو اور پھر تم مجھے بتانا کہ امید اور انجام کے اعتبار سے کس کی دنیا زیادہ اچھی ہے؟" ساتھ ہی اس نے مسکرا کر نرمی سے حیا کا ہاتھ دبایا۔

"تم کون ہو عائشے؟ میرا مطلب ہے تمہارا.....؟" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں اس گھر کی مالکن ہوں۔ بہارے میری بہن ہے اور آنے میری دادی کی سگی بہن ہے۔ آنے ترک ہے مگر اس کا شوہر انڈین تھا۔"

"آنے عبدالرحمٰن پاشا کی ماں؟"

"ہاں وہی۔ مگر ہم آنے کو آنے کہتے ہیں دادی وغیرہ نہیں۔"

"تو پاشا تمہارا چچا لگا؟" وہ سوچ سوچ کر کہہ رہی تھی۔ جواباً وہ سادگی سے مسکرائی۔

"چچا باپ کا سگا بھائی ہوتا ہے اس لحاظ سے وہ میرا اور بہارے کا چچا ہے نہ ہی محرم۔ خیر اب تم سو جاؤ صبح ملتے ہیں۔"

وہ سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے واقعی نیند کی ضرورت تھی۔

☆ ☆ ☆

عائشے گل نے کہا تھا کہ اس سفید محل کی مالکن وہ ہے اس لیے وہ ادھر رک گئی تھی۔ ذہنی اور جسمانی طور پہ وہ قطعاً اتنی صحت یاب نہیں تھی کہ واپس جاتی ابھی وہ اکیلی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اسے کوئی سہارا چاہیے تھا اور اس نے ان تین عورتوں کو اپنا سہارا بنا لیا۔ آنے آج کل استنبول گئی ہوئی تھیں اور پیچھے گھر میں صرف وہ دونوں بہنیں اس کے ساتھ تھیں۔

صبح اس نے عائشے کا لایا ہوا لباس زیب تن کیا۔ پوری آستینوں والی پاؤں کو چھوتی آف وائٹ میکسی جس کا گلا گردن تک بند تھا اور جگہ جگہ سفید ننھے ننھے موتی لگے تھے۔ بال چہرے کے ایک طرف ڈالے وہ دونوں پہلوؤں سے میکسی ذرا سی اٹھائے لکڑی کے زینے اتر رہی تھی جب اس نے عائشے کی آواز سنی۔ وہ نیچے اپنے بیڈ روم کے ادھ کھلے دروازے سے کمبل تہہ کرتے ہوئے بہارے کو آوازیں دیتی نظر آرہی تھی۔

"بہارے گل اٹھ جاؤ۔ اور کتنا سوؤ گی؟" فیروزی اسکارف اور اسکرٹ بلاؤز پہ لمبا سوئیٹر پہنے وہ باہر جانے کے لیے تیار تھی۔

"بس پانچ منٹ اور عائشے گل!" کمبل سے بہارے کی آواز آئی۔

"ہماری امت کے صبح کے کاموں میں برکت ہوتی ہے بہارے! جو علی الصبح روزی کی تلاش میں نکلتے ہیں ان کا رزق بڑھتا ہے جو پڑھتے ہیں ان کا علم بڑھتا ہے اور جو سوتے رہتے ہیں ان کی نیند بڑھ جاتی ہے اور پھر وہ سارا دن سوتے ہی رہتے ہیں۔"

بہارے منہ بسورتی کمبل پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ عائشے اس کا کمبل بھی تہہ کرنے لگی۔

"تم ہمارے ساتھ چلو گی حیا؟" بہارے نے مندی مندی آنکھوں سے اسے چوکھٹ میں کھڑے دیکھا تو پوچھ اٹھی۔

"ہاں ابھی تم جنگل جاؤ گی؟"

"نہیں پہلے ہم سفیر کی ممی کی طرف جائیں گے مجھے ذرا کام تھا ان سے۔ ٹھیک ہے نا؟" عائشے نے تائید چاہی۔

"شیور!" اس نے شانے اچکا دیے۔ وہ خود کو ان دو بہنوں کے رحم و کرم پہ چھوڑ چکی تھی۔

"یہ سب کس لیے؟" عائشے بگھی کے صندوق میں چمکتے ہوئے اوزار رکھ رہی تھی تو حیا پوچھ اٹھی۔

"ہم جنگل لکڑیاں کاٹنے جاتے ہیں۔ یہاں لکڑیاں کاٹنے کی اجازت ہے تو نہیں مگر ہمارے پاس خصوصی پرمٹ ہے۔ ہم لکڑی کی چیزیں بنا کر بازار میں بیچتے ہیں۔"

"اتنے بڑے گھر کی مالکن کو بڑھئی بننے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ بگھی میں چڑھتے ہوئے مسکرا کر بولی تھی۔

"حیا سلیمان ہمیں انڈر اسٹیمیٹ مت کرو۔ ہم بہت مہنگی چیزیں بناتے ہیں۔" وہ ہنس کر کہتے ہوئے اندر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں اطراف میں تھیں اور بہارے ان کے درمیان۔

بگھی اب بنگلوں سے گھری سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سارے میں گونج رہی تھی۔

"عثمان انکل کا گھر کہاں ہے؟"

"وہیں مسجد کے پاس۔ تم نے ہماری مسجد دیکھی ہے نا وہاں تم ایک دفعہ آئی تھیں۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ میں نے تب تم دونوں کو دیکھا تھا۔" وہ ہوا سے اڑتے بالوں کو سمیٹتے ہوئے بولی تھی۔ بہارے کے چہرے پہ بار بار اس کے بال اڑ کر آ رہے تھے۔ مگر بہارے برا مانے بغیر اپنے گلابی بڑے سے پرس کو سینے سے لگائے خاموش سی بیٹھی تھی اس کے گھنگھریالے بھورے بال پونی میں بندھے تھے۔

"تمہارے ساتھ اس دن کوئی تھا؟" عائشے نے آنکھیں بند کر کے لمحے بھر کو جیسے یاد کیا۔ فیروزی اسکارف میں اس کی بھوری سبز آنکھیں اب نیلی سبز لگ رہی تھیں۔

"ہاں وہ میرا کزن ہے اور..... شوہر بھی۔"

"اچھا تھا!" عائشے مسکرا دی۔

وہ بھی جواباً ذرا سا مسکرائی۔ اس پل اسے وہ اچھا شخص بہت یاد آیا تھا۔ شیخ عثمان شبیر کا بنگلہ بیوک ادا کے دوسرے بنگلوں کی نسبت ذرا سا سادہ تھا۔ ایک بڑے کمرے میں جہاں فرشی نشست تھی حلیمہ آنٹی ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ بہت ملنسار بہت خوبصورت خاتون تھیں۔ شلوار قمیص پہ بڑا سا دوپٹا چہرے کے گرد لپیٹے وہ پہلی ہی نظر میں اسے بہت اچھی لگی تھیں۔

"یہ حیا ہے میں نے بتایا تھا نا؟" عائشے قالین پہ ان کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی دونوں کے درمیان ایک چھوٹی میز تھی جس پہ عائشے نے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ حیا اور بہارے ایک طرف بیٹھ گئیں۔

"میں جانتی ہوں۔ مجھے اچھا لگا کہ تم حیا کو ساتھ لائی ہو۔" وہ مسکرا کر عائشے کے ہاتھ کی پشت پہ اسپرے کر رہی تھیں۔ حیا جواباً مسکرائی پھر بہارے کے قریب بہت دھیمی سی سرگوشی کی۔

"یہ کیا کر رہی ہیں؟"

"آج چاند کی 21 ویں تاریخ ہے نا آج عائشے اپنا خون نکلوائے گی۔ ابھی دیکھنا آنٹی اس کے ہاتھ میں بلیڈ سے کٹ لگائیں گی۔"

اس نے بے یقینی سے بہارے کو دیکھا اور پھر قدرے فاصلے پر بیٹھی عائشے اور حلیمہ آنٹی کو۔ وہ اس کے ہاتھ کی پشت پہ کچھ لگا رہی تھیں۔ عائشے کی اس کی جانب کمر تھی سو وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں سکتی تھی کہ وہ کیا کر رہی ہیں۔

قریباً پانچ منٹ بعد عائشے اٹھی تو اس کے ہاتھ کی پشت پہ ایک گول سرخ نشان سا بنا تھا۔ وہ یک ٹک اس کے ہاتھ کو دیکھے گئی۔

"یہ کیا.....؟" اس نے ناسمجھی سے عائشے کو دیکھا۔

"بہت عرصہ ہو گیا میں نے Cupping (سینگی لگوانا) نہیں کروائی تھی سوچا آج کروا لوں۔ تم نے کبھی کروائی ہے یہ تھراپی؟"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے لاشعوری طور پہ اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"تم..... کیوں کرواتی ہو یہ؟" وہ ابھی تک دزدیدہ نگاہوں سے عائشے کے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔

"میں یہ اس لیے کرواتی ہوں کیونکہ جب رسول اللہ معراج پر گئے تھے تو ادھر فرشتوں نے انہیں ہماری امت کے لیے جو بہت پرزور تاکید کی تھی وہ کپنگ کروانے کی تھی۔ اللہ نے اس میں بڑا سکون رکھا ہے۔ تم آنٹی سے باتیں کرو تب تک میں اور بہارے گل بہار باغ سے پھول توڑ لیں۔"

وہ دونوں باہر چلی گئیں۔ تو وہ قدرے ہچکچاتے ہوئے اٹھ کر ان کے سامنے آ بیٹھی۔ انہوں نے نرمی سے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھایا تو بلا ارادہ حیا نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ تب اسے

محسوس ہوا کہ انہوں نے شفاف پتلا دستانہ پہن رکھا تھا۔

"تم اچھا محسوس کروگی۔ یہ تمہاری اداسی لے جائے گا۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ میری اداسی ان چیزوں سے دور ہو سکتی ہے۔" وہ ان کے ہاتھ میں دبے اپنے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی جس کی پشت پہ وہ کوئی اسپرے کر رہی تھیں۔

"وہ کیوں؟"

"میری زندگی بہت پیچیدہ اور مسئلوں سے بھری ہے۔" اس نے اداسی سے کہتے ہوئے نفی میں سر جھٹکا۔ کھڑکی سے چھن کر آتی صبح کی روشنی اس کے چہرے پہ پڑے نیلوں کو واضح کر رہی تھی۔ "میری بیسٹ فرینڈ میرے سامنے دم توڑ گئی اور میں کچھ نہیں کر سکی۔ میں نے بہت دعا کی تھی حلیمہ آنٹی! مگر وہ پھر بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔"

"وہ نہ مرتی تو کل کو تم خود ہی اسے چھوڑ جاتیں۔ بعض چیزیں ہمیں ناگوار لگتی ہیں مگر وہ ہمارے لیے اچھی ہوتی ہیں۔ اگر وہ اس بیماری سے بچ جاتی مگر معذور ہو جاتی اور کسی بھی وجہ سے اس کا گھر چھوٹ جاتا' وہ تمہارے آسرے پر آپڑتی اور تمہیں ساری زندگی اس کی خدمت کرنی پڑتی تو تم چند ماہ یہ کر پاتیں' پھر تنگ آکر خود ہی اس کو چھوڑ دیتیں۔ بعض دفعہ موت میں بھی ایک ریلیف ہوتا ہے۔" وہ اس کے ہاتھ کی پشت پہ زیتون کا تیل ملتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"مگر میں نے اسے اللہ سے ویسا ہی مانگا تھا جیسی وہ تھی!"

"وہ تمہیں اگلے جہاں میں اسے ویسا ہی واپس کردے گا' اور وہی تم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔" وہ رسان سے کہتے ہوئے اب ایک شیشے کا کپ جس کے پیندے پہ کوئی آلہ لگا تھا' الٹا کر کے اس کی ہتھیلی کی پشت پہ رکھ رہی تھیں۔

"مگر میں اس غم کا کیا کروں جو میرے اندر سلگ رہا ہے؟"

"غم؟" سر جھکائے' الٹے رکھے کپ کو دباتے ہوئے انہوں نے نفی میں گردن ہلائی۔ "ہم مرنے والے کے لیے تھوڑی روتے ہیں' بچے! مرنے والے کے لیے کوئی بھی نہیں روتا۔ ہم سب تو اپنے نقصان پہ روتے ہیں' ہمارا غم تو بس یہی ہوتا ہے کہ وہ "ہمیں" اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔"

وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں دیکھے گئی۔ اسے اپنے ہاتھ پہ کپ کا دباؤ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ چند لمحے کے لیے ہر شے سے دور چلی گئی تھی۔

"میری زندگی میں اتنے مسئلے کیوں ہیں حلیمہ آنٹی؟"

"تمہیں لگتا ہے حیا! کہ صرف تمہاری زندگی میں مسئلے ہیں؟ باقی سب خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں؟ نہیں بچے! یہاں تو ہر شخص دکھی ہے۔ ہر ایک کا دل ٹوٹا ہوا ہے۔ سب کو کسی "ایک" چیز کی طلب ہے۔ کسی کو مال چاہیے' کسی کو اولاد' کسی کو صحت تو کسی کو رتبہ۔ کوئی ایک محبوب شخص یا کوئی ایک محبوب چیز' بس یہی ایک مسئلہ ہے ہماری زندگی میں' ہم سب کو ایک شے کی تمنا ہے۔ وہی ہماری دعاؤں کا موضوع ہوتی ہے' اور وہ ہمیں نہیں مل رہی ہوتی۔ وہی چیز ہمارے آس پاس کے لوگوں کو بے حد آسانی سے مل جاتی ہے اور ہم ان پہ رشک کرتے رہ جاتے ہیں' یہ جانے بغیر کہ ان لوگوں کی خاص تمناوہ چیز ہے ہی نہیں۔ وہ تو کسی اور چیز کے لیے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ یوں ہم اس ایک شے کے لیے اتنا روتے ہیں کہ وہ ہماری زندگی پہ حاوی ہو جاتی ہے اور یہ شے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ تم مجھے ایک بات بتاؤ' تمہاری زندگی میں بہت سے مسئلے آئے ہوں گے۔ لمحے بھر کو اپنے سارے مسئلے یاد کرو۔"

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ اب کپ ہٹا کر اس گول نشان کے اندر موجود جلد میں نشتر کی سوئی سے کٹ لگا رہی تھیں۔ اسے تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ کچھ اور یاد کر رہی تھی۔

"سفید پھول..... شریفوں کا مجرا کی ویڈیو..... ارم کے

رشتے کے لیے آئے لڑکے کا انہیں پہچان جانا.... ولید کی بدتمیزی.... ترکی کا ویزا نہ ملنا.... پھر یہاں آکر پھولوں کا سلسلہ.... اس کا بیوک ادا میں قید ہو جانا.... پھر اس کا اغوا.... اور آگ کا وہ بھڑکتا الاؤ....“ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اس کی ہتھیلی کی پشت پہ خون کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ حلیمہ آنٹی نے کپ واپس ہتھیلی پہ رکھ کر دباتے ہوئے اس کو دیکھا۔

”اب بتاؤ‘ ان مسئلوں کا کیا بنا؟“

”کیا بنا؟“ وہ غائب دماغی سے کپ کو دیکھ رہی تھی۔ اوپر لگا Sucker اندر سے خون کھینچ رہا تھا۔ شیشے کا کپ سرخ ہونے لگا تھا۔

”میں تمہیں بتاؤں ان مسئلوں کا کیا بنا؟ وہ مسئلے حل ہو گئے۔ سارے مسئلے ایک ایک کر کے حل ہوتے گئے مگر نئے مسئلوں نے تمہیں اتنا الجھا دیا کہ تمہارے پاس ان بھولے بسرے مسئلوں سے نکلنے پہ اللہ کا شکر ادا کرنے کا وقت ہی نہیں رہا۔“

وہ بے یقینی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ واقعی‘ اس کے وہ سارے مسئلے تو حل ہو گئے تھے.... اس نے کبھی سوچا ہی نہیں....

”ہر شخص کی زندگی میں ایک ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب وہ تباہی کے دہانے پہ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے راز کھلنے والے ہوتے ہیں اور اس وقت جب وہ خوف کے کوہ طور تلے کھڑا کپکپا رہا ہوتا ہے تو اللہ اسے بچا لیتا ہے۔ یہ اللہ کا احسان ہے اور اسے اپنا ایک ایک احسان یاد ہے‘ ہم بھول جاتے ہیں‘ وہ نہیں بھولتا۔ تم اپنے حل ہوئے مسئلوں کے لیے اس کا شکر ادا کیا کرو۔ جو ساری زندگی تمہارے مسئلے حل کرتا آیا ہے‘ وہ آگے بھی کر دے گا‘ تم وہی کرو جو وہ کہتا ہے‘ پھر وہ وہی کرے گا جو تم کہتی ہو۔ پھر جن کے لیے تم روتی ہو‘ وہ تمہارے لیے روئیں گے‘ مگر تب تمہیں فرق نہیں پڑے گا۔“

کپ کا شیشہ سرخ ہو چکا تھا۔ اس میں اوپر تک خون بھرتا جا رہا تھا۔

”میں.... میرا لائف اسٹائل بہت مختلف ہے‘ میں ان چیزوں سے خود کو ریلیٹ نہیں کر پاتی۔ لمبی لمبی نمازیں‘ تسبیحات‘ یہ سب نہیں ہوتا مجھ سے۔ میں زبان پہ آئے طنز کو نہیں روک سکتی‘ میں عائشے گل کی طرح کبھی نہیں بن سکتی۔ میں ان چیزوں سے بہت دور آ گئی ہوں۔“

”دور ہمیشہ ہم آتے ہیں۔ اللہ وہیں ہے جہاں پہلے تھا۔ فاصلہ ہم پیدا کرتے ہیں اور اس کو مٹانا بھی ہمیں ہوتا ہے۔“ انہوں نے خون سے بھرا کپ سیدھا کر کے ایک طرف رکھا اور ٹشو سے اس کا ہاتھ صاف کیا۔ ہاتھ کی پشت پہ گول دائرے میں جگہ خاصی اونچی ابھر گئی تھی‘ کسی بیک شدہ کیک کی طرح جس کا درمیان کناروں سے زیادہ اونچا ابھر جاتا ہے۔

”حلیمہ آنٹی! کیا میرے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے؟“

”پہلے جس نے حل کیے تھے‘ وہ اب بھی حل کر دے گا۔ حیا! لوگ کہتے ہیں کہ زندگی میں یہ ضروری ہے اور وہ ضروری ہے۔ میں تمہیں بتاؤں‘ زندگی میں کچھ بھی ضروری نہیں ہوتا‘ نہ مال‘ نہ اولاد‘ نہ رتبہ‘ نہ لوگوں کی محبت۔ بس آپ ہونے چاہئیں‘ اور آپ کا اللہ سے ایک ہر پل بڑھتا تعلق ہونا چاہیے۔ باقی یہ مسئلے تو بادل کی طرح ہوتے ہیں۔ جہاز کی کھڑکی سے کبھی نیچے تیرتا کوئی بادل دیکھا ہے؟ اوپر سے دیکھو تو وہ کتنا بے ضرر لگتا ہے مگر جو اس بادل تلے کھڑا ہوتا ہے نا‘ اس کا پورا آسمان بادل ڈھانپ لیتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ روشنی ختم ہو گئی‘ اور دنیا تاریک ہو گئی۔ غم بھی ایسے ہوتے ہیں۔ جب زندگی پہ چھاتے ہیں تو سب تاریک لگتا ہے‘ لیکن اگر تم اس زمین سے اوپر اٹھ کر آسمانوں سے پورا منظر دیکھو تو تم جانو گی کہ یہ تو ایک ننھا سا ٹکڑا ہے جو ابھی ہٹ جائے گا۔ اگر یہ سیاہ بادل زندگی پہ نہ چھائیں نہ حیا! تو ہماری زندگی میں رحمت کی کوئی بارش نہ ہو۔“

انہوں نے تیل لگا کر اس کا ہاتھ صاف کر دیا تھا۔ اس نے ہاتھ چہرے کے قریب لے جا کر دیکھا۔

”میں اتنا جلی ہوں آنٹی! کہ مجھے لگتا ہے میرا دل ہی مر گیا ہے۔“

”جلنا تو پڑتا ہے بچے۔ جلے بغیر کبھی سونا کندن نہیں بنتا۔“ ان کی بات پہ وہ آزردگی سے مسکرائی۔

”یہ ابھی ٹھیک ہو جائے گا‘ اور تم بھی ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

”تھینک یو آنٹی! مجھے آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا۔ ایک آخری بات‘ کیا یہ اتفاق تھا کہ عثمان انکل اور ہم ایک ہی فلائٹ میں آئے تھے؟“

”اس دنیا میں اتفاق کم ہی ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے عثمان کو عبدالرحمٰن نے ایسا کہا تھا۔“

وہ سمجھ کر سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کبھی اسے لگتا‘ اسے زندگی میں سب سے زیادہ تکلیف پاشا نے دی ہے اور کبھی لگتا کہ اس کے احسان اس کی دی گئی اذیت سے زیادہ ہیں۔

بگھی سڑک پہ رواں دواں تھی۔ رات کی بارش اب سوکھ چکی تھی اور ہر جگہ نکھری نکھری‘ دھلی دھلائی لگ رہی تھی۔ سبزہ‘ ہوا‘ سرمئی سڑک وہ چھوٹا سا جزیرہ جنت کا ٹکڑا لگتا تھا۔ وہ بگھی کی کھڑکی سے باہر دیکھتی ان باتوں کو سوچ رہی تھی جو حلیمہ آنٹی نے اس سے کہی تھیں۔

”عائشے۔“ اس نے کچھ کہنے کے لیے گردن ان دونوں کی طرف پھیری تو ایک دم ٹھہر گئی۔ درمیان میں بیٹھی بہارے اپنے گلابی پرس سے کچھ نکال رہی تھی۔ حیا بالکل ساکت‘ سانس روکے اسے دیکھے گئی۔

وہ حیا کا بھورے رنگ کا لکڑی کا پزل باکس تھا۔

”بہارے.... یہ تم نے کہاں سے لیا؟“ وہ بنا پلک جھپکے اس باکس کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ مجھے عبدالرحمٰن نے میری برتھ ڈے پہ گفٹ کیا تھا‘ اس میں میرا گفٹ ہے‘ مگر ابھی یہ مجھ سے کھلا نہیں ہے۔“ وہ مایوسی سے بتاتی اس کی سلائیڈ پہ انگلی پھیر رہی تھی جس میں پانچ حروف بنے تھے۔ باکس کے اوپر ڈھکن کی سطح پہ انگریزی میں ایک لمبی سی نظم کھدی تھی۔ یہ حیا کا باکس نہیں تھا‘ مگر یہ بالکل اس جیسا تھا۔

”یہ.... یہ اس نے کہاں سے لیا؟“

”ہم سے ہی لیا تھا۔ عائشے نے بتایا نہیں‘ ہم جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر یہی پزل باکسز تو بناتے ہیں۔ بہت مہنگے بکتے ہیں یہ۔ ان میں فائیو لیٹر کوڈ لگتا ہے‘ جس کے بغیر یہ نہیں کھلتے۔“

عائشے مسکراتی ہوئی بہارے کی بات سن رہی تھی۔

”سنو....“ وہ بہت دیر بعد بولی۔ اس کی نگاہیں ابھی تک اس باکس پہ تھیں۔ ”تم نے کبھی کوئی ایسا باکس بنایا ہے‘ جس میں چھ حروف کا کوڈ ہو؟“

وہ دونوں ایک دم چونکیں۔

”ہاں‘ میں نے بنایا تھا۔“

”کس کے لیے؟“ وہ بے چینی سے بولی۔

”عبدالرحمٰن کا کوئی ملازم تھا‘ اس نے چھ حرفی کوڈ بار کا آرڈر دیا تھا تو میں نے بنا دیا۔ مہینہ پہلے کی بات ہے۔“ وہ سوچ کر بتانے لگی۔

”تو اس کا کوڈ تم نے ہی رکھا ہو گا۔ تمہیں وہ یاد ہے؟“

”یاد؟“ عائشے ذرا جھینپ کر ہنسی۔ ”چھ حروف کا کوئی لفظ ذہن میں نہیں آ رہا تھا تو میں نے اس کا کوڈ Ayeshe رکھ دیا۔ عائشے میں چھ حروف ہوتے ہیں نا!“

"جو شخص یہ تم سے خریدنے آیا تھا' اس کو جانتی ہو تم؟" چند لمحے کے توقف کے بعد وہ ذرا سوچ کر پوچھنے لگی۔

"میں اس کا نام تو نہیں جانتی مگر وہ اونچے قد کا حبشی تھا اور اس کے بال گھنگھریالے تھے۔"

"اچھا!" حیا نے بہارے کو اس کا پزل باکس واپس کر دیا۔ اب وہ اپنے پزل باکس کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس کے کمرے میں رکھا تھا۔ اگر وہ وہی باکس تھا جو عائشے نے بنایا تھا اور اسے عبدالرحمٰن کے ہی کسی آدمی نے عائشے سے خریدا تھا اور قوی امکان تھا کہ اس نے وہ "ڈولی" کے پاس بھجوا دیا تھا' تو کیا عبدالرحمٰن اس بات سے واقف تھا؟ یا پھر عائشے سے خریدنے والا شخص ہی ڈولی تھا کیونکہ ڈولی بھی تو پاشا کا خاندانی ملازم تھا۔ کچھ ایسا ہی بتایا تھا اے آر پی کی ماں نے اسے۔

"سُنو! کیا عبدالرحمٰن پاشا کو معلوم ہے کہ تم نے اس کے کسی ملازم کے لیے باکس بنایا ہے؟"

"حیا! مجھ سے بہت سے لوگ پزل باکسز خریدتے ہیں' میں ہر ایک کی خبر عبدالرحمٰن کو نہیں کرتی اور اس نے تو مجھے عبدالرحمٰن کو بتانے سے منع کیا تھا۔ تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کیونکہ اس نے صرف عبدالرحمٰن کو بتانے سے منع کیا تھا۔" عائشے ذرا سا مسکرا کر بولی۔

حیا نے اثبات میں گردن ہلا دی اور باہر دیکھنے لگی۔ بگھی اس بل کھاتی سڑک پہ اوپر چڑھ رہی تھی۔ وہاں دونوں اطراف میں سرسبز اونچے درخت تھے مری میں عموماً سڑک کے ایک جانب ایسے اونچے درخت ہوتے تھے اور دوسری جانب کھائی' مگر یہاں دونوں جانب ہی گھنا جنگل تھا۔

بالآخر ایک جگہ بگھی بان نے بگھی روک دی۔ عائشے نیچے اتری اور بگھی کے پیچھے مرصع صندوق سے اوزاروں کا بھاری تھیلا نکالا۔ حیا اور بہارے بھی اس کے پیچھے اتر آئیں۔ اب آگے انہوں نے پیدل چلنا تھا۔

"تم چل لو گی؟" عائشے نے تھیلا اٹھاتے ہوئے ذرا فکر مندی سے اسے دیکھا۔

"ہاں' میں بہتر محسوس کر رہی ہوں۔" اس نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ عائشہ کو تسلی دی۔

بہارے سب سے آگے اچھلتی' کودتی' ذرا لہک لہک کر کچھ گاتی چل رہی تھی۔

"کائنات وہ ہے جسے تو نے بنایا
اور سیدھا رستہ وہ ہے جسے تو نے دکھایا
پس تو قدموں کو پھیر دے
اپنی رضا کی طرف
اے بلندیوں کے رب!"

وہ ایک عربی گیت گنگناتی ادھر ادھر پودوں پہ ہاتھ مارتی چل رہی تھی۔ عائشے اس کے عقب میں تھی اور سب سے پیچھے حیا تھی جو اپنی سفید میکسی کو دونوں پہلوؤں سے اٹھائے سہج سہج پتھروں پہ پاؤں رکھ رہی تھی۔

وہاں ہر سو سرخ صنوبر' اور ببول کے درخت تھے۔ کچھ ایسے درخت بھی تھے جن کو وہ نہیں پہچانتی تھی۔ سرخ اور جامنی پھولوں کی جھاڑیاں بھی جا بجا تھیں۔

جنگل میں کافی آگے جا کر عائشے ایک جگہ رکی۔ وہاں ایک درخت کا کٹا ہوا تنا پڑا تھا۔ اس نے تھیلا زمین پہ رکھا اور اندر سے کلہاڑے نکالنے لگی۔

ٹھنڈی ہوا صنوبر کے پتوں کو ہولے ہولے جھلا رہی تھی۔ حیا ایک بڑے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور عائشے کو کٹے ہوئے تنے پہ کلہاڑے سے ضربیں مارتے دیکھتی رہی۔ اس کی اتنے دنوں کی تھکن' نقاہت اور بیماری حلیمہ آنٹی کے شیشے کے پیالے میں رہ گئی تھی۔ وہ اب خود کو بہت ہلکا پھلکا اور تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ نیا چہرہ' نئی روح' نئی زندگی......

بہارے بھی اس کے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔ حیا کے بال ہوا سے اڑ کر اس کے چہرے کو چھونے لگے۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے نرمی سے ان کو سمیٹا۔

"تمہارے بال کتنے خوب صورت ہیں حیا۔"

اس نے گردن ذرا سی موڑ کر مسکراتے ہوئے بہارے کو دیکھا۔ وہ بہت محویت سے اس کے بالوں پہ ہاتھ اوپر سے نیچے پھیرتے کہہ رہی تھی۔

"میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میرے بال اتنے ہی لمبے اور ملائم ہوں اور میں انہیں ایسے ہی کھولوں مگر......" جوش سے کہتے کہتے اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔ "مگر عائشے کہتی ہے ' اچھی لڑکیاں بال کھول کر باہر نہیں نکلتیں۔"

بہارے کی بات پہ اس نے ایک نظر عائشے کو دیکھا جو کوٹ کی آستینیں موڑے رکوع میں جھکی لکڑی پہ کلہاڑا مار رہی تھی۔ ہر ضرب کے بعد وہ سیدھی ہوتی' اور پیشانی پہ آیا پسینہ آستین سے پونچھ کر پھر سے جھک جاتی۔

"وہ تمہیں منع کرتی ہے؟"

"نہیں' وہ کہتی ہے 'بہارے تمہاری مرضی' جب تم میں حیا نہ رہے تو جو جی چاہے کرو۔" اس نے عائشے کے خفگی بھرے انداز کی نقل کر کے دکھائی۔

"تم ساری دنیا میں سب سے زیادہ عائشے کی بات مانتی ہو؟"

"نہیں' پہلے عبدالرحمٰن کی' پھر عائشے کی!"

"تم عبدالرحمٰن کو بہت پسند کرتی ہو بہارے؟" وہ اپنی حیرت چھپاتے ہوئے استفسار کرنے لگی۔ کیا یہ بہنیں عبدالرحمٰن کی شہرت نہیں جانتیں؟ یا یہ اسے لوگوں سے زیادہ جانتی ہے۔"

"بہت زیادہ۔ وہ ہے ہی اتنا اچھا۔" وہ اس کے بالوں کو ہاتھ میں لیے بہت محبت سے کہہ رہی تھی۔ حیا نے اپنے کھلے بالوں کو دیکھا اور پھر بہارے کی نفاست سے بندھی گھونگھریالی پونی۔

"میں بال باندھ لوں بہارے؟ مجھے ہوا تنگ کر رہی ہے۔" اس نے جیسے خود کو وضاحت دی کہ وہ عائشے کی اچھی لڑکیوں والی نشانیوں کا اثر نہیں لے رہی۔ ہوا کی وجہ سے بال باندھنا چاہ رہی ہے۔

"میں باندھ دوں۔ میرے پاس فالتو پونی ہے۔" اس نے اپنے گلابی پرس میں ہاتھ ڈال کر جھٹ سے ایک سرخ رنگ کا بینڈ نکالا۔ حیا نے ذرا سا رخ موڑ لیا۔ بہارے اس کی پشت پہ گھٹنوں کے بل اونچی ہو کر بیٹھ گئی۔ اور اپنے نرم ہاتھوں سے اس کے بال سمیٹنے لگی۔ حیا نے آنکھیں بند کر لیں۔

"عثمانی سلطنت کی شہزادیاں تمہاری طرح خوب صورت ہوتی ہوں گی حیا! ہے نا؟" وہ نرمی سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتی اس کی ایک ڈھیلی سی چوٹی بنا رہی تھی۔ بینڈ باندھ کر اس نے چوٹی حیا کے کندھے پہ آگے کو ڈال دی۔ حیا نے اپنی موٹی' سیاہ چوٹی پہ ہاتھ پھیرا' اور گردن موڑ کر ممنونیت سے بہارے کو دیکھا۔

"میری اماں کہتی ہیں کہ میں اتنی خوب صورت نہ لگتی اگر میں اپنی گرومنگ پہ اتنی محنت نہ کرتی۔ تمہارا اور عائشے کا شکریہ' ورنہ میرے بال نہ بچ پاتے۔"

"دوست کس لیے ہوتے ہیں؟" بہارے نے مسکرا کر شانے اچکائے۔ اس نے اور عائشے نے کن جوکھوں سے اس کے بالوں سے ویکس اتاری تھی۔ یہ روداد بہارے اسے سنا چکی تھی۔ ویکس بال ضائع تب کرتی اگر کھینچ کر اتاری جاتی' جبکہ انہوں نے اسے پگھلا کر نرم کر کے اتارا تھا۔

"اچھا اپنا پزل باکس دکھاؤ' میں اس کی پہیلی دیکھوں۔" بہارے گل نے سر ہلا کر بیگ سے باکس نکال کر اسے تھمایا۔ اس کا گلابی بیگ ایک زنبیل تھی جس میں ہر شے موجود ہوتی تھی۔

"بہارے! تم نے حیا کا گفٹ نہیں بنایا؟" عائشے نے ہاتھ روک کر رکوع میں جھکے جھکے سر اٹھا کر خفگی سے اپنی بہن کو دیکھا۔

"اوہ ہاں! میں ابھی آئی۔" بہارے ماتھے پہ ہاتھ مارتی اٹھی' بڑے تھیلے میں سے ایک خالی ٹوکری نکالی اور درختوں کے درمیان اچھلتی پھدکتی آگے بھاگ گئی۔

عائشہ واپس کام میں مصروف ہو گئی۔

حیا سرتنے سے ٹکائے باکس کو چہرے کے سامنے لا کر دیکھنے لگی۔ اس کے ڈھکن پہ انگریزی میں چند فقرے کھدے تھے جو شاید ایک نظم تھی۔

A creamy eye in silver chest
Sleeps in a Salty depth
Rises from a prison grain
Shines as its veil is slain

پزل باکس کے کوڈ بار میں پانچ چوکھٹے بنے تھے۔ حیا نے تین چار دفعہ اس نظم کو پڑھا تو اسے وہ پانچ حرفی لفظ سمجھ میں آ گیا۔ جو اس باکس کی کنجی تھا۔ پہیلی آسان تھی' مگر ظاہر ہے' وہ بہارے کو جواب نہیں بتا سکتی تھی وہ بہارے کا تحفہ تھا اور اسے خود ہی کھولنا تھا۔

مگر کون لکھتا تھا یہ نظمیں؟ یہ پہیلیاں؟

باکس گود میں رکھے' اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس کے جسم کا سارا درد دھیرے دھیرے غائب ہو رہا تھا۔ ہر سو میٹھی نیند تھی' بہت دنوں بعد اس پہ سکون سا چھا رہا تھا۔ وہ حلیمہ آنٹی کی باتوں کو سوچتی' اپنے حل ہوئے مسئلوں کو یاد کرتی' کب سو گئی' اسے پتا نہیں چلا جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ جنگل میں اکیلی تھی۔ عائشے اور بہارے وہاں نہیں تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔

"عائشے...... بہارے۔" وہ متوحش انداز میں ان کو پکارتی درختوں کے درمیان آگے کو بھاگی۔

"حیا! ہم ادھر ہیں۔" عائشے نے کہیں قریب سے پکارا۔ وہ آواز کا تعاقب کرتی اس گھنے جھنڈ تک آئی تو دیکھا' عائشے ان درختوں کے پاس کلہاڑا پکڑے کھڑی تھی۔ ساتھ ہی بہارے زمین پہ بیٹھی تھی۔ کٹا تنا ساتھ ہی رکھا تھا۔

"تم سو گئی تھیں تو مجھے لگا' ہماری آوازیں تمہیں ڈسٹرب نہ کریں' سو ہم سب کچھ ادھر لے آئے۔"

"خیر تھی عائشے۔" اس نے خفت سے ان دونوں کو دیکھا۔ تنا' لکڑیاں' اوزار وہ ہر چیز بنا آواز پیدا کیے وہاں سے لے گئی تھیں' وہ بھی صرف اس کے خیال سے۔ اسے ان دو پریوں کی طرح معصوم لڑکیوں پہ بے حد پیار آیا۔

"تم بتاؤ' تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"بہت بہتر۔" وہ بہارے کے ساتھ خشک گھاس پہ بیٹھ گئی۔

بہارے کی گود میں سفید پھولوں کی لڑی رکھی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں ایک موٹی سبز ٹہنی پکڑے' اس کے دونوں سرے ملا کر ان کو باندھ رہی تھی' یوں کہ وہ ایک گول' سبز سا رنگ بن گیا تھا۔

"تم کیا کر رہی ہو؟"

"تمہارا گفٹ بنا رہی ہوں۔ تمہیں پہیلی سمجھ میں آئی؟"

"فوراً" ہی آ گئی۔ بہت آسان تھی۔" اور کم از کم اس کے لیے اسے کسی سنکی فلاسفر کے گدھوں اور کتوں والے اقوال زریں نہیں پڑھنے پڑے تھے۔

"عائشے کی بھی سمجھ میں آ گئی تھی' مگر یہ مجھے نہیں بتاتی۔"

"ٹھیک کرتی ہوں۔ یہ تمہارا تحفہ ہے اور تمہیں خود نکالنا ہے۔ تحفہ خوشی کے لیے ہوتا ہے' اگر تم اسے خود بوجھ کر نکالو گی تو تمہیں اصلی خوشی ہو گی ورنہ توڑ کر بھی نکال سکتی ہو۔" عائشے نے کہا۔

"عائشے ٹھیک کہہ رہی ہے' ویسے یہ پہیلیاں کون لکھتا ہے؟"

"عبدالرحمٰن کے پاس ہر کام کے لیے بہت سے بندے ہوتے ہیں۔ اس نے کسی سے لکھوالی ہو گی۔" بہارے نے شانے اچکا کر کہا۔ گویا عبدالرحمٰن سے بہت محبت و عقیدت کے باوجود اس کا خیال تھا کہ وہ اس نے خود نہیں لکھی تھی۔ تو پھر شاید ڈولی نے......؟

بہارے بہت مہارت سے سفید پھولوں کی لڑی کو سبز ٹہنی پر لپیٹ رہی تھی۔ یہاں تک کہ سبز رنگ' ایک سفید پھولدار حلقے میں تبدیل ہو گیا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے وہ تاج حیا کے سر پہ رکھا۔

"بہارے گل اور عائشے گل کی طرف سے!"

اس کے انداز پہ کام کرتی عائشے نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"بہارے گل اور عائشے گل کا بہت شکریہ!" اس نے مسکراتے ہوئے سر پہ پہنے تاج کو چھوا۔ مری میں ایسے تاج بکثرت ملتے تھے مگر ان میں سے کوئی تاج اتنا خوب صورت نہ تھا۔ کوئی تاج اتنا خوب صورت ہو

بھی نہیں سکتا تھا۔

بہارے اب پزل باکس اور سوئی دھاگہ احتیاط سے اپنی گلابی زنبیل میں رکھ کر عائشے کے ساتھ کام کروانے لگی تھی۔ اس نے بھی اٹھنا چاہا، مگر عائشے نے روک دیا۔

"تم مہمان ہو اور تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جب ٹھیک ہو جائے گی تو کروا لینا۔"

پھر کام ختم کر کے بہارے نے چٹائی بچھائی، اور بڑی باسکٹ سے پانی کی بوتل نکال کر حیا اور عائشے کے ہاتھ دھلائے۔ پھر لنچ باکسز کھول کھول کر چٹائی پہ رکھنے لگی۔

"یہ تلی ہوئی مچھلی ہے، یہ سلاد ہے اور یہ مرغابی کا سالن ہے۔" کھانا ابھی تک گرم تھا اور اس کی خوشبو بہت اشتہا انگیز تھی۔

اسے یاد تھا، شروع شروع میں وہ اور ڈی جے ترک کھانے سے کتنی متنفر ہو گئی تھیں، مگر چند ہی روز بعد ان کو ترک کھانے سے اچھا کھانا کوئی نہیں لگتا تھا۔

یوں سنسان جنگل میں درختوں کے بیچ زمین پہ بیٹھے ٹھنڈی سی دوپہر میں وہ اس کا پہلا کھانا تھا۔ استنبول کی چہل پہل اور ہنگامہ خیز زندگی سے دور ایک تنہا جزیرے پہ، جہاں وہ خود کو فطرت سے زیادہ قریب محسوس کر رہی تھی۔

کھانا کھا کر، چیزیں سمیٹ کر وہ لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے گٹھے سروں پہ اٹھائے ڈھلان سے اتر کر واپس بگھی تک آ گئیں۔ عائشے نے ساری لکڑیاں اور اوزار صندوق میں رکھے اور پھر وہ بگھی کو وہیں چھوڑ کر دوسری سمت چل دیں۔ اس نے نہیں پوچھا تھا کہ اب وہ کدھر جا رہے ہیں۔ وہ خود کو ان دو بہنوں کے رحم و کرم پہ چھوڑ چکی تھی۔ پھر بھی عائشے خود سے ہی بتانے لگی۔

"اب ہم ساحل کی طرف جا رہے ہیں۔"

"مگر فائدہ کوئی نہیں ہے۔" اس کے ساتھ چلتی بہارے نے ذرا خفگی سے سرگوشی کی۔ وہ جو دونوں پہلوؤں سے میکسی ذرا سی اٹھا کر چل رہی تھی، ذرا چونکی۔

"وہ کیوں؟"

"ہم سمندر پہ سیپ چننے جا رہے ہیں، مگر کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میرے کسی سیپ سے موتی نہیں نکلتا اور عائشے کے ہر سیپ سے موتی نکلتا ہے۔"

"اچھا؟ وہ کیوں؟"

"عبدالرحمٰن کہتا ہے، عائشے کے سیپ سے موتی اس لیے نکلتے ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ سچ بولتی ہے۔"

"نہیں، یہ کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ بہارے کے سیپ سے موتی اس لیے نہیں نکلتے کیونکہ بہارے ہمیشہ اللہ سے برا گمان رکھتی ہے۔ جس دن بہارے اچھا گمان رکھے گی، اس دن موتی نکل آئیں گے اور ایک دفعہ تو موتی نکلا بھی تھا۔" آگے چلتی عائشے نے گردن موڑے بغیر کہا۔ اس کی آخری بات پہ حیا نے سوالیہ نگاہوں سے بہارے کو دیکھا، تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"ہاں۔ بس ایک ہی دفعہ موتی نکلا تھا، سفید موتی اور وہ بہت خوب صورت تھا۔ میں نے وہ عبدالرحمٰن کو گفٹ کر دیا۔"

"وہ اس کا کیا کرے گا؟ تم اپنے پاس رکھتیں نا!"

جواباً بہارے نے ملال بھری "تم نہیں سمجھ سکتیں۔" والی نظروں سے اسے دیکھا اور سر جھٹکا۔

ساحل کا یہ حصہ قدرے سنسان پڑا تھا۔ نیلے سمندر کی لہریں اُڈ اُڈ کر پتھروں سے سر پٹختیں اور واپس لوٹ جاتیں۔ ساحل کی ریت گیلی تھی اور اس پہ قطار میں بہت سے پتھر پڑے تھے۔ کراچی کا ساحل ریت والا ہوتا تھا، مگر یہ ساحل پتھروں والا تھا۔

وہ چیزیں محفوظ جگہ پہ رکھ کر، جوتے اتار کر ننگے پاؤں چلتی پانی میں آ کھڑی ہوئیں۔

"ادھر سمندر اکثر سیپ ڈال دیتا ہے، مگر روز نہیں۔" عائشے پاؤں پاؤں بھر پانی میں چلتی کہہ رہی تھی۔

لہریں اُڈ اُڈ کر تیں، اس سے ٹکراتیں اور اسے گھٹنوں تک بھگو کر واپس چلی جاتیں۔ وہ تینوں ایک

دوسرے سے فاصلے پہ کھڑی اپنی اپنی ٹوکریاں اٹھائے سیپ ڈھونڈ رہی تھیں۔

پانی یخ بستہ تھا' اور ہوا سرد تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو عائشے اور بہارے ریت سے سیپ اٹھا اٹھا کر اپنی ٹوکریوں میں بھر رہی تھیں۔ مگر اسے اپنے پاس کوئی سیپ نظر نہیں آیا۔ وہ متلاشی نگاہوں سے پانی کی تہہ تلے جھلکتی ریت کو دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔ تب ہی ایک تیز لہر آئی تو وہ لڑکھڑا کر پھسلی اور کمر کے بل ریت پہ جاگری۔ صد شکر کہ پتھروں کا ساحل چند قدم دور تھا۔ لہر واپس پلٹ گئی۔ وہ ریت پہ گری پڑی تھی۔ مکمل طور پہ بھیگی ہوئی۔ اس کی چوٹی بھیگ گئی تھی پیروں کے انگوٹھوں میں گیلی ریت پھنس گئی تھی۔ ریت کے ذرے سفید لباس پہ جابجا لگے تھے۔ وہ درد سے دکھتی کمر کو سہلاتی بمشکل اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ عائشے اور بہارے نے اسے گرتے دیکھا نہ اٹھتے۔ اس نے بھی واویلا نہ کیا۔ پانی کا درد' آگ کے درد سے کم ہی ہوتا ہے۔ وہ برداشت کر گئی۔

اسے گرانے والی لہر اس کے قدموں میں ایک سیپ ڈال گئی تھی۔ اس نے جھک کر سیپ اٹھا لی۔ وہ ایک شامی کباب کے سائز جتنا تھا اور اس کا خول سفید' سرمئی اور گلابی رنگوں سے بنا تھا۔

"اوہ تم تو بھیگ گئیں' ٹھہرو' یہ شال لے لو۔"

پتھروں کے پار چٹائی پہ بیٹھتے ہوئے عائشے نے فکر مندی سے اسے دیکھا اور ایک شال ٹوکری سے نکال کر دی جو اس نے شانوں کے گرد لپیٹ لی۔

"چلو اب سیپ کھولتے ہیں۔" وہ تینوں تکون کی صورت بیٹھی تھیں۔ اپنی اپنی ٹوکریاں اپنے سامنے رکھے۔ عائشے نے بڑے سے چپٹے بلیڈ والا چھرا اٹھایا اور اپنی ایک سیپ نکال کر پھر اس کے خول کے دونوں حصوں کی درمیانی درز میں رکھ کر "بسم اللہ" پڑھتے ہوئے سیدھا سیدھا چھرا چلا دیا۔ چٹخنے کی ذرا سی آواز آئی۔ عائشے نے چھرا ایک طرف رکھا' اور دونوں ہاتھوں سے سیپ کے خول کو یوں کھولا جیسے کوئی کتاب کھولتے ہیں۔

اندر موجود سمندری جانور کا گودا خون آلود تھا۔ وہ مر چکا تھا' مگر اس کے اوپر ایک مٹر کے دانے جتنا سفید موتی جگمگا رہا تھا۔

عائشے نرمی سے مسکرائی اور پلکر (plucker) سے موتی اٹھا کر ایک مخملیں تھیلی میں ڈالا۔ وہ مسحور سی یہ سارا عمل دیکھ رہی تھی۔ بہارے البتہ آلتی پالتی مارے بیٹھی' ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے منہ بسورے عائشے کو دیکھ رہی تھی۔ عائشے نے ایک کے بعد ایک اپنے ساتوں سیپ کھولے۔ سب میں سے موتی نکلے۔ سات موتی اس کی مخملیں تھیلی میں جمع ہو چکے تھے۔

پھر اس نے چھرا بہارے کی طرف بڑھایا۔

"اب تم کھولو۔"

بہارے نے بے دلی سے چھرا پکڑا اور ایک ایک کر کے اپنے پانچوں سیپ کھولے۔ ان کے اندر سوائے خون آلود Mollusk کے' کچھ بھی نہ تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ سات تو نکل آئے ہیں' یہ بھی تمہارے ہیں۔" عائشے نے نرمی سے اس کا گال تھپتھپایا۔ وہ خفا خفا سی بیٹھی رہی۔

حیا نے چھرا پکڑا اور سیپ کے دونوں حصوں کی درز میں رکھا پھر دل مضبوط کر کے چھرا چلایا۔ لمحے بھر کو اسے یوں لگا جیسے اس نے کسی نرم سے گوشت کو کاٹ دیا ہو۔ بہارے اور عائشے منتظر سی اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے سیپ کے دونوں حصوں کو پکڑے رکھے' کسی کتاب کی طرح اسے کھولا۔

سمندری جانور کے خون آلود لوتھڑے کے سوا سیپ میں کچھ نہ تھا۔ وہ موتی سے خالی تھا۔

اس نے بہارے کی سی بے دلی سے سیپ ایک طرف ڈال دی۔

"تم دونوں نے پہلے سے سوچ لیا تھا کہ تمہارا موتی نہیں نکلے گا۔ کل سے تم اچھے گمان کے ساتھ سیپ چنوگی۔"

عائشہ نے بے بسی سے انہیں دیکھ کر کہا۔ وہ دونوں یونہی خفا خفا سی بیٹھی رہیں۔

☆ ☆ ☆

رات بیوک ادا پہ سیاہ چادر تان چکی تھی جس میں جھلملاتے سے تارے ٹکے تھے۔ اس کے کمرے کی کھڑکی کے جالی دار پردے ہٹے ہوئے تھے' اور ان سے مقیش کی وہ سیاہ چادر صاف دکھائی دے رہی تھی۔

وہ گردن تک کمبل ڈالے' پہلو کے بل لیٹی تھی۔ لمبے بال تکیے پہ بکھرے تھے۔ نگاہیں کھڑکی سے نظر آتے آسمان پہ جمی تھیں۔

صبح اس نے عائشے سے کہا تھا کہ اب وہ واپس جانا چاہتی ہے' مگر ان دونوں بہنوں کے چہرے پہ اتنی اداسی آگئی اور انہوں نے صرف چند دن کے لیے' جب تک اس کی خراشیں اور سارے زخم مندمل نہیں ہو جاتے اور نیل غائب نہیں ہو جاتے' اس سے رکنے کو کہا تو وہ رک گئی۔ اسے بیوک ادا اچھا لگا تھا یا پھر شاید اسے یہ خوف تھا کہ ابھی سبانجی ——— میں لوگ اس کے چہرے کے زخموں کے متعلق استفسار کریں گے۔ وہ اس پر فضا مقام پہ مکمل صحت مند ہو کر پہلے جیسا چہرہ لے کر واپس پلٹنا چاہتی تھی اور پھر بیوک ادا اسے کھینچتا بھی تھا۔ اس سفید محل میں کوئی مقناطیسی کشش تھی اور ان بہنوں کا خلوص تھا جو اسے باندھ رکھ رہا تھا۔

وہ گھر عائشے گل کا تھا' یہی وہ دل سے سارے بوجھ اتار دینے والا احساس تھا جس کے باعث وہ ادھر رک گئی تھی۔ سبانجی کا کیا تھا۔ ایکسچینج پروگرامز پڑھائی سے زیادہ بین الممالک ہم آہنگی کے لیے ہوتے تھے۔ سبانجی میں ایکسچینج اسٹوڈنٹس کے لیے حاضری مارک کرنے والا کوئی سسٹم نہ تھا۔ بھلے پانچ ماہ یونیورسٹی نہ آؤ' بس آخر میں ایگزام دینا لازمی تھا۔ تو اگر وہ چند دن وہاں رہ لے گی' تو اس سے کوئی کچھ نہیں پوچھے گا۔ ابھی واپس جانا' دوسروں کو اپنے بارے میں مشکوک کرنا ہو گا۔

ایک لمحے کے لیے اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ کہیں وہ اس گھر میں اس لیے تو نہیں رک گئی کہ اس کا تعلق عبدالرحمن پاشا سے ہے؟ مگر نہیں اس کے دل میں تو جہان سکندر کے علاوہ کسی کی گنجائش نہ تھی۔ ٹھیک ہے پاشا نے اس پہ بہت بڑا احسان کیا تھا اور وہ اس کی ممنون تھی مگر اس کے دل میں پاشا کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں پیدا ہوا تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اس نے ابھی تک موبائل نہیں لیا تھا۔ عائشے نے کہا تھا کہ کل تک ان کے ہوٹل کا ملازم موبائل اور سم پہنچا دے گا' بل سمیت۔ اس نے ابا سے کچھ پیسے عائشے کے اکاؤنٹ میں منگوا لیے تھے تا کہ وہ اپنے اخراجات خود اٹھا سکے۔ البتہ نہ اس نے اماں' ابا اور نہ ہی جہان کو بتایا تھا کہ وہ کدھر رہ رہی ہے۔ وہ پہلے ہی ان سے دور تھی' جہاں بھی رہے' کیا فرق پڑتا تھا اور پھر استنبول میں عبدالرحمن پاشا کی رہائش سے بڑھ کر محفوظ جگہ کوئی نہ تھی' اس کا اندازہ اسے ہو چکا تھا۔

مگر جہان...... جانے وہ کیسا ہو گا۔ اتنے دنوں سے اس سے بات بھی نہیں ہوئی۔ آخری دفعہ اسے تب دیکھا تھا جب وہ اسے تقسیم پہ چھوڑنے آیا تھا۔ تب بخار کے باعث اس کی آنکھیں اور ناک سرخ تھی۔

"پتا نہیں اس کا بخار ٹھیک ہوا یا نہیں۔" وہ اسے فون کرنے کا سوچ کر اٹھی اور باہر آ کر گول چکر زینہ اترنے لگی۔

آخری سیڑھی پہ اس کے قدم سست پڑ گئے۔ لونگ روم میں انگیٹھی دہک رہی تھی' اور اس کے سامنے عائشے گل صوفے پہ پاؤں اوپر کیے بیٹھی تھی۔ حیا کی جانب پشت کیے' وہ ہاتھوں میں قرآن پکڑے پڑھ رہی تھی' مدھر' دھیمی' خوب صورت آواز جو آیات کے ساتھ اوپر نیچے ہوتی تھی۔

"اور آگ والے جنت والوں کو پکار پکار کر کہیں گے کہ ڈالو ہم پر پانی میں سے یا اس میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشا ہے۔ وہ کہیں گے' بے شک اللہ نے ان دونوں کو حرام کر دیا ہے انکار کرنے والوں پر۔"

وہ وہیں ریلنگ پہ ہاتھ رکھے' ساکت سی کھڑی رہ گئی۔ ایک دم سے وقت پانچ روز پیچھے چلا گیا۔ وہ کرسی سے بندھی ہوئی اسی کمرے میں گری پڑی تھی جس میں بہت سی آگ تھی۔ الاؤ' انگیٹھی' ابلتا ویکس

دہکتی سلاخیں۔ اسے اپنی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ "پانی ڈالو مجھ پر..... پانی ڈالو مجھ پر....." وہ اگلے تین روز سوتی جاگتی کیفیت میں یہی چلاتی رہی تھی۔

عائشے اسی طرح پڑھ رہی تھی۔

"بے شک اللہ نے ان دونوں کو حرام کردیا ہے انکار کرنے والوں پر وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین کو شغل اور کھیل بنالیا تھا....."

وہ بے دم سی ہو کر وہیں آخری سیڑھی پہ بیٹھتی چلی گئی۔

"وہ لوگ کہ جنہوں نے اپنے دین کو شغل اور کھیل بنالیا تھا اور ان کی دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا....."

انگیٹھی میں جلتی مصنوعی لکڑیوں سے چنگاریاں اٹھ اٹھ کر فضا میں گم ہو رہی تھیں۔ وہ یک ٹک گم صم سی دہکتی لکڑیوں کو دیکھے گئی۔

"تو آج کے دن، ہم بھلا دیں گے ان کو جیسا کہ وہ اپنی اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے اور وہ ہماری نشانیوں کا انکار کیا کرتے تھے۔" (الاعراف 51-50)

دفعتاً عائشے نے کسی احساس کے تحت گردن موڑی۔ اسے یوں آخری زینے پہ بیٹھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں فکرمندی ابھری۔ اس نے قرآن بند کیا اور اٹھ کر احتیاط سے شیلف کے اوپری خانے میں رکھا، پھر اس کے ساتھ زینے پہ آبیٹھی۔

"ایسے کیوں بیٹھی ہو حیا؟" وہ نرمی سے پوچھ رہی تھی۔

حیا گم صم سی اس کا چہرہ دیکھے گئی۔ اسکارف میں لپٹا عائشے کا چہرہ نیم اندھیرے میں بھی دمک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اب سیاہ لگ رہی تھیں۔ یہ لڑکی اتنی پرسکون، اتنی نرم کیسے رہتی تھی ہر وقت؟ اس کے چہرے پہ کوئی دھول، کوئی دھند، کوئی مبہم پن کیوں نہیں ہوتا تھا؟ صاف، شفاف، اجلا چہرہ۔ معصومیت، کم عمری۔

"حیا!" اس نے دھیرے سے حیا کی بند مٹھی پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ حیا نے چہرہ ذرا سا پھیرا تھا اس سے روشنی نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اندھیرے کی بہت عادی ہو چکی تھیں۔

"یہ دنیا دھوکے میں کیسے ڈالتی ہے عائشے؟" وہ اب بالکل بھی اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ الاؤ کو دیکھ رہی تھی جس سے سرخ دانے اڑ اڑ کر فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔

"جب یہ اپنی چمکنے والی چیزوں میں اتنا گم کرلیتی ہے کہ اللہ بھول جاتا ہے۔"

"کیا مجھے بھی دنیا نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے؟"

"پہلی دفعہ دھوکا انسان بھولپن میں کھاتا ہے مگر بار بار کھائے تو وہ اس کا گناہ بن جاتا ہے۔ اور اگر احساس ہونے کے بعد نہ کھائے تو اسے ایک بری یاد سمجھ کر بھول جانا چاہیے اور زندگی نئے سرے سے شروع کرنا چاہیے۔"

"نئے سرے سے؟ ایسے یوٹرن لینا آسان ہوتا ہے کیا؟ انسان کا دل چاہتا ہے کہ وہ خوب صورت لگے، خوب صورت لباس پہنے، کیا یہ بری بات ہے؟" اس کی آواز میں بے بسی در آئی تھی، جیسے وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کیا غلط تھا کیا صحیح، سب گڈمڈ ہو رہا تھا۔

"نہیں! اللہ خوب صورت ہے اور خوب صورتی کو پسند کرتا ہے۔ یہ چیزیں زندگی کا حصہ ہونی چاہئیں۔ مگر ان کو آپ کی پوری زندگی نہیں بننا چاہیے۔ انسان کو ان چیزوں سے اوپر ہونا چاہیے۔ کچھ لوگ میری طرح ہوتے ہیں جن کی زندگی لکڑی کے کھلونے بنانے، مچھلی پکڑنے اور سچے موتی چننے تک محدود ہوتی ہے اور کچھ لوگ بڑے مقاصد لے کر جیتے ہیں۔ پھر وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر پریشان نہیں ہوتے۔"

حیا نے غیر ارادی طور پہ ایک نگاہ اپنے کندھے پہ ڈالی جہاں آستین کے نیچے Who لکھا تھا۔

"اور جن کی زندگی میں بڑا مقصد نہ ہو، وہ کیا کریں؟"

"وہی جو میں کرتی ہوں۔ عبادت! ہم عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، سو ہمیں اپنے ہر کام کو عبادت بنا لینا چاہیے۔ عبادت صرف روزہ، نوافل اور تسبیح کا نام

نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر انسان کا ٹیلنٹ بھی اس کی عبادت بن سکتا ہے میں بہارے کے لیے پھولوں کے ہار اور آنے کے لیے کھانا بناتی ہوں۔ میری یہ صلہ رحمی میری عبادت ہے۔ میں پزل باکسز اور موتیوں کے ہار بیچتی ہوں' میرا یہ رزق تلاشنا میری عبادت ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے کام کرتے کرتے انسان بڑے بڑے مقاصد پا لیتا ہے۔"

"اور انسان ان چیزوں کے لیے مضبوطی کہاں سے لائے؟"

"حیا! مجھے لگتا ہے ہم لڑکیوں نے اپنے اوپر Fragile (نازک) اسٹکرز لگا رکھے ہیں۔ فریجائل اسٹکر سمجھتی ہو نا؟ وہ جو نازک اشیاء کی پیکنگ کے اوپر چسپاں ہوتے ہیں کہ "ہینڈل ود کیئر!" وہی اسٹکرز ہم لڑکیاں اپنی پیشانی پہ لگائے رکھتی ہیں۔ پھر کسی کا ذرا سا طنز ہو یا بے جا رڑی ڈانٹ' ذرا سا کانٹا چبھ جائے یا دل ٹوٹ جائے' ہم گھنٹوں روتی ہیں۔ اللہ نے ہمیں اتنا نازک نہیں بنایا تھا' ہم نے خود کو بہت نازک بنا لیا ہے اور جب ہم لڑکیاں ان چیزوں سے اوپر اٹھ جائیں گی تو ہمیں زندگی میں بڑے مقصد نظر آجائیں گے۔" عائشے خاموش ہو گئی۔ اب لونگ روم میں صرف لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز آرہی تھی۔

"عائشے گل' تم بہت پیاری باتیں کرتی ہو۔" وہ تھکان سے ذرا سا مسکرا کر بولی تو عائشے دھیرے سے ہنس دی۔

"اور عائشے! میں کل سے تم دونوں کے کمرے میں سو جایا کروں؟ مجھے اوپر والے کمرے میں تنہائی محسوس ہوتی ہے۔" "ٹھیک ہے پھر ہم کل اپنے کمرے کی سیٹنگ بدل دیں گے۔ بڑا والا ڈبل بیڈ گیسٹ روم سے ادھر لے آئیں گے۔" عائشے اٹھتے ہوئے بولی۔ اس نے مسکرا کر دھیرے سے سر ہلا دیا۔ عائشے کی باتیں اس کے دل کو بہت الجھا دیا کرتی تھیں۔ وہ کبھی بھی زندگی میں ایسے تذبذب اور کشمکش و پیچ میں مبتلا نہیں رہی تھی جس سے اب گزر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز اسے موبائل تو ہوٹل گرینڈ (وہ ہوٹل جو بیوک ادا میں اے آر پاشا کا گڑھ سمجھا جاتا تھا) کے ایک ملازم نے سم سمیت لا دیا۔ مگر بیڈ وہ شفٹ نہ کر سکیں کہ وہ کھل نہیں رہا تھا۔ انہوں نے یہ کام ایک دن کے لیے ملتوی کر دیا۔ سو رات کو جب وہ سونے لیٹی تو اوپر اپنے کمرے میں اکیلی ہی تھی۔ آنکھیں بند کرتے ہی اس کے ذہن کے پردوں پہ وہی رات' دہکتی سلاخیں اور بھڑکتا الاؤ چھانے لگا تو وہ مضطرب سی اٹھ بیٹھی۔ وہ رات اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ اس کے مسئلے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ پہلے وہ سفید پھول اور پاشا کا تعاقب اور اب یہ یادیں۔ اگر وہ اس روز اکیلی مسز عبداللہ کے گھر سے نہ نکلی ہوتی اور اگر پانچ چھ ماہ قبل وہ اس چیریٹی لنچ پہ اس فائیو سٹار ہوٹل میں نہ گئی ہوتی تو یہ مسئلے پیش نہ آتے۔ اس نے بہت اضطراب سے سوچا تھا۔

یقیناً" پاشا اسی چیریٹی لنچ پہ مدعو ہو گا۔ اسے اس سفید محل میں جگہ جگہ پاشا اور آنے کی تصاویر آویزاں نظر آئی تھیں اور اب تک تو اسے عبدالرحمن پاشا کی شکل حفظ ہو چکی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے یاد کرنے کی سعی کی۔ کیا اس نے اس لنچ پہ پاشا کو دیکھا تھا؟

اسے فون نمبرز یاد نہیں رہتے تھے کیونکہ وہ انہیں یاد رکھنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ ہاں اس کے بچپن میں ہوتا تھا۔ وہ ڈائری پہ نمبرز لکھنے اور زبانی یاد کرنے کا رواج' مگر جب سے موبائل کلچر عام ہوا تھا' اس نے فون بک میں نمبرز محفوظ کر کے انہیں یاد کرنا چھوڑ دیا تھا۔ البتہ چہرے' مناظر' چھوٹی چھوٹی جزئیات' کپڑوں کے ڈیزائن پوری تفصیل کے ساتھ اسے یاد رہا کرتے تھے اور اسے نہیں یاد تھا کہ اس نے پاشا کو اس لنچ پہ دیکھا ہو۔ وہاں بہت سے لوگ تھے۔ وہ یقیناً" وہاں ہو گا مگر حیا کی نگاہ ہی اس پہ نہیں پڑی ہو گی ورنہ پاشا کی تصویر دیکھ کر اسے وہ چہرہ جانا پہچانا لگتا۔ اس لنچ پہ کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جو معمول سے ہٹ کر ہو' سوائے اس لڑکی کے جس کی ٹرے میں چار کپ تھے۔

اس نے قدرے اچنبھے سے آنکھیں کھولیں۔ اسے وہ لڑکی کیوں یاد آئی تھی؟ ہال میں نہیں' البتہ ہوٹل کی لابی سے ہو کر جب وہ ریسٹورنٹ سے گزر رہی تھی تب وہ اسے ملی تھی۔ حالانکہ حیا اسے نہیں جانتی تھی مگر اس نے کہا تھا کہ وہ اس سے یونیورسٹی میں مل چکی ہے۔ حیا کو ایسا کوئی واقعہ یاد نہ تھا' مگر وہ لڑکی مصر تھی کہ وہ مل چکی ہیں۔

اس نے آنکھیں موند کر دوبارہ وہ منظر یاد کرنے کی سعی کی۔ وہ زارا کے ساتھ چلتی ہوئی جا رہی تھی کہ سامنے سے ٹرے میں چار کپ لیے وہ دراز قد لڑکی چلتی ہوئی آئی' پھر اس کے تخیل میں مخل ہونے والی آواز فون کی تھی۔ اس نے کوفت سے آنکھیں کھولیں اور فون کو دیکھا' وہاں پاکستان کا نمبر لکھا آرہا تھا۔

ابھی تو یہ نمبر اس نے کسی کو نہیں دیا تھا' پھر....؟

"ہیلو؟" اس نے فون کان سے لگایا۔

"حیا.... میجر احمد ہیر!" وہی بھاری' خوب صورت' شائستہ آواز۔ اس نے گہری سانس لی۔ یہ لوگ اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے' وہ جتنا ان کو پرے دھتکارے' وہ اس کا سائے کی طرح تعاقب کرتے رہیں گے۔

"کہیے! کس لیے فون کیا ہے آپ نے؟" اس کی آواز میں خود بخود رکھائی در آئی۔ یہ پوچھنا بے سود تھا کہ میجر احمد کو اس کا نمبر کیسے ملا اور فون بند کرنا بھی بے سود تھا۔ وہ پھر فون کر لے گا۔ اور کرتا ہی رہے گا۔ اسے کسی اور طرح سے اب اسے ڈیل کرنا ہو گا۔

"کیا ہم کچھ دیر کے لیے بات کر سکتے ہیں؟" اس کی آواز بوجھل تھی۔ تکان سے بھری۔ غم سے لبریز۔ اداس' متفکر۔

حیا نے لمحے بھر کو سوچا' اس کا ذہن چند خیالات کو ترتیب دینے لگا تھا۔

"دیکھیں میجر احمد۔" اس نے سوچ سوچ کر کہنا شروع کیا۔ "اگر تو آپ کوئی ایسی بات کرنا چاہتے ہیں جو کسی شادی شدہ عورت سے کرنا غیر مناسب ہے' تو مت کیجیے۔ لیکن اگر آپ کوئی باہمی مفاد کی بات کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو سن رہی ہوں۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا' پھر اس کی آواز فون میں ابھری۔

"مجھے اس سب کا بہت افسوس ہے جو آپ کے ساتھ ہوا۔" وہ ایک دم بالکل ساکت ہو گئی۔ اس کے اغوا کی خبر پھیل چکی تھی۔

"تو کیا وہ سب راز نہیں رہا؟" ایک بوجھ سا اس کے دل پہ آن گرا تھا۔

"فکر نہ کریں' پاکستان میں کسی کو علم نہیں ہوا۔"

وہ اس کے لہجے پہ غور کرنے لگی۔ یہ کیا کوئی دھمکی تھی کہ وہ چاہے تو پاکستان میں سب کو علم ہو سکتا ہے؟ اس کے پاس یقیناً" اس کی ویڈیو تھی اور پاشا کے پاس اس کی بہت سی تصاویر۔ بلیک میلرز!

"میں نے آپ سے کہا تھا نا' اگر زندگی میں کوئی آپ کو جنت کے پتے لا کر دے تو انہیں تھام لیجیے گا۔ وہ آپ کو رسوا نہیں ہونے دیں گے۔" اس کی آواز میں دل کو چیرتا ہوا درد تھا۔

"اور میں نے بھی آپ سے کہا تھا کہ ہم دنیا والوں نے جنتیں کہاں دیکھی ہیں۔"

"آپ نے میری بات نہیں مانی۔ مجھے اس واقعہ نے جتنی تکلیف دی' شاید زندگی میں کسی اور شے نے اتنی تکلیف نہیں دی۔"

"میں اغوا ہوئی' ظلم میرے ساتھ ہوا' تو آپ مجھے کیوں قصوروار ٹھہرا رہے ہیں؟"

"وہ ہر کسی کو نہیں اغوا کرتے۔ خوب صورت لڑکیوں کو کرتے ہیں۔"

"میں خوب صورت ہوں تو اس میں میرا قصور ہے؟" وہ حیران نہیں ہو رہی تھی' وہ پوچھ رہی تھی۔

"انہیں یہ پتا چلا کہ آپ خوب صورت ہیں' اس میں آپ کا قصور ہے۔" وہ بھی طنز نہیں کر رہا تھا' بس مغموم انداز میں کہہ رہا تھا۔

"تو اب میں کیا کروں؟ اب ان سارے مسائل سے کیسے جان چھڑاؤں؟"

"کون سا مسئلہ ہے؟ مجھے بتائیں' آپ مجھے ہمیشہ اپنا خیر خواہ پائیں گی۔"

وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر کہنے لگی۔
"اگر کوئی آپ کو بلیک میل کرنے لگے، تو کیا کرنا چاہیے؟"
"بلیک میلر ایک بے نتھے بیل کی طرح ہوتا ہے حیا! اس سے بھاگیں گی تو وہ آپ کا تعاقب کرے گا اور تھکا تھکا کر مار دے گا۔ سو اس سے کمر کر کے بھاگنے کے بجائے اس کا سامنا کریں اور آگے بڑھ کر اس کو سینگوں سے پکڑ لیں۔ دنیا کا کوئی ایسا بلیک میلر نہیں ہے جس کی اپنی کوئی ایسی کمزوری نہ ہو جس پہ اسے بلیک میل نہ کیا جا سکے۔"
"آپ کی کمزوری کیا ہے؟"
"بہت سی ہیں۔ کمزوریاں پوچھی نہیں، تلاشی جاتی ہیں، لیکن میں بلیک میلر نہیں ہوں۔"
"اگر مجھے آپ کی کمزوری تلاشنی ہوتی تو پوچھتی نہیں۔" اس نے ذرا محظوظ سے انداز میں جتایا۔
"ویسے وہ پزل باکس مجھے کس نے بھیجا تھا؟" وہ جواباً خاموش رہا۔
"میجر احمد! میرا خیال ہے اب ہم یہ ڈمب گیم بند کر دیں اور یہ بات تسلیم کر لیں کہ آپ مجھ سے ایک خواجہ سرا بن کر ملتے رہے ہیں۔" اس نے پنکی کے بجائے خواجہ سرا کہنا مناسب سمجھا۔
"میں تسلیم کرتا ہوں۔"
"آپ پنکی تھے، مگر ڈولی کون تھا؟"
"اے آر پی کی ماں نے بتایا تو تھا آپ کو۔"
"کیا میں نے کبھی ڈولی کا اصلی چہرہ دیکھا ہے؟"
"نہیں، آپ اسے نہیں جانتیں۔"
"وہ باکس مجھے ڈولی نے بھیجا ہے، مگر اس کی پہیلی وہ کس نے لکھی تھی؟ کون لکھتا ہے یہ پہیلیاں؟ کیا آپ لکھتے ہیں؟" وہ خاموش رہا۔
"میجر صاحب! مجھے سچ سچ بتا دیں۔ ویسے میں جانتی ہوں کہ وہ آپ ہی لکھتے ہیں۔ آپ جیسے لوگ منظر عام پہ آنے کے بجائے پس منظر میں بیٹھ کر عقل کی ڈوریں ہلاتے رہتے ہیں۔"
"جی، وہ میں ہی لکھتا ہوں۔"
"وہ کریمی آئی" والی پہیلی بھی آپ نے لکھی تھی، بلکہ آپ سے لکھوائی گئی تھی؟"
"جی وہ میں نے ہی لکھی تھی۔ ویسے پزل باکس کھول لیا آپ نے؟" اس نے پہلی دفعہ میجر احمد کی آواز میں ایک سرسری سا تجسس محسوس کیا۔ کیا اس کی کمزوری اس کے ہاتھ میں آنے لگی تھی؟
"جی، کھول لیا اور مجھے وہ مل گیا جو ڈولی مجھ تک پہنچانا چاہتا تھا۔"
وہ بالوں کی لٹ انگلی پہ لپیٹتی بڑے اطمینان سے کہہ رہی تھی۔ اپنی بات کے اختتام پہ اس نے واضح طور پہ کرسی کے پہیوں کی آواز سنی جیسے ریوالونگ چیئر پہ ٹیک لگا کر بیٹھا میجر احمد کرنٹ کھا کر آگے کو ہوا تھا۔
"واقعی؟" اس کی آواز میں محتاط سی حیرت تھی۔
"جی! پہیلی آسان تھی۔ میں نے بوجھ لی۔ ویسے جو اس میں تھا، وہ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے اور اس نے مجھ پہ ایک بہت حیرت انگیز انکشاف کیا ہے۔"
"جو باکس میں تھا، وہ آپ کے ہاتھ میں ہے اور اس نے آپ پر ایک انکشاف کیا ہے؟" وہ رک رک کر اس کے الفاظ دہرا کر جیسے تصدیق چاہ رہا تھا۔
"جی بالکل!"
جواباً وہ دھیرے سے ہنس دیا۔
"نہیں! آپ سے ابھی تک وہ باکس نہیں کھلا، لیکن مجھے آپ کا یوں ذہن استعمال کر کے مجھے گھیر کر کچھ اگلوانے کی کوشش اچھی لگی۔"
حیا نے تلملا کر موبائل کو دیکھا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے؟
"اچھا مجھے نیند آ رہی ہے۔" وہ ذرا بے زاری سے بولی۔
"آپ بے شک سو جائیں مگر پلیز فون بند مت کیجیے گا۔" وہ جیسے التجا کر رہا تھا۔
"جب میں کچھ بولوں گی ہی نہیں تو آپ کیا سنیں گے؟"
"میں آپ کی خاموشی سنوں گا۔"

"میں سو رہی ہوں۔ بائے!" اس نے تکیے پہ سر رکھتے ہوئے "جان چھوڑو" والے انداز میں کہا، مگر پھر اس نے واقعی موبائل بند نہیں کیا۔ ایک ہاتھ سے فون کان پہ سے لگائے دوسرا بازو آنکھوں پہ رکھے، وہ کب سو گئی، اسے علم نہیں ہوا۔

صبح اٹھتے ہی اس نے موبائل چیک کیا تو میجر احمد کی کال کا دورانیہ تین گھنٹے اور بیس منٹ لکھا آ رہا تھا۔ وہ دم بخود رہ گئی۔ اس نے تو بمشکل دس منٹ میجر احمد سے بات کی تھی، تو کیا تین گھنٹے وہ اس کی خاموشی سنتا رہا تھا؟ عجیب آدمی تھا یہ بھی!

✡ ✡ ✡

پھر جس روز اس نے عائشے کے ساتھ ان دونوں بہنوں کے کمرے کی سیٹنگ تبدیل کرنے کا پروگرام بنایا، اس صبح اس نے جہان کو اپنا نمبر میسج کر دیا، بغیر کسی بات کے۔

جب وہ عائشے کے ہمراہ بڑا بیڈ اندر رکھ کر اور چھوٹا بیڈ باہر نکال کر، شاور لینے کے بعد تولیے سے بال تھپتھپا کر سکھاتی باہر آئی تو بیڈ پہ رکھا اس کا موبائل بج رہا تھا۔

"جہان کالنگ۔"

اماں سے جب اس نے جہان کا نمبر لیا تھا تو صرف موبائل میں محفوظ ہی نہیں کیا بلکہ زبانی یاد بھی کر لیا۔ اگر کبھی دوبارہ......

"السلام علیکم!" اس نے ایک دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ فون کان سے لگایا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ تولیہ نرمی سے گیلے بالوں میں رگڑ رہی تھی۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو؟" وہ بھی دوسری طرف جیسے بہت اچھے موڈ میں تھا۔

"بہت اچھی اور تم؟"

"جیسا پہلے تھا۔ اور تم فون ٹھیک کرا لیا۔؟ ممی کہہ رہی تھیں، تمہارا فون خراب ہو گیا تھا۔"

"ہاں، بہت کچھ خراب ہو گیا تھا۔ ویسے ابھی ایک دو روز پہلے نیا فون لیا ہے۔" وہ تولیہ کرسی کی پشت پہ ڈالتے ہوئے بولی۔

"پھر تو بہت جلدی نمبر دے دیا تم نے۔"

"مجھے توقع نہیں تھی کہ کسی کو مجھ سے بات کرنے کی جلدی ہو گی، اسی لیے۔"

"اچھا! اپنے یہ طنز چھوڑو، مجھے بتاؤ، تم ڈورم میں ہو؟ میں ذرا مضافات میں آیا ہوا تھا، تمہارے کیمپس سے دس منٹ کی ڈرائیو پہ ہوں۔ چلو پھر ساتھ لنچ کرتے ہیں۔"

اسی پل عائشے کچھ لینے کمرے میں داخل ہوئی، تو اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر رک گئی۔ وہ متذبذب سی فون پہ کہہ رہی تھی۔

"نہیں، میں.... ابھی کیمپس تو....."

عائشے نے لمحے بھر کو غور سے اسے دیکھا پھر جیسے سمجھ کر سر ہلاتی آگے آئی اور رائٹنگ ٹیبل پہ رکھے مگ میں سے پین نکالا۔ نوٹ پیڈ کے اوپری صفحے پہ کچھ لکھ کر اس نے پیڈ اسے تھمایا۔ پھر خود باہر چلی گئی۔ حیا نے رک کر صفحے پہ لکھے الفاظ پڑھے۔

"سچ سے بہتر جواب کوئی نہیں ہوتا۔"

"حیا؟" دوسری جانب وہ پوچھ رہا تھا۔

"جہان! میں بیوک ادا میں ہوں۔" وہ پیڈ پکڑے، اس پہ لکھی تحریر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"اوہ، فرینڈز ٹرپ تھا کوئی؟ مجھے پہلے بتا دیتیں تو....."

"میں ادھر کچھ دن سے رہ رہی ہوں۔ میری فرینڈ کا گھر ہے ادھر۔ اور پھر تمہیں کیا بتاتی، تم تو ہمیشہ مصروف ہوتے ہو۔" اس نے حملے کا رخ بدلا تو وہ دفاعی پوزیشن میں آ گیا۔

"اتنا مصروف کہاں ہوتا ہوں؟"

"پھر کل ملتے ہیں۔ تم کل بیوک ادا آ جاؤ کیونکہ میں تو چند دن اپنی فرینڈز کے ساتھ ادھر ہی رہوں گی۔"

"کل میں مصروف ہوں۔"

"اچھا پرسوں؟"

"میں اگلا سارا ہفتہ مصروف ہوں۔ تم اپنی فرینڈز کے ساتھ انجوائے کرو، میں کام کرتا ہوں۔ اللہ حافظ۔" اس نے ٹھک سے فون رکھ دیا تھا۔

"جہان!" اس نے جھنجلا کر موبائل کان سے ہٹایا۔ اس شخص کا کوئی پتا نہیں چلتا تھا کہ اسے کب کیا برا لگ جائے۔

باہر سے بہارے پھر سے آوازیں دینے لگی تھی۔

"حیا... یہ کریمی آئی کیا ہے؟ کوئی ہنٹ دے دو۔"

"جو بوجھے گا، گفٹ اسی کا ہو گا۔" اس نے جواباً زور سے آواز دی۔ بہارے "فوراً" خاموش ہو گئی۔ عبدالرحمٰن کا تحفہ کسی دوسرے سے شیئر کرنے کا تصور بھی اس کے لیے سوہان روح تھا۔

✡ ✡ ✡

اس صبح وہ ابھی گہری نیند میں تھی جب موبائل اچانک بجنے لگا۔ چمکتی اسکرین پہ جہان کا نام جل بجھ رہا تھا۔ اس نے خمار آلود سا ہیلو کہتے ہوئے فون کان سے لگایا۔

"میں فیری سے بیوک ادا آ رہا ہوں، تم پورٹ پہ پہنچ جاؤ۔"

"کیا؟" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ "تم آ رہے ہو؟" اس کے لہجے میں سارے زمانے کی خوشی در آئی تھی۔

"ہاں، میں نے سوچا، بندے کو اتنا مصروف بھی نہیں ہونا چاہیے۔" وہ ہنس کر بولا۔

وہ لحاف پھینک کر باہر کو بھاگی۔ عائشے کچن میں کام کرتی نظر آ رہی تھی۔ بہارے کرسی پہ بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔

"آج تم جنگل نہیں جاؤ گی، بس میں نے کہہ دیا، حلیمہ آنٹی نے کہا ہے کہ تمہیں پورا سبق دوبارہ یاد کرنے کی ضرورت ہے۔"

"مگر عائشے...." بہارے نے منہ بسور کر پلیٹ پرے ہٹائی۔

"عائشے! مجھے پورٹ جانا ہے۔" وہ بھاگتی ہوئی چوکھٹ میں آن رکی۔ "میرا کزن آ رہا ہے۔ استنبول سے۔"

"ٹھیک ہے، پھر ہم پہلے پورٹ چلے جائیں گے۔"

"ٹھیک!" وہ اپنی خوشی چھپاتی تیار ہونے واپس بھاگ گئی۔

دو روز قبل حلیمہ آنٹی نے عائشے کے ہاتھ اس کے لیے ایک میرون رنگ کا شیشوں کے کام والا کرتا بھیجا تھا۔ اس نے نیلی جینز پہ وہی گھٹنوں تک آتا کرتا پہن لیا اور گیلے بال کھلے چھوڑ دیے۔ کندھوں پہ اس نے عائشے کا میرون پونچو پہن لیا تھا۔

بہارے کو حلیمہ آنٹی کے پاس چھوڑ کر وہ دونوں فیری پورٹ پر آ گئیں، فیری ابھی پانچ منٹ قبل پہنچا تھا۔ ٹورسٹس کا ایک بحر بیکراں اس سے اتر رہا تھا۔ وہ آنکھوں پہ ہاتھ کا سایہ کیے، فیری سے اترتے لوگوں کو متلاشی نگاہوں سے دیکھنے لگی تب ہی اسے جہان نظر آ گیا۔

وہ نیلی جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سامنے سے چلتا ہوا آ رہا تھا اس نے بھی اوپر میرون سوئٹر پہن رکھا تھا جہان کو اپنے قریب دیکھ کر وہ بے اختیار مسکرا دی۔

"جہان! اوور ہیئر!" اس نے ہاتھ اونچا کر کے ہلایا۔ جہان نے دیکھ لیا تھا، تب ہی دھیما سا مسکراتا ان کی طرف آ گیا۔

"واؤ، تم تو ٹائم پہ پہنچ گئیں۔"

"تھینکس۔ یہ میری فرینڈ ہے، عائشے گل۔ میں اسی کے ساتھ رہ رہی ہوں اور عائشے! یہ میرا کزن ہے، جہان سکندر۔"

"السلام علیکم!" عائشے نے اپنے نرم، ازلی خوش اخلاق انداز میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" اس نے مسکراتے ہوئے سر کو جنبش دی۔ "تو تم ان کی بن بلائی مہمان بنی ہوئی ہو؟"

"ارے نہیں، بن بلائی کیوں؟ ہم نے تو خود حیا کو بصد اصرار چند دن ادھر رکنے کا کہا تھا۔" عائشے ذرا جھینپ گئی۔

پھر تھوڑی دیر ہی وہ رک پائی کہ اسے جنگل جانا تھا۔ وہ چلی گئی تو وہ دونوں بندرگاہ سے ہٹ کر سڑک کی طرف آ گئے۔ میرون اور نیلے رنگ میں ملبوس، وہ سڑک کے کنارے چلتے بالکل ایک سے لگ رہے

تھے۔

"تمہارا فون اتنی افراتفری میں آیا کہ میں ناشتہ بھی نہیں کر سکی۔" مین بازار میں ریسٹورنٹس کے کھلے فرنٹس سے اشتہا انگیز سی خوشبو باہر آ رہی تھی۔

"پھر جاؤ' اور میرے لیے بھی ناشتہ لے آؤ۔ مگر پے میں کروں گا۔" اس نے والٹ نکال کر چند نوٹ نکالے۔

"ترک رسم و رواج کے مطابق ادائیگی ہمیشہ میزبان کرتا ہے اور ادھر میزبان میں ہوں جہان!"

"چھوڑو ترک رسوم کو۔ ہم پاکستانی ہیں۔"

"شکر۔ تمہیں یاد تو رہا۔" اس نے نوٹ پکڑے اور ریسٹورنٹس کی قطار کی سمت چلی گئی۔

وہاں سڑک کے ایک طرف ریسٹورنٹس تھے' تو دوسری طرف قطار میں بنچ اور میزیں ایسے لگی تھیں جیسے کسی چرچ میں لگی ہوتی ہیں۔ درمیان میں کھلی' سرمئی سڑک تھی جو گزشتہ رات کی بارش سے ابھی تک نم تھی۔

جہان ایک بنچ پہ بیٹھ گیا اور کہنیاں میز پہ رکھ کر دونوں مٹھیاں باہم ملا کر ہونٹوں پہ رکھے اسے دیکھنے لگا جو سڑک کے پار ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ چند ثانیے بعد جب وہ پلٹی تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں کافی کے کپ اور سینڈوچز رکھے تھے۔ اس نے سڑک پار کی اور ٹرے میز پہ جہان کے سامنے رکھی۔

"شکریہ۔" اس نے مسکرا کر کہتے ہوئے ایک کپ اٹھا لیا۔

"اور اب تم واپس استنبول آجاؤ۔ بہت رہ لیا ادھر۔"

"کیوں؟" کافی کا کپ لبوں تک لے جاتے ہوئے وہ بے ساختہ رکی تھی۔

"ممی تمہیں یاد کر رہی تھیں۔"

"صرف ممی؟" اس نے آزردگی سے سوچا' پھر سر جھٹک کر پھیکا سا مسکرائی۔

"تو پھر جہان سکندر ایک گھنٹے کی مسافت طے کر کے مجھ سے ملنے آنے کا احسان کتنے دن تک جتائیں گے۔"

"قریباً....." جہان مسکرا کر کچھ کہتے کہتے رکا' اس کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔

"تمہاری آنکھ پہ کیا ہوا ہے؟" اس کی نگاہیں حیا کے چہرے پر سے پھسلتی گردن پہ جا ٹکیں۔ "اور ہونٹ' اور گردن پہ؟ تمہیں چوٹ لگی ہے؟"

"ہاں' بہت گہری چوٹ لگ گئی تھی۔"

"کیسے؟" وہ ذرا تفکر سے کہتا آگے کو ہوا اور کپ میز پہ رکھا۔

"میں گر گئی تھی۔ بہت بری طرح سے گر گئی تھی۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بھی کہیں دور چلی گئی تھی۔

"اوہ۔ اب ٹھیک ہو؟"

حیا نے جواباً" اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور یہ تم نے اپنی عمر سے اتنی چھوٹی لڑکی سے دوستی کرنا کب سے شروع کر دی؟"

"جب سے اپنی عمر والی ساتھ چھوڑ گئی۔"

ایک بوجھل سی خاموشی دونوں کے درمیان حائل ہو گئی۔ ایک نہ ختم ہونے والے کرب نے سڑک کنارے لگے بنچز کی قطار کو گھیرے میں لے لیا۔ قریب میں ایک بچہ تین گیندیں جو موٹے موٹے زرد لیموؤں سے مشابہہ تھیں یوں اچھالتے ہوئے چلا آ رہا تھا کہ کوئی گیند گرنے نہ پاتی تھی۔

"خیر۔ یہ دو بہنیں عمر میں اتنی چھوٹی نہیں ہیں۔ بس چہرے سے لگتی ہیں۔ عائشے بیس سال کی ہے اور چھوٹی بہارے نو سال کی۔ انہوں نے میری مدد کی تھی' یوں ہماری دوستی ہو گئی۔"

"کیسی مدد؟"

"میرے بالوں پہ کچھ گر گیا تھا' حادثاتی طور پہ' وہ عائشے نے اتار دیا۔ مگر تم فکر نہ کرو' اب سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا ہے۔"

"مگر کچھ تو بدلا ہے' حیا!" وہ کافی کے گھونٹ لیتا ذرا الجھن سے اس کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں' کچھ تو بدلا ہے۔" وہ اثبات میں سر ہلا کر گیندوں کا کرتب دکھاتے لڑکے کو دیکھنے لگی۔

ایک ڈولی تھا جو کسی نگران فرشتے کی طرح اس کا پہرہ دیا کرتا تھا' ایک میجر احمد تھا جو اس کی خاموشی سننے کے لیے تین گھنٹے تک فون کان سے لگائے رکھتا تھا' ایک عبدالرحمن تھا جو دوسرے ملک میں ہونے کے باوجود اس کی مدد کے لیے آتا تھا اور ایک جہان سکندر تھا جو اس کی ایک وضاحت پہ مطمئن ہو جاتا تھا۔ جو اس کے چہرے کے زخم تو دیکھ سکتا تھا مگر ان کے پیچھے اس کی جلی ہوئی روح اسے نظر نہیں آتی تھی۔ جو نظر آتا ہے' وہ تو سب دیکھ لیتے ہیں۔ جو نہیں نظر آتا وہ کوئی کوئی ہی دیکھ سکتا ہے اور جہان ایسے لوگوں میں شامل نہیں تھا۔

دفعتاً" میسیج ٹون بجی تو جہان نے موبائل جیب سے نکالا اور دیکھا۔

"ممی کو بتا کر نہیں آیا تھا' اب ان کی تفتیش شروع ہو گئی ہے۔" وہ پیغام کا جواب ٹائپ کرتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگا۔

"تم جتنی ان کی مانتے ہو' میں جانتی ہوں۔"

"وہ مجھ سے کچھ منواتی نہیں ہیں' ورنہ شاید میں ان کی واقعی مانتا۔" اس نے پیغام بھیج کر سیل فون وہیں میز پر ڈال دیا۔ حیا نے ایک نظر اس کے فون کو دیکھا۔

"تو وہ سم ون اسپیشل کون تھا جس نے تمہیں یہ فون گفٹ کیا تھا؟" جہان نے موبائل اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ تم رکھ لو' میں اور لے لوں گا۔ اتنے سوال پوچھتی ہو نا تم میرے فون کے بارے میں۔" حیا نے فون اس کے ہاتھ سے لے کر واپس میز پہ رکھا۔

"بات کو ٹالو مت۔ میرے سوال کا جواب دو۔"

"نہیں' تم فکر نہ کرو' کسی لڑکی نے نہیں دیا تھا۔ یہ میرا آفیشل فون تھا' میری جاب کا فون۔ میرے باس نے دیا تھا۔"

"تمہارا باس؟" اس کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔ "مگر تم تو اپنا کام کرتے ہو نا؟"

"ہمیشہ سے تو اپنا کام نہیں کرتا تھا۔ یہ ریسٹورنٹ تو ڈیڑھ دو سال پہلے کھولا تھا' اس سے پہلے تو بہت سی جابز کی ہیں۔" وہ زرد گیندیں اچھالتے بچے کو دیکھ کر دھیما سا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں کوئی ایسا نرم سا تاثر تھا جو حیا نے صرف ایک دفعہ پہلے دیکھا تھا۔ جیسے وہ کچھ یاد کر رہا تھا۔ کوئی گم گشتہ قصہ۔

"ایک بات کہوں جہان؟ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں اپنی جاب اور اپنا باس بہت پسند تھا۔" وہ بغور اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے بولی تو جہان نے بری طرح سے چونک کر اسے دیکھا۔

"تمہیں ایسا کیوں لگا؟"

"کیونکہ ابھی اپنے باس اور جاب کا ذکر کرتے ہوئے تمہاری آنکھوں میں جو چمک اور جو محبت در آئی ہے نا' یہ میں نے پہلے تب دیکھی تھی جب تم ہمارے کچن میں مجھے اس اسپیشل گفٹ کے بارے میں بتا رہے تھے اور اب بھی یہ سب کہتے ہوئے تمہارا چہرہ ایک دم سے اتنا glow کرنے لگ گیا کہ مجھے لگا اس ذکر سے وابستہ کوئی بہت خاص یاد تمہارے ذہن میں چل رہی ہے۔"

"تم تو چہرے پڑھنے لگ گئی ہو۔" وہ جیسے سنبھل کر مسکرایا۔

"بتاؤ نا' تمہیں اپنی پچھلی جاب بہت پسند تھی؟"

"ہاں' بہت زیادہ۔ بڑے عیش تھے تب' اپنی راجدھانی' اپنی جگہ کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔" وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو ہموار رکھے — دوبارہ "کہیں" پیچھے نہ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تو وہ جاب کیوں چھوڑ دی؟"

"بعض دفعہ انسان کو بہت کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ اپنی سلطنت سے خود کو خود ہی جلاوطن کرنا پڑتا ہے۔ ان شہزادوں کے جزیروں کو ترکی میں "ادالار" Adalar کہتے ہیں کیونکہ یہاں ان شہزادوں کو جلاوطن کر کے بھیجا جاتا تھا جو سلاطین کو اپنے تخت کے لیے خطرہ لگتے تھے۔" وہ بات کو کہیں اور لے گیا تھا۔

"میں سوچتی ہوں جہان! وہ جلاوطن شہزادے اپنے پرانے شاہانہ دور کو کتنا یاد کرتے ہوں گے۔"

"اور جو خود کو خود ہی جلاوطن کرتے ہیں' ان کی یاد میں تکلیف بھی در آتی ہوگی۔" پھر اس نے دھیرے سے سر جھٹکا۔ "آؤ سمندر پہ چلتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد وہ دونوں ساحل سمندر پہ پتھروں کی قطار پہ چل رہے تھے۔ ہوا سے حیا کے بال اڑ اڑ کر جہان کے کندھے سے ٹکرا رہے تھے مگر وہ انہیں نہیں سمیٹ رہی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے قدم اٹھا رہا تھا۔

"تمہارا ریسٹورنٹ کیسا جا رہا ہے؟"

"رینوویشن کروا رہا ہوں اور میری لینڈ لیڈی بھی کوئی لائیر (وکیل) کر رہی ہے میرے خلاف۔ میری یہ سمجھ نہیں میں آتا کہ اس کے پاس ایک دم سے خود کا اتنا پیسہ کہاں سے آگیا کہ وہ اتنا مہنگا لائیر کر سکے۔"

حیا کا دل آزردگی کے سمندر میں ڈوب کر ابھرا۔ وہ جانتی تھی کہ اچانک سے اس کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آیا تھا۔ وہ سب اس کی غلطی تھی۔

"تو تم اب کیا کرو گے؟"

"آج کل بس چھپا ہوا ہوں' اسی لیے ریسٹورنٹ سے بھاگ کر ادھر آگیا ہوں۔ ذرا لو پروفائل رکھی ہوئی ہے۔" وہ دھیرے سے ہنس کر بولا۔

"تم اس سے اتنا ڈرتے ہو؟"

"ڈرتا تو میں فرقان ماموں اور صائمہ مامی کے سوا کسی سے نہیں ہوں۔" سمندر کی ایک تیز لہر آئی اور ان کے قدموں کو بھگو کر واپس پلٹ گئی۔

"وہ فرقان ماموں کی بیٹی کی منگنی ہو رہی ہے۔" اسے اچانک یاد آیا۔ حیا حیرت سے رک کر اسے دیکھنے لگی۔

"ارم کی؟ کب؟ کس سے؟"

"کل رات مامی کا فون آیا تھا ممی کو۔ انہوں نے ہی بتایا تھا۔ فنکشن تو معلوم نہیں کب ہے' البتہ رشتہ طے ہو گیا ہے۔"

"مگر کس سے؟"

"فرقان ماموں کے کسی دوست کی فیملی ہے۔ زیادہ تفصیل مجھے نہیں معلوم!" وہ شانے اچکا کر بولا۔ وہ دونوں پھر سے چلنے لگے تھے۔

(ارم نہیں مانی ہوگی' تایا نے زبردستی کی ہوگی) وہ یہی سوچ رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے جہان! اماں' ابا اور تایا' تائی کی بڑی خواہش تھی کہ ارم کا رشتہ روحیل سے ہو۔ اب پتا نہیں تایا' تائی نے کہیں اور کیوں کر دیا رشتہ۔"

"مگر روحیل تو...." وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم رکا۔ زندگی میں پہلی دفعہ اسے لگا کہ جہان کے لبوں سے کوئی بات غیر ارادی طور پہ پھسلی تھی۔

"مگر روحیل کیا؟" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"روحیل کی تو ابھی کافی اسٹڈیز رہتی ہیں۔" وہ بات بدل گیا تھا' وہ شرطیہ کہہ سکتی تھی۔

"روحیل کی پڑھائی ختم ہو چکی ہے' جب میں پاکستان واپس جاؤں گی' وہ تب آنے والا ہی ہوگا۔"

جواباً جہان نے ایک گہری پرکھتی نظر اس پر ڈالی۔

"تمہارا روحیل سے رابطہ ہے جہان؟ پھپھو نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ تم لوگ ان ٹچ ہو۔" اس نے اپنی پرانی الجھن کو الفاظ پہنا دیے۔

"ہاں کبھی کبھی بات ہو جاتی ہے۔ میں اس سے ملا تھا امریکہ میں۔"

"اچھا؟ کب؟ اس نے تو نہیں بتایا۔" وہ خوشگوار حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"پرانی بات ہے۔ تین سال تو ہو ہی گئے ہیں۔" وہ شانے اچکا کر بولا۔ اسے بہت حیرت ہوئی تھی۔

ایک تو پتہ نہیں اس کے گھر والوں کو ہر بات اپنے تک محدود رکھنے کا شوق کیوں تھا۔ ابھی پاکستان میں اس نے اماں سے سکندر انکل کے کیس کا پوچھا تو اسے معلوم ہوا کہ اماں ابا کو سب پتا تھا اور اب' روحیل جہان سے مل بھی چکا تھا مگر اس نے کبھی نہیں بتایا۔ آج تو وہ روحیل سے ضرور پوچھے گی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا۔

لہریں اسی طرح اڈ اڈ کر ان کے پیر چھو رہی تھیں۔

"جہان! تم نے کبھی سیپ چنے ہیں؟"

"یہاں سیپ ہوتے ہیں؟" وہ ذرا حیران ہوا۔

"ہاں، تمہیں نہیں پتا؟ آؤ سیپ چنتے ہیں۔ ان سے موتی نکلیں گے؟"

"واقعی؟"

"اب دیکھتے ہیں کہ تمہارا موتی نکلتا ہے یا نہیں۔" وہ چیلنجنگ انداز میں مسکراتی آگے بڑھ گئی۔

ان دونوں کو ایک ایک سیپ ہی ملی۔ حیا نے دور بیٹھے ٹورسٹس کی ایک ٹولی سے ایک بڑا چھرا لیا جو وہ فروٹ کاٹنے کے لیے لائے تھے اور جہان کے پاس واپس پتھروں پہ آبیٹھی۔

پہلے اس نے اپنی سیپ کھولی۔ وہ خالی تھی۔ مولسک پہ خون کے قطرے لگے تھے اس نے مایوسی سے چھرا جہان کی طرف بڑھا دیا۔

جہان نے بلیڈ سیپ کے خول کے درز میں رکھ کر احتیاط سے اسے کاٹا اور کتاب کی مانند اسے کھول لیا۔ حیا نے گردن آگے کر کے دیکھا۔

مولسک کے خون آلود لوتھڑے کے عین اوپر قطار میں مٹر کے دانوں جتنے تین سفید موتی جگمگا رہے تھے۔

وہ متحیر سی ان چمکتے موتیوں کو دیکھ رہی تھی۔ جہان نے چھری کی نوک سے موتی اکھاڑے، ان کو پانی سے دھویا اور جیب سے ایک ٹشو نکال کر ان میں لپیٹا۔

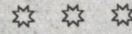
"یہ تمہارے ہوئے۔" اس نے ٹشو حیا کی طرف بڑھایا۔

اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔

"تم اتنے قیمتی موتی کسی دوسرے کو کیسے دے سکتے ہو؟" وہ ابھی تک اسی لمحے کے زیر اثر تھی۔

"یہ لڑکیوں کے شوق ہوتے ہیں۔ میں ان کا کیا کروں گا۔" وہ لاپروائی سے بولا تھا۔

"تمہیں نہیں معلوم کہ اگر یہ بہارے گل کے نکلتے تو اس کے لیے کتنی قیمتی ہوتے۔ اس کی زندگی کا واحد "مسئلہ" موتی ہیں جو اس کی سیپ سے کبھی نہیں نکلتے۔" اس نے بے دلی سے ٹشو تھام لیا۔ اسے اپنے نکلے موتیوں سے زیادہ خوشی کوئی شے نہیں دے سکتی تھی۔



شام میں وہ عائشے کے لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھی، روحیل سے اسکائپ پہ بات کر رہی تھی۔ جہان دوپہر میں ہی واپس چلا گیا تھا اور وہ اس کے بعد سیدھی گھر آگئی تھی۔

جب تک روحیل آن لائن نہیں ہوا، وہ سوچتی رہی تھی کہ تین سال پرانی بات روحیل نے کبھی کیوں نہیں بتائی۔ تین سال پہلے کیا کبھی اس نے اشاروں کنایوں میں بھی بتایا کہ اسے سبین پھپھو کا بیٹا ملا تھا۔ اس کی ہر سوچ کا جواب نفی میں تھا۔ تین سال پہلے ان کی زندگیوں میں کیا ہو رہا تھا؟ وہ شریعہ اینڈ لاء کے دوسرے سال میں تھی۔ ان کے ایک دور کے چچا کی شادی ہوئی تھی، اور... اور... روحیل نے ایک دن بہت ہنگامی انداز میں کال کر کے ابا سے پیسے مانگے تھے۔

وہ ایک دم سے چونکی۔ تین، ساڑھے تین سال قبل ایک دن روحیل کا اچانک ہی فون آیا تھا، اس نے ابا سے دو یا تین لاکھ روپے منگوائے تھے۔

"ابا! میں جھوٹ نہیں بول رہا، مجھے واقعی ضرورت ہے۔"

اور ہر "کیوں" کے جواب میں وہ یہی کہتا کہ پاکستان آکر بتاؤں گا۔

حیا کو اس کی پریشانی دیکھ کر یکا یقین تھا کہ اس نے کسی دوست کی کوئی قیمتی شے گم کر دی ہے اور اسی کی قیمت بھرنے کے لیے مانگ رہا ہے۔ پھر پتا نہیں روحیل نے ابا کو وجہ بتائی یا نہیں مگر اب سارے معاملے کو دوبارہ یاد کرتے ہوئے وہ سوچنے لگی کہ کیا ان دو واقعات کا کوئی باہمی تعلق تھا؟ سیدھا سیدھا پوچھا تو روحیل شاید چھپا جائے، سو اسے اندھیرے میں نشانہ باندھنا پڑے گا۔

روحیل آن لائن آگیا تھا، اور اب اس کا چہرہ اسکرین پر نظر آرہا تھا۔ رسمی باتوں کے بعد اس نے بغیر

کسی تمہید کے پوچھا۔

"تم نے جہان کا کون سا نقصان بھرنے کے لیے ابا سے پیسے منگوائے تھے؟"

لمحے بھر کو تو روحیل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، پھر وہ ذرا حیرت سے بولا۔

"یہ تم سے کس نے کہا ہے؟"

"تم پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ تم سے جہان کا کوئی نقصان ہوا تھا نا؟ جب وہ تمہارے پاس امریکہ آیا ہوا تھا تو تم نے ابا سے پیسے منگوائے تھے۔" اندر ہی اندر وہ خود بھی گڑبڑا رہی تھی، کیا پتا ایسی کوئی بات ہی نہ ہو۔

"تم سے یہ جہان نے کہا ہے؟" وہ اچنبھے سے پوچھ رہا تھا۔

"جس نے بھی کہا ہو، تم میرے سوال کا جواب دو، روحیل۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا، جیسے شش و پنج میں ہو۔

"تم جہان سے کیوں نہیں پوچھ لیتیں؟"

"وہ سب کچھ بتا چکا ہے مگر تم سے اس لیے پوچھ رہی ہوں تاکہ یہ جان سکوں کہ میرا بھائی مجھ سے کتنا جھوٹ بول سکتا ہے؟" تلخ لہجے میں کہہ کر اس نے روحیل کے چہرے کو دیکھا۔ وہاں واضح تلملاہٹ در آئی تھی۔ جذباتی بلیک میلنگ کام کر گئی تھی۔

"بات جھوٹ بولنے کی نہیں ہے اور مجھے پتا ہے اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا، وہ بتائے گا بھی نہیں کیونکہ اس نے مجھے بھی منع کر رکھا تھا۔ پھر بھی، میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔" پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔

"وہ ایک رات کے لیے بہت اچانک میرے پاس آیا تھا، اس کے بائیں کندھے پر گولی لگی تھی، اور اسے بروقت طبی امداد چاہیے تھی، مگر وہ اسپتال نہیں جانا چاہتا تھا، سو اس کے کہنے پہ میں نے اپنی ایک ڈاکٹر فرینڈ کو بلایا جو تب اپنی ریزی ڈینس کر رہی تھی۔ اس نے میرے اپارٹمنٹ پہ جہان کو ٹریٹ کیا، اور بینڈیج وغیرہ کیا۔ پھر جہان نے مجھے بس اتنا بتایا کہ اس کے پیچھے کوئی ہے اور وہ کسی سے بھاگتا پھر رہا ہے۔ اس کے پاس ترکی کے ٹکٹ کے لیے پیسے بھی نہیں تھے، سو اس کے پیسے مانگنے پہ میں نے ابا سے کہہ کر راتوں رات پیسے ارینج کیے تھے۔ وہ صبح ہوتے ہی واپس ترکی چلا گیا پھر ہفتے بعد ہی اس نے پیسے واپس بھجوا دیے۔ بس یہی بات تھی۔"

وہ حق دق سنے جا رہی تھی۔

"ابا کو پتا ہے اس بات کا؟"

"نہیں، اور تم مت بتانا۔ وہ پہلے ہی جہان سے متنفر رہتے ہیں۔ یہ بات بتائی تو...."

"وہ تو بس جہان کی لاپروائی کی وجہ سے اس سے کھنچے کھنچے سے تھے، مگر اب ایسا نہیں ہے۔"

"نہیں، وہ کسی اور بات پہ اس سے برگشتہ تھے، اب مت پوچھنا کہ وہ کیا بات تھی۔ میں ابھی جلدی میں ہوں، بعد میں بتا دوں گا۔ مگر اتنا یقین رکھو کہ وہ جس زخمی حالت میں میرے پاس آیا تھا، مجھے وہ اسی دن سے اچھا لگنے لگا تھا۔ اور میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ سچ بول رہا تھا جب اس نے اس رات مجھے کہا تھا کہ روحیل، "آئی ایم ناٹ دی بیڈ گائے" بلکہ جو میرے پیچھے ہیں، وہ کرمنلز ہیں۔"

"اور وہ دوسری بات؟" اس نے اصرار کرنا چاہا مگر روحیل اسے کوئی موقع دیے بغیر میز سے اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔ اسے باہر جانا تھا اور وہ جلدی میں تھا۔

حیا نے بے دلی سے لاگ آؤٹ کیا۔ اس کا دل ایک دم بہت بوجھل ہو گیا تھا۔

اس کے گھر والے اس کو چھوٹا سمجھ کر اس سے اتنی باتیں چھپاتے کیوں تھے آخر؟



عائشے نے لیٹتے ہوئے بہارے پہ کمبل برابر کیا، پھر ایک نظر اسے دیکھا جو بہارے کے اس طرف لیٹی، چھت کو تکے جا رہی تھی۔ وہ تینوں یوں سوتیں کہ بہارے درمیان میں ہوتی۔

"عائشے!" اس نے عائشے کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کیا تھا یا شاید وہ اسے پکارنے کا ارادہ پہلے سے

رکھتی تھی۔

"کہو!" عائشے پہلو کے بل لیٹی' نرمی سے بہارے کے گھنگھریالے بالوں کو سہلا رہی تھی۔

"میری سیپ سے موتی کیوں نہیں نکلتے؟ میں اتنا جھوٹ تو نہیں بولتی۔" وہ چھت کو تکتی کہنے لگی۔

"تم بہارے کے فلسفے کو ذہن سے نکال دو۔ یہ تو رزق ہوتا ہے۔ کبھی نکل آتا ہے تو کبھی نہیں۔"

چند لمحے کمرے کی تاریکی میں ڈوب گئے جس میں سبز نائٹ بلب کی مدھم روشنی پھیلی تھی۔ بہارے کی بند آنکھوں سے سانس لینے کی آواز ہولے ہولے ابھرتی رہی تھی۔

"عائشے۔" اس نے اسی طرح چھت کو تکتے ہوئے پھر سے پکارا۔ "کیا مجھے دنیا نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے؟"

"پتا نہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں بہت دور نکل آئی ہوں' اتنی دور کہ میں ان باتوں سے خود کو ریلیٹ نہیں کرپاتی' جو تمہاری زندگی کا حصہ ہیں۔"

"حیا! دور ہمیشہ ہم جاتے ہیں۔ اللہ دور نہیں جاتا۔"

وہ نگاہوں کا زاویہ موڑ کر عائشے کو سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔

"اگر تمہیں لگتا ہے کہ دوریاں بہت بڑھ گئی ہیں تو انہیں ختم کرنے کی کوشش میں پہل بھی تمہیں کرنی ہوگی۔"

"کیسے؟" وہ بے اختیار بول اٹھی۔

"تم کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"میرا بازو مجھ سے روز یہ سوال کرتا ہے کہ میں کون ہوں' میں چاہتی ہوں کہ میرے پاس اس کے سوال کا کوئی اچھا جواب ہو۔ میں زندگی میں کچھ اچھا کرنا چاہتی ہوں۔"

"اس لیے تاکہ تمہاری سیپ سے موتی نکل آئیں؟"

"نہیں۔" وہ ذرا خفت زدہ ہوئی۔ "بلکہ اس لیے تاکہ مجھے اس آگ میں کبھی نہ جلنا پڑے جس سے مجھے اب بہت ڈر لگتا ہے۔"

"پھر اس فاصلے کو سمیٹنے کی کوشش کرو۔"

"کیسے؟"

"حیا' یہ جو ہمارا اللہ سے فاصلہ آجاتا ہے نا' یہ سیدھی سڑک کی طرح نہیں ہوتا۔ یہ پہاڑ کی طرح ہوتا ہے۔ اس کو بھاگ کر طے کرنے کی کوشش کرو گی تو جلدی تھک جاؤ گی' جست لگاؤ گی تو درمیان میں گر جاؤ گی' اڑنے کی کوشش کرو گی تو ہوا ساتھ نہیں دے گی۔"

عائشے سانس لینے کو لحظہ بھر کے لیے رکی۔

"یہ فاصلہ بے بی اسٹیپس سے عبور کیا جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر چوٹی پہ پہنچا جاتا ہے۔ کبھی بھی درمیان میں پلٹ کر نیچے اترنا چاہو گی تو پرانی زندگی کی کشش ثقل کھینچ لے گی اور قدم اترتے چلے جائیں گے اور اوپر چڑھنا اتنا ہی دشوار ہوگا' مگر ہر اوپر چڑھتے قدم پہ بلندی ملے گی۔ سو بھاگنا مت' جست لگانے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ بس چھوٹے چھوٹے اچھے کام کرنا اور چھوٹے چھوٹے گناہ چھوڑ دینا۔"

عائشے گل کا چہرہ مدھم سبز روشنی میں دمک رہا تھا۔ وہ اتنا نرم بولتی کہ لگتا جیسے گلاب کی پنکھڑیاں اوپر سے گر رہی ہوں' جیسے شہد کی ندی بہہ رہی ہو' جیسے شام کی بارش کے ملائم قطرے ٹپک رہے ہوں۔

"تو میں کیا کروں؟"

"تم اپنی کوئی بہت محبوب شے اللہ تعالیٰ کے لیے قربان کردو۔"

اس کی بات پر حیا نے لمحے بھر کے لیے سوچا۔ اس کے پاس ایسی کون سی شے تھی؟

"سبانجی کے ڈروم میں میرے پاس ایک ڈائمنڈ رنگ پڑی ہے' وہ بہت قیمتی ہے۔"

"قیمتی چیز نہیں' محبوب چیز قربان کرو۔ ضروری نہیں ہے کہ تمہاری محبوب چیز قیمتی بھی ہو۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "اور میں بتاؤں کہ تمہاری محبوب ترین شے کیا ہے؟"

"کیا؟"
"تمہاری انا۔ تم اسے قربان کرو۔"
"مگر کس کے لیے؟" وہ ذرا حیرت سے بولی۔
"اپنے چچا کی کسی بیٹی کے لیے۔ تمہارے کوئی چچا اور ان کی بیٹیاں ہیں؟" حیا نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔
"تم ان کے لیے وہ کرو جو تم کبھی نہیں کرتیں۔ سب سے مشکل قربانی دینا چچا کے بچوں کے لیے ہوتا ہے' کیونکہ سب سے زیادہ مقابلہ ان سے رہتا ہے' اور سب سے زیادہ ناقدرے بھی وہی ہوتے ہیں۔"
"میں ان کے لیے کیا کروں؟ میں ان سے کبھی زیادتی نہیں کرتی۔ بس میں ان کے طنز کے جواب میں زبان پہ آئے طنز کو روک نہیں پاتی۔"
"حیا! یہ جو چھوٹے چھوٹے طنز اور طعنے ہوتے ہیں نا' ان سے بچا کرو۔ مکہ میں چند بڑے بڑے سردار تھے۔ جو یونہی چھوٹے چھوٹے طنز کر جاتے تھے۔ پھر کیا ہوا؟ وہ بدر سے پہلے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں سے مر گئے۔ کوئی خراش سے مرا تو کوئی چھوٹے سے پھوڑے سے۔ تم اپنی کزن کے لیے اپنی انا کی ضرب کو بھول جاؤ۔"
"میں کوشش کروں گی۔ ویسے عائشے!" وہ ذرا سا مسکرائی۔ "تم بہت پیاری ہو۔"
جواباً عائشے دھیرے سے ہنس دی۔
"تم بھی بہت پیاری ہو حیا!"
"اور میں بھی بہت پیاری ہوں۔" بہارے نے بند آنکھوں سے کہا تو وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔
"گندی بچی! تم جاگ رہی تھیں؟ چلو سو جاؤ۔ صبح کام پہ بھی جانا ہے۔"
عائشے نے بہارے کو مصنوعی خفگی سے ڈانٹتے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آف کیا۔ سبز روشنی غائب ہو گئی۔ کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔

☆ ☆ ☆

صبح سویرے کچن سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ کھلے بال انگلیوں سے سمیٹ کر جوڑے میں لپیٹتی چوکھٹ تک آئی۔
عائشے کرسی پہ بیٹھی تھی اور اپنے آگے کھڑی بہارے کے بال بنا رہی تھی۔ آج گھر کے کام تھے' سو جنگل نہیں جانا تھا تو بہارے باہر جدیسی (گلی) میں بچوں کے ساتھ کھیلنے جا رہی تھی۔
"اب بہارے گل اکیلی جائے گی تو اچھی لڑکی بن کر جائے گی' ٹھیک ہے نا؟" عائشے نرمی سے تائید چاہتی اس کی چوٹی گوندھ رہی تھی۔
"ٹھیک!" بہارے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"اور اچھی لڑکیاں جب بازار سے گزرتی ہیں تو نظریں جھکا کر گزرتی ہیں۔"
"ایسے اگر ٹھوکر لگ جائے تو؟"
عائشے نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے چوٹی کے آخری بل ایک دوسرے میں گوندھے۔
"جو لڑکی اللہ کی بات مانتی ہے' اسے اللہ ٹھوکر لگنے نہیں دیتا۔"
"اور جو نہیں مانتی؟"
"اسے لگنے دیتا ہے۔" اس نے پونی باندھ کر نچلے بالوں کو برش کیا۔ پھر شانوں سے تھام کر بہارے کا رخ اپنی جانب کیا۔
"اور اچھی لڑکیاں جب باہر نکلتی ہیں تو کیسے چلتی ہیں؟" بہارے کی پیشانی کے بال نرمی سے سنوارتے اس نے روز کا دہرایا جانے والا سبق پھر سے پوچھا۔
"وہ ان دو لڑکیوں کی طرح چلتی ہیں جو کنوئیں پہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی تھیں۔"
"اور وہ دو لڑکیاں کیسے چل رہی تھیں؟" اس نے بہارے کی بھوری گھنگریالی لٹ کان کے پیچھے اڑسی۔
"حیا کے ساتھ......"
"اور عمر بن خطاب ؓ نے کیا کہا تھا۔ حیا والی لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں؟"
"وہ ہر جگہ نہیں چلی جاتیں' ہر بات نہیں کر لیتیں۔ ہر کسی سے نہیں مل لیتیں۔" بہارے نے

انگلیوں پہ تینوں نکات جلدی جلدی دہرائے' جیسے اسے بھاگنے کی جلدی ہو۔
"اور یاد رکھنا کہ جب تم میں حیا نہ رہے' تو پھر جو جی چاہے کرنا۔" بظاہر نرمی سے کہتے عائشے کی آنکھوں میں وہ تنبیہہ ابھری جو بہارے کو سیدھا رکھتی تھی۔
بہارے نے اثبات میں سر ہلایا اور آگے بڑھ کر عائشے کا رخسار چوما۔
"عائشے گل! بہارے گل تم سے بہت پیار کرتی ہے۔"
وہ بھاگ کر دروازے میں آئی' تو حیا اس سے ملنے کے لیے جھکی' اس نے اسی طرح حیا کا گال چوما۔
"حیا سلیمان! بہارے گل تم سے بہت پیار کرتی ہے۔" کہہ کر وہ باہر بھاگ گئی۔
"تم بہت محنت کرتی ہو' اس کی ذہن سازی کے لیے۔" وہ آگے چلی آئی۔ وہ جب تک بیدار ہوتی تھی' وہ دونوں بہنیں حلیمہ آنٹی کے گھر سے قرآن پڑھ کر آ چکی ہوتی تھیں۔
"کرنی پڑتی ہے۔ چھوٹی لڑکیاں تو نرم ٹہنی کی طرح ہوتی ہیں۔ جہاں موڑو' مڑ جائیں گی' اگر وقت گزرنے کے ساتھ ٹہنی رنگ بدل لے' سوکھ بھی جائے تو بھی اس کا رخ وہی رہتا ہے' مگر جو بڑی لڑکیاں ہوتی ہیں نا' وہ کانچ کی طرح ہوتی ہیں۔ اسے موڑو تو مڑتا نہیں ہے' زبردستی کرو تو ٹوٹ جاتا ہے۔ کانچ کو تراشنا پڑتا ہے اور جب تک اس کی کرچیاں نہیں ٹوٹتیں اور اپنے ہاتھ زخمی نہیں ہوتے' وہ مرضی کے مطابق نہیں ڈھلتا۔"
"صحیح کہہ رہی ہو۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"اچھا فون کدھر ہے؟ میرا کریڈٹ ختم ہے۔ پاکستان فون کرنا تھا۔"
"اوہ سوری! یہ پڑا ہے' عبدالرحمان کا فون آیا تھا تو میں نے ادھر ہی رکھ دیا اور یہ تمہاری چائے۔" اس نے کارڈلیس فون اور حیا کے ناشتہ کا واحد جز چائے اس کے سامنے رکھی۔
"کیا کہہ رہا تھا وہ؟" بے اختیار ہی وہ پوچھ اٹھی۔ حالانکہ اسے پاشا میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔
"بس کچھ پیپرز کا پوچھ رہا تھا۔ اس کے کمرے میں رکھے تھے۔"
"بہارے تو خوش ہوئی ہوگی اس سے بات کر کے۔"
ناشتے کے برتن سمیٹتی عائشے کے ہاتھ ذرا سست پڑے۔ ایک آزردگی اس کے چہرے پہ بکھر گئی۔
"تم بہارے کو مت بتانا۔ میں نے بھی اسے نہیں بتایا۔ وہ اس سے بات کرنے کے لیے فون نہیں کرتا' اپنے کام کے لیے کرتا ہے بس۔" وہ اداسی سے سر جھٹک کر کام کرنے لگی۔
حیا خاموشی سے فون اور چائے کا کپ لیے باہر آ گئی۔ گھاس پہ شبنم کے قطروں کی چادر چڑھی تھی۔ بہار کے پھول ہر سو خوشبو بکھیرے ہوئے تھے۔ وہ گھاس پہ بیٹھ کر چائے کے گھونٹ بھرتی تایا فرقان کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔
فون ارم نے ہی اٹھایا۔ دعا' سلام اور رسمی سے حال احوال کے بعد وہ بہت جھجکتے ہوئے لہجے میں بولی۔
"تمہیں آج کیسے خیال آیا فون کرنے کا؟"
عام دنوں میں حیا کو اس فقرے سے زیادہ تپ کسی شے سے نہیں چڑھتی تھی۔ انسان جب کسی کو فون کرے' چاہے سال بعد ہی سہی' تو وہ اگلے کا خیال کر کے ہی فون کرتا ہے۔ اس پہ کسی گلے سے بات کا آغاز کرنا مخاطب کو یہ کہنے کے برابر ہے کہ آئندہ یہ خیال کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مگر اس نے اب زندگی میں اتنی تکلیف سہہ لی تھی کہ اسے محسوس نہیں ہوا' یا پھر وہ خود ہی نظر انداز کر گئی۔
"ٹھیک کہہ رہی ہو' میں بھی بس مصروفیت کے باعث کر ہی نہیں پائی۔ تم سناؤ کیسی ہو؟ اور ہاں' منگنی کی بہت مبارک ہو۔"
"بہت شکریہ!" ارم کا لہجہ خاصا روکھا تھا۔
چند چھوٹی چھوٹی نرم سی باتیں کر کے اور ارم کی چھوٹی چھوٹی تند باتوں کو نظر انداز کر کے اس نے فون رکھا تو اس کا دل پہلے سے بہت ہلکا تھا۔

✡ ✡ ✡

اس شام عائشے اور بہارے گھر پہ نہیں تھیں۔ وہ اپنے جاننے والوں میں کسی کی فوتگی پہ گئی تھیں۔ حیا نے گھر ٹھہرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ مگر اب تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔

وہ سارا دن اکٹھی ہوتی تھیں۔ پھر رات کو ہوٹل گرینڈ کے گارڈز گیٹ پہ اور دو گارڈز جدیسی (گلی) کے سرے پہ آکر پہرہ دیتے تھے تو ایک تحفظ کا احساس گھیرے رہتا تھا۔ البتہ اب وہ بہت تنہائی محسوس کر رہی تھی۔

پہلے تو وہ اوپر اسٹڈی روم میں آگئی' جہاں اس کی تصاویر دیواروں پہ آویزاں تھیں۔ اسے یوں اپنی تصاویر ادھر دیکھ کر ہمیشہ بہت کوفت ہوتی تھی۔

وہ میٹرو اسٹیشن کی سیڑھیوں کے دہانے پہ ذرا سی لڑکھڑائی تھی۔ ٹوٹی سرخ جوتی پاؤں سے لٹک رہی تھی۔

وہ اپنے سنہری سکوں والے فراک میں پاشا کی سیاہ کار سے نکل رہی تھی۔

وہ دروزاہ کھول کر اس نیم تاریک محل میں داخل ہو رہی تھی۔ اس وقت جب وہ اس بچے کے پیچھے بھاگتی اپنا پرس لینے آئی تھی۔

اور بھی ترکی اور پاکستان کی بہت سی تصاویر' پاشا کے بندے ہر پل اس کا تعاقب کرتے تھے۔ اسے یقین تھا۔ وہ بے دلی سے باہر آگئی۔ اس کو بلیک میل کرنے کے لیے اس نے بہت سا سامان اکٹھا کر رکھا تھا۔ مگر کوئی کمزوری تو پاشا کی بھی ہوگی۔

کچھ سوچ کر اس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ گول چکر کھاتا لکڑی کا زینہ تیسری منزل تک جاتا تھا۔ وہاں پاشا کا کمرہ تھا۔ بہارے بات بے بات ذکر کرتی۔ راہ داری کا آخری کمرہ۔ وہ ادھر گئی تو نہیں تھی۔ مگر جانے میں حرج بھی نہ تھا۔ اسے اس گھر کے بارے میں جتنا پتا ہوتا اچھا تھا۔

وہ ننگے پاؤں زینے چڑھتی اوپر آئی۔ چابیوں کا گچھا اس نے عائشے کی دراز سے نکال لیا تھا۔ آخری کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے چابیاں لگانی شروع کیں۔ چوتھی چابی پہ لاک کھل گیا۔ اس نے دھیرے سے دروازہ دھکیلا۔

وہ بہت شاہانہ طرز کا بیڈ روم تھا۔ اونچی چھت' جھلملاتا فانوس۔ دیوار گیر کھڑکی کے ہلکے سرمئی مخملیں پردے۔ قالین بھی سرمئی۔ سارا کمرہ گہرے نیلے اور سرمئی شیڈز میں آراستہ کیا گیا تھا۔

کمرے میں پرفیوم کی خوشبو پھیلی تھی۔ خوشبو پرفیوم کے بے حد قیمتی ہونے کی چغلی کھا رہی تھی۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھی نازک شیشیوں کو دیکھا۔ ایک سے ایک مہنگا پرفیوم ادھر رکھا تھا۔

وہ ادھر ادھر کمرے میں ٹہلتی ہر شے کا جائزہ لیتے ہوئے الماریوں کی طرف آئی۔ ایک ایک کر کے اس نے پانچوں پٹ کھولنے کی کوشش کی ـــ پہلے چار لاکڈ تھے۔ آخری کھلا تھا۔ اس نے پٹ کھولا تو اندر بہت سے قیمتی' نفیس تھری پیس سوٹ ہینگرز میں لٹکے تھے۔ نچلے خانے میں ایک بریف کیس رکھا تھا۔

اس نے احتیاط سے بریف کیس اٹھایا اور بیڈ پہ آ بیٹھی۔ بریف کیس لاکڈ نہیں تھا۔ حیا نے اسے کھولا۔ اندر چند فائلز رکھی تھیں اور اوپر ایک نوٹ پیڈ پہ سیاہ روشنائی سے ترکی میں کچھ نام فہرست کی صورت میں لکھے تھے۔ وہ فہرست اٹھا کر پڑھنے لگی۔ تب ہی بریف کیس میں سے بیپ کی آواز آنے لگی۔ وہ چونکی' اندر کچھ بج رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے کاغذ اندر ڈالا تو انگوٹھے پہ ایک حرف کی سیاہ روشنائی لگ گئی۔ بہت تیزی سے بریف کیس کو واپس رکھ کر بستر کی چادر کی شکن درست کرتی وہ باہر نکل آئی۔

کمرہ لاک کر کے جب وہ زینے اتر رہی تھی تو لاؤنج کا فون بج رہا تھا۔ وہ تقریباً" بھاگتی ہوئی نیچے آئی اور فون اٹھایا۔

"ہیلو؟"

جواباً" لمحے بھر کو خاموشی چھائی رہی۔ پھر ایئر پیس میں سے عبدالرحمٰن پاشا کی آواز گونجی۔

"عائشے کدھر ہے؟"

"وہ دونوں کسی کے گھر گئی ہیں۔" وہ ذرا سنبھل کر بولی۔

"آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

چند لمحے کے لیے وہ خاموش رہا۔ پھر بولا تو اس کی آواز بے حد سرد تھی۔

"آئندہ اگر آپ میرے کمرے میں گئیں یا میرے بریف کیس کو کھولنے کی کوشش کی تو اپنے پیروں پہ گھر نہیں جا سکیں گی' سمجھیں؟" بہت ضبط سے بولا تھا۔

حیا کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ اس نے گھبرا کر ریسیور کریڈل پہ ڈال دیا۔ پھر انگوٹھے پہ لگے سیاہی کے دھبے کو کپڑے سے رگڑ کر گویا ثبوت مٹانے کی کوشش کی۔

عبدالرحمٰن کو کیسے علم ہوا؟ اس کا دماغ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ البتہ اس کے اندر کوئی اسے کہہ رہا تھا کہ اب اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ لیکن قصر بیوک ادا اور ان دو بہنوں کی کشش ـــ وہ عجیب مخمصے میں پڑ گئی۔

✡ ✡ ✡

"یہ ادا چائے کے کھیت ہیں۔" اس روز عائشے نے اسے اپنی ایک عزیزہ کبریٰ بہلول کا لہلاتا ہوا کھیت دکھاتے ہوئے بتایا تھا۔

"ادا چائے کیا ہوتی ہے؟" اس نے اس پودے کے ترکی نام کا مطلب پوچھا۔

"ادا یعنی جزیرہ اور چائے یعنی ٹی۔"

"اوہ اچھا ـــ ہم بھی ٹی کو چائے ہی کہتے ہیں۔" وہ دھیرے سے ہنس پڑی۔ کبریٰ بہلول ایک معمر خاتون تھیں۔ ان کی فصل تیار تھی۔ مگر ان کے پاس کوئی ہیلپر نہ تھا جو ان کے ساتھ فصل چنتا' سو عائشے کے کہنے پہ حیا نے لکڑیاں کاٹنے کے بجائے کبریٰ بہلول کے ساتھ ادا چائے کے پتے چننے شروع کر دیے۔ چمکتے سورج اور ٹھنڈی ہوا کے امتزاج میں کام کرنا مشقت طلب تھا۔ مگر وہ اس فطرت کے قریب ماحول میں خوش تھی۔ کبریٰ بہلول سے وہ چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھتی رہتی تھی اور جو باتیں وہ عبدالرحمان پاشا کے بارے میں کر جاتیں' وہ انہیں ذہن میں محفوظ کرتی جاتی۔ اسے ہوٹل گرینڈ کے معاملات میں دلچسپی ہونے لگی تھی۔ وہ اب تنہا کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔ ورنہ کئی دفعہ اس کا جی ہوٹل گرینڈ کا چکر لگانے کو چاہا تھا۔ واپس جانے کا ارادہ اس نے فی الحال ملتوی کر دیا تھا۔ اس کی چھٹی حس کہتی تھی کہ بیوک ادا میں کچھ ہے۔ کچھ ایسا جو اسے اگر معلوم ہو گیا تو اس کے پاس ایک قیمتی ہتھیار آجائے گا جو مستقبل میں اس کے کام آسکتا ہے۔

اس شام وہ تینوں ساحل کنارے چٹائی پہ بیٹھی تھیں۔ عائشے کو آج دو سیپ ملے تھے۔ سو وہ انہیں کھول رہی تھی۔ حیا اب بڑے سیپ نہیں چنتی تھی۔ بلکہ بادام کے سائز کی سیپیوں کے خالی خول ریت سے اٹھا لیتی اور اب ان ہی کے ڈھیر کو لیے وہ ایک مالا میں پرو رہی تھی۔ ساتھ ہی بہارے اپنے پزل باکس کے سلائیڈز کو اوپر نیچے کر رہی تھی۔

"حیا ـــ! میں اسے کبھی نہیں کھول پاؤں گی۔" اس کا لہجہ مایوس کن تھا۔ حیا نے ننھے خول کو سوئی میں پروتے سر اٹھا کر اس کا اداس چہرہ دیکھا۔ پھر گردن آگے جھکا کر اس پہ لکھی نظم کو پڑھا۔ "یہ بہت آسان ہے بہارے۔ ٹھہرو ـــ میں تمہیں ایک ہنٹ دیتی ہوں۔"

اس نے دوبارہ سے وہ نظم پڑھی۔ پھر سمجھ کر بولی۔

"یہ ایک سفید چھوٹی سی آنکھ ہے جو چاندی کے صندوق میں بند ہوتی ہے اور وہ صندوق نمکین گہرائی میں رکھا ہوتا ہے۔ بہارے! وہ کون سی گہرائی ہے جو نمکین ہوتی ہے؟"

بہارے جو اداس نظروں سے پزل باکس کو دیکھ رہی تھی۔ ایک دم چونکی۔

باقی آئندہ شمارے میں

عالیہ بخاری

دل اور شب

خیام کا تعلق اس دُنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دلدار نانی نے اس کی پرورش بے حد نازو نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اُٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار، لاری اڈّے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویّہ حیران کن ہے۔ شہر آکر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گیتی آرا کی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھروسا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو رفاحی کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعا گو ہیں۔

دوسرا گھرانہ اظہار چچا کا ہے جو ظاہری نمودونمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کلرک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصا کما چکے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی امارات کی دُھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ربیعہ جبکہ جویا کی بات معاذ سے طے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر خاک ڈال دی ہے۔ چچا نے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زوبیہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ربیعہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ جویا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔



قسط ۵۴

یہاں اپنے پھکڑپن کا مظاہرہ وہ کتنی ہی بار کرچکا تھا اور جواباً "داد بھی دل کھول کر پاتا تھا' سو اس بار بھی اسے یقین تھا کہ ابھی گلناز اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر اونچا سا قہقہہ لگائے گی۔ مگر آج گلناز 'نانی دلدار کے بجائے خود کو نانی ستارہ کی وارث ثابت کرنے پر تلی تھی۔

"گیتی سالار کی پہلی بیوی ہے۔ بہت بڑی جائیداد اور بزنس کا مالک ہے اور اس کے مرحوم باپ کراچی کے مشہور..."

پہلی بار اس قصے میں کچھ ایسا تھا جو نبیل کے ہوش حواس کو چند لمحوں کے لیے گم کرنے کا باعث بنا تھا۔

نگینہ اس کے حیرت سے کھلے منہ سے بے نیاز سالار کی شان میں جو قصیدہ پڑھ رہی تھی' اس پر ذرا بھی دھیان دیے بغیر وہ حرف اول میں ہی پھنسا ہوا تھا۔

گیتی..... سالار! دونوں ناموں کی الگ الگ شاید کوئی اہمیت نہ ہو' مگر ان کا ایک ساتھ ہونا بڑا واضح اشارہ دے رہا تھا۔

"اور یہ 'نیا بہرحال بہت چھوٹی سی جگہ ہے۔" اسے پورا یقین ہو چلا تھا۔

"کب ہوئی ہے یہ شادی!" خود پر قابو پا کر' وہ ذرا سنبھل کر بیٹھا۔

"ابھی بیٹا کچھ ماہ پہلے' دھواں دار برستی بارش میں وہ اچانک ہی آیا اور گلی میں جیسے....." گلناز کی پیشہ ورانہ حس نے اسے مزید تفصیل دینے سے روکا تھا "بس جی سب اللہ کا حکم تھا اور جوڑے تو ویسے بھی وہ اوپر والا ہی بناتا ہے نا۔"

جو قصہ اس نے صرف نبیل پر اپنے خاندان کے اعلا ترین رشتوں کا حوالہ ثابت کرنے کے لیے شروع کیا تھا' نبیل کے لیے از حد دلچسپی کا باعث بنا تھا۔

"کوئی تصویر ہو گی گیتی اور سالار کی' ظاہر ہے شادی پر کھینچی تو ہوں گی نا۔ ذرا دکھائیں تو!"

وہ اب بہت سنبھل کر بیٹھا تھا اور اس سارے معاملے کی اصلیت کو جانے بغیر یہاں سے اٹھنے والا نہیں تھا۔

گلناز نے بڑے مشکوک انداز میں اس کی دلچسپی کو نوٹ کیا تھا۔

"تصویریں خالہ ستارہ کی طرف ہیں۔ اب تو کمپیوٹر میں اپ لوڈ کی جاتی ہیں اور ویسے بھی ایسے اچانک کاموں میں فوٹو گرافر کو بلانے کا ہوش کہاں رہتا ہے۔"

وہ سراسر ٹال رہی تھی اور دل ہی دل میں اپنی لاپروائی پر تھوڑی سی شرمندہ بھی تھی۔

"کیا ضرورت تھی بھلا 'سو دوست' ہزار دشمن۔ بے چاری بچی کو وہاں کراچی میں کچھ مشکل نہ پڑ جائے۔" گلناز کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

نگینہ ابھی ابھی کہیں سے آئی تھی۔

اوپر قدم رکھتے ہی سامنے والے بڑے ہال سے اٹھتی دھیمی دل فریب خوشبو نے اسے رکنے پر مجبور کیا تھا۔

خوب صورت قالینوں کے ساتھ سفید چاندنیاں' مخملیں گاؤ تکیے سلیقے سے سمیٹ کر باندھے گئے سفید نیٹ کے پردے اور پیتل کے سونے کی طرح جگمگاتے نقشین گل دانوں میں لگے سرخ گلاب سب ہی سر شام سے منتظر۔

وہ چپ چاپ کھڑی اس حسین منظر کو دیکھے گئی۔ تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ' اس طرح ہال میں برسوں سے یہی ایک منظر ٹھہرا تھا۔

نسل در نسل۔

آنے والے' استقبال کرنے والے خاموشی سے بدلتے تھے' مگر یہاں کی رونق ہمیشہ سلامت رہی تھی۔

رنگینیاں' دلچسپیاں' رونقیں۔

نظر بد تو اب لگی تھی۔

"کیوں جان مارتی ہے روزانہ شاما! کون آ رہا ہے۔ جس کی تیاری میں سہ پہر سے لگ جاتی ہے۔ اس سے تو آرام ہی کر لیا کر۔" کچھ کوفت سے بولتے ہوئے وہ اندر آ گئی۔

شاما نے مڑ کر دیکھا اور ہلکے سے ہنس پڑی۔

"برسوں کی عادت پڑی ہے باجی! ایسے کیسے چھٹ سکتی ہے اور آنے والوں کا کیا ہے' کوئی آ بھی سکتا ہے۔ مہمان کا کوئی وقت تھوڑی مقرر ہے۔"

"کیا لینے آئے گا مہمان' رکھا کیا ہے یہاں؟ سناٹا ویرانی۔ ہونہہ! دھوم مچانے والوں کی کمی تھوڑی پڑ رہی ہے۔ بہتیرے ہیں یہاں سے وہاں تک۔" وہ کہتی ہوئی پلٹنے لگی۔

یہاں کی آرائش اور ویرانی دونوں ہی ڈپریشن میں مبتلا کرتی تھی۔

"نانی کو منالیں تو آج بھی یہاں آ کر پرفارم کرنے والوں کی کمی نہ رہے..... اعزاز سمجھتی ہیں ہمارے چوبارے پر آنا' کتنی ہی لڑکیوں نے مجھ سے راستے میں روک کر پوچھا ہے کہ....." شاما ساتھ ہی پیچھے پیچھے آئی تھی۔

"دفع کر' منع کر دیا کر سب کو....." نگینہ نے بے زاری سے ہاتھ ہلا کر اس کے قصے کو مختصر کیا۔ "پرفارم کرنے کی آڑ میں صندل کی ناکامی کی ٹوہ لینے کے لیے آنا چاہتی ہیں' ساری کی ساری ہنسی الگ اڑائیں گی کہ اب گزارا نہیں ہو رہا ہے تو پھر سے محفل آباد کر لی۔"

طویل آرائشی برآمدے سے گزرتے ہوئے اس نے ایک ٹھوک بجاتا تجزیہ مکمل کیا اور نانی ستارہ کے کمرے کی طرف مڑنے لگی تھی کہ شاما کی طرف سے ایک سہما سہما سا سوال پھر آیا۔

"تو آگے کی فکر تو کرنی ہے نا باجی نگینہ! صندل نے تو بالکل ہی ہمت ہار دی ہے۔ کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔"

نگینہ نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

شاما کی نگاہ جھکی ہوئی تھی۔ ساری وفاداری اور بلا کی بے تکلفی کے باوجود وہ اپنی اوقات بھی یاد رکھتی تھی اور اس بار اس کی بات کو رد کرنا آسان بھی نہیں تھا۔

نگینہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "میری بھی یہی سوچ کر نیندیں اڑ گئی ہیں' کتنے مان سے گیتی خیر سے اپنے گھر کی ہوئی۔ اماں کتنی بھی ہمت دکھالیں' بہرحال ان کا بھی ضعیفی کا دور ہے۔ رہ گئی میں تو اب میں بھی کس کام کی۔"

"اپنی مثال تو نہ دیں....." شاما نے تڑپ کر حق وفا ادا کرنا چاہا۔ مگر نگینہ نے اس بار بھی اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔

"میری خدمات کا ذکر چھوڑ دے تو۔ میں نے کیا ہی کیا ہے؟ اپنے بچوں کے پیٹ تو جانور بھی بھرتے ہیں۔ میں کیا ان سے بھی گئی گزری تھی۔ جیسے تیسے پالا۔ کون سے نام' عزت کے پھندنے لگائے بے چاریوں پر....."

نگینہ کی ورم اتری بڑی بڑی آنکھوں میں کبھی کبھی بڑی گہری تپش اترتی تھی۔

"عزت دینے والی تو خدا کی ذات ہے باجی اب اس چوبارے سے گیتی عزت کے ساتھ رخصت ہوئی نا....."

نگینہ نے بے ساختہ ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر اوپر کی طرف دیکھا۔ "بڑا کرم' بڑی مہربانی! ساری عمر بھی شکر ادا کرتی رہوں تو ایک نکتہ بھر بھی شکر ادا نہ کرسکوں اپنے رب کا..... مجھ کم ترین کو اس نے یہ خوشی دکھائی۔" جلتے پاؤں طے ہوئے سفر میں گیتی آرا کی زندگی کا آیا موڑ نگینہ کے لیے ایسا ٹھنڈا میٹھا احساس تھا' جس سے روح کی گہرائیاں بھی سیراب ہوتی تھیں۔

"جاکر ایک بار اسے مل آئیں' کتنا بلاتی ہے وہ' نہ سہی اس کے گھر میں' ہوٹل میں رک جائیں گے' مگر اپنی بچی کی شان تو جاکر دیکھ لیں آپ اور نانی۔"

شاما نے اسے دوپٹے سے آنسو صاف کرتے دیکھ کر' بار بار دہرایا ہوا مشورہ پھر سے دیا' مگر اس نے فوراً" ہی انکار میں سر ہلایا۔

"وہ بڑے لوگوں میں بیاہ کر گئی ہے شاما! اور ہر شخص سالار جیسا نہیں ہوتا۔ میں نہیں چاہتی کہ گیتی کو ہماری وجہ سے کسی شرمندگی یا بے عزتی کا سامنا کرنا پڑے۔ لوگ اس پر ہنسیں۔ یہاں دوسروں پر ہنسنا سب کا سب سے دل پسند مشغلہ ہے۔ پتا ہے نا تجھے۔" وہ بات ختم کرکے افسردگی سے مسکرائی۔ لیکن شاما بہت سنجیدہ تھی۔

"کوئی کیوں ہنسے گا۔ آپ نے کوئی اب برا کام تو نہیں کیا ہے باجی نگینہ۔ کیا نہیں ہو رہا ہے دنیا میں ہنسنے والے اپنا اصلی چہرہ دیکھنے کی ہمت کریں تو قسم کھا کر کہتی ہوں' شرم سے ڈوب کر مرجانے کی خواہش کریں گے۔"

"تو جاکر صندل کو دیکھ! کہنا' اماں کے کمرے میں آجائے۔" نگینہ نے دانستہ بات بدلی اور شاما کو وہیں کھڑا چھوڑ کر نانی ستارہ کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ کسی سے فون پر بات کررہی تھیں۔

"جو طریقہ چاہو جیسے مناسب سمجھو' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میرا حق تم سے زیادہ نہیں ہے۔"

نگینہ نے انہیں کسی سے کہتے ہوئے سنا۔ ابھی ابھی وہ خود جس جذباتی کیفیت سے گزری تھی' ارد گرد پر کچھ ایسا دھیان دینے کا اس کا اپنا ارادہ بھی نہیں تھا' لیکن پھر بھی نانی ستارہ کو موبائل سمیت کمرے کے بالکل دوسرے کونے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر اس نے کچھ عجیب سا محسوس کیا۔ ان کی آواز بھی اتنی دھیمی ہوئی تھی کہ اب کچھ بھی سننا محال تھا۔

"کیا تھا جو وہ اس سے چھپانا چاہ رہی تھیں؟ اس سے؟ نگینہ سے؟" وہ سخت حیرت میں مبتلا ہوئی۔

نانی ستارہ کی بات ابھی جاری تھی۔ تب ہی نگینہ کی ساری توجہ اندر آتی صندل نے لے لی۔

"کیوں بلایا ہے آپ نے؟" وہ اس کے قریب جاکر کھڑی ہوگئی۔

نگینہ نے ایک خاموش سی نگاہ میں اس کا جائزہ لیا۔ کاٹن کا سادہ سا سوٹ ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں بندھے ہوئے بال اور میک اپ سے بالکل عاری چہرہ۔

اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ پچھلے سالوں میں ایک وقت وہ ٹاپ کلاس ہیروئن کہلائی گئی تھی۔

"کوئی کام تھا کیا؟"

"ہاں' ہاں! بیٹھو۔" نگینہ نے چونک کر قریب کے صوفے کی طرف اشارہ کیا تو وہ بنا کوئی مزید سوال کیے بیٹھ بھی گئی۔

پچھلے کئی مہینوں کی ٹینشن' بیماری اور ذہنی دباؤ کو سہتے رہنے کے بعد' آج کل وہ نسبتاً" بہتر حالت میں تھی۔ الگ تھلگ اور خاموش..... لیکن نگینہ کو اس کی حد سے بڑھی ہوئی تنہائی پسندی سے ہی ہول اٹھتے تھے۔

"کتنے ہی فنکشنز کے کارڈ آئے' کتنے لوگوں کی دعوتوں کو معذرت کی' صبح کی نشریات والے ٹی وی پروگراموں میں تو ہر کوئی آکر بیٹھ جاتا ہے' یہ وہاں بھی نہیں گئی۔"

نگینہ نے افسردہ دلی سے سارا حساب لگایا۔

"ایسے کیسے چلے گا۔" نادانستگی میں وہ بڑبڑائی۔ صندل نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"کیا چلنا ہے؟"

"تمہارا کیریر بیٹا! اور کیا۔" بنا تمہید کے وہ اسی اہم ترین موضوع پر آئی جو کب سے ایک سوالیہ نشان بنا تھا۔

"ہم سے غلطی ہوئی' ایک اچھا پروفیشنل سیکرٹری رکھتے تو اس بالی کے رحم و کرم پر نہ رہ جاتے۔ اوپر سے بالی نے باہر کی فلمیں بھی سائن نہیں کرنے دیں۔ گڑبڑ تو ابتدا میں ہی ہوگئی نا۔"

"خدا کے لیے امی!" اس نے جھنجلا کر رخ پھیرا۔

"بات کو سمجھنے کی کوشش کرو صندل! اس طرح بیٹھ کر کیوں خود کو نقصان پہنچا رہی ہو بیٹا؟ دو چار فلموں کے فلاپ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ قسمت یوں ہی امتحان لیتی ہے۔"

"میں اس امتحان میں فیل ہوچکی ہوں۔ آپ کو ابھی بھی یقین نہیں آیا کیا۔" اس کی مایوسی میں اب بھی فرق نہیں تھا۔ نگینہ نے بمشکل ہی خود کو سنبھالا۔

"دو جگہ سے آفر آرہی ہے' بات کرکے دیکھ لو' کیا پتا' سب اچھا ہی ہوجائے۔ میں نے انہیں انتظار کرنے کا کہہ دیا ہے۔ ایک دو اشتہار والوں کا بھی فون آیا تھا۔"

ذرا رک کر نگینہ نے اس کے چہرے پر اپنی سنائی ہوئی خوش خبری کا اثر دیکھنا چاہا مگر وہاں ویسا ہی پتھریلا پن تھا۔

"مجھے آگے کام کرنا ہی نہیں ہے امی! میں آپ سے کہہ چکی ہوں۔ بار بار اصرار مت کریں۔"

"کام نہیں کرو گی تو کیا کرو گی؟ اتنے سالوں کی محنت' تربیت سب پر پانی پھیرنے کا ارادہ ہے کیا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی نگینہ کے لہجے میں سختی اتری۔ "بچپن سے اب تک' صرف تمہاری تربیت' تمہاری ضروریات پر لاکھوں خرچ ہوا ہے آخر!"

"میں نے تو نہیں کہا تھا کہ آپ مجھ پر خرچ کریں۔ گیتی پر کرلیتیں۔" صندل کی آواز دھیمی تھی۔

"تمہیں پتا ہے کہ اس نے شروع سے ہی مایوس کیا تھا۔ کتنی کوشش کی تھی اماں نے' استاد جی نے' مگر وہ اس طرف آہی نہ سکی۔ ہماری امیدیں تم سے بندھی ہیں صندل! اگر تم اس طرح ہمت ہار دو گی تو....."

"اور رہا ہی کیا ہے ہارنے کے لیے..... سب کچھ تو ختم ہوا۔" صندل کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

"پاگل ہوگئی ہو کیا؟ چار فلمیں فلاپ کیا ہوئیں....."

"چار نہیں چھ!" اس نے نگینہ کی فوری تصحیح کی تھی۔ "اور یہ کوئی کم نہیں ہے کسی کے بھی کیریر کو ختم کرنے کے لیے۔ آپ کیوں بھول رہی ہیں کہ یہاں گنتی کی فلمیں بنتی ہیں سال میں اور لوگ پٹے ہوئے چہرے پر پیسہ لگانے سے سب سے زیادہ گھبراتے ہیں اور یہ جو آپ کے پاس آفر آئی ہے' وہ بالکل ہی سی کلاس ہے۔ آپ کو پتا ہے نا۔"

اس کے لہجے میں اتنا یقین تھا کہ نگینہ کو سہارے کے لیے اس بڑے سارے کمرے کے دوسری طرف بیٹھی نانی ستارہ کی طرف دیکھنا پڑا۔

وہ اب بھی فون پر مصروف تھیں اور ان کے چہرے پر پھیلا اطمینان اور لبوں کی مسکراہٹ "سب اچھا ہے" کی خوش خبری دے رہے تھے۔

نگینہ نے بڑے رشک سے انہیں دیکھا۔

ساری زندگی میں' وہ فقط چند بار ہی اس طرح مسکرائی تھی۔ پہلی بار بالی کے یہاں آنے پر' صندل کی پہلی فلم

سائن ہونے پر، گیتی کی شادی..... اور صندل کے کوٹھی خریدنے پر.....

"شام کا اخبار آیا ہے آج؟" سامنے بیٹھی صندل کے پوچھنے پر وہ ادھر سے ادھر ہوئی۔

"کوئی خاص خبر ہے کیا؟"

"کوٹھی کی فروخت کا اشتہار دیا ہے..... وہ دیکھنا تھا!" نگینہ کا منہ حیرت سے کھلا تھا۔

"بالی نے بڑا لمبا چوڑا حساب بنا رکھا ہے میرے کھاتے میں۔ وہ تو دینا ہی ہوگا نا۔" وہ اخبار کی تلاش میں اٹھ کر سائیڈ بورڈ تک جاتے ہوئے جس لاپروائی سے کہہ رہی تھی' نگینہ کے دل کو مزید ٹھیس لگنے کا سبب بنا تھا۔

"تو کوٹھی بیچنی ضروری ہے کیا؟ ادھر ادھر تھوڑا سا بھی کام کر کے پیسے چکائے جاسکتے ہیں۔"

"کیسے کام مثلاً"؟" وہ اخبار لے کر پھر سامنے آبیٹھی۔ "وہ جو خالہ گلناز' الماس سے کروا رہی ہیں؟ تو پھر شروع سے ہی یہ ہیروئین بننے کا سبق کیوں پڑھایا تھا آپ نے؟ ادھر ادھر کچھ بھی دیکھنے نہیں دیا۔ پڑھ لیتی' کچھ اور کر لیتی' بیوٹیشن' ڈریس ڈیزائننگ' ٹی وی۔ مگر آپ پر تو صرف اپنے خوابوں کی تکمیل کا جنون تھا۔ خود ساری زندگی ناکام رہیں سو مجھے داؤ پر لگا دیا۔ سوچے سمجھے بنا کہ میں اتنا بوجھ اٹھا پاؤں گی یا نہیں۔" اس کی آواز دھیمی تھی مگر لہجہ اتنا ہی تلخ۔

اپنی ساری ناکامی کا ذمہ دار اب وہ صرف اور صرف نگینہ کو ٹھہراتی تھی۔

بالی کی کمینگی' اپنا قطعی نان پروفیشنل رویہ' لو بجٹ کی فلمیں' سب ہی کچھ پس پشت۔

"کیا ہوا' پھر تم دونوں کی بحث شروع ہو گئی؟" نانی ستارہ قریب آچکی تھیں اور ان کے لیے اب یہ تکرار معمول کی بات تھی۔

نگینہ نے ذرا سا رخ موڑ کر اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ سب ہی کچھ کتنا سطحی اور سرسری سا ہو کر رہ گیا تھا۔

"آپ کس سے بات کر رہی تھیں؟"

"یوسف کمال سے۔" سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے نانی ستارہ نے بڑا اطمینان بھرا جواب دیا تھا۔

نگینہ افسردگی سے مسکرادی۔

"بھلا وہ کیوں بھولتی ہے کہ اماں کی دلی خوشی آج بھی فیروزہ اور اس کے متعلقین کے ساتھ ہی جڑی ہے۔"

اس کا مزید کچھ پوچھنے کا قطعی ارادہ نہیں تھا' لیکن نانی ستارہ ازخود کچھ بتانے کے لیے بے تاب تھیں۔

"خیام کو اب تک ڈھونڈ نہیں سکا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ روزانہ اس سڑک پر کئی بار گیا ہے' جہاں اسے دیکھا تھا' مگر وہ وہاں پھر نظر نہیں آیا۔"

وہ بات کرتے کرتے ذرا رکیں۔

"یوں ہی ڈھونڈتا رہے ساری عمر اور نہ مل کر دے اسے خیام۔ دونوں ہی خوار پھریں۔" نگینہ نے بمشکل ہی ہونٹوں پر آئی بات کو روکا تھا۔

صندل ہر بات سے بے نیاز شام کا اخبار کھولے گم تھی۔

"اب وہ خیام کی تصویر اخبار میں چھپوانا چاہ رہا ہے۔ اس کی اجازت مانگ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ یہی ایک آخری طریقہ ہے اسے ڈھونڈنے کا۔"

اس بار نگینہ سے نہ رہا گیا۔ "جب فیروزہ کو بھگا کر لے گیا تھا' اس وقت تو آپ کی اجازت ضروری نہیں سمجھی تھی دونوں نے۔ اب کہاں سے خیال آگیا..... اور یہ تصویر کہاں سے آئی اس کے پاس خیام کی..... آپ نے دی تھی؟"

غصہ' جلن' تفتیش' سوال' جواب' سب ہی کچھ..... اور وہ اس کی ساری کڑواہٹ کو جھیلنے کی عادی تھیں۔

"تصویر میں نے ہی دی تھی خیام کی' لیکن منع کیا تھا اخبار میں دینے سے۔ اگر وہ ملنا نہیں چاہتا تو پھر اس کی مشکلات کو بڑھانا اچھا نہیں ہے۔ مگر اب یوسف کی یہی مرضی ہے تو......"

"وہ آپ سے، ہم سے بھاگا ہے۔ اپنے کروڑپتی باپ کے پاس تو ہاتھ جوڑ کر جائے گا۔ تصویر چھپنے دیں' چوبیس گھنٹے بھی نہیں لگیں گے خیام کے آنے میں۔" نگینہ کو ایک دم ہی بہت زور کا غصہ آنے لگا تھا۔

"ہم سے نسبت میں اسے ذلت ہے' آپ کیوں بھولتی ہیں یہ بات بار بار؟ دفع کردیں اس قصے کو۔ الگ ہو جائیں آپ۔ وہ جانے اس کا باپ جانے۔ ہمارا کیا لینا دینا ہے۔ یہاں اپنے ہی مسئلے ختم نہیں ہوتے ہیں۔" اس کی قدرے اونچی آواز نے قریب بیٹھی صندل کو ڈسٹرب کیا تھا۔

"کیا مصیبت ہے' آدمی کچھ بھی سکون سے نہیں کر سکتا یہاں۔" وہ اپنا اخبار سمیٹتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں نے یہاں کا لینڈ لائن نمبر بھی دیا ہے اسٹیٹ ایجنٹ کو۔ اگر فون آئے تو دیکھ لیجیے گا۔ مجھے جلدی سودا کرنا ہے.... بہت جلدی۔"

وہ کہتی ہوئی ان دونوں کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔

نانی ستارہ اور نگینہ دونوں ہی نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

انیکسی کے ٹھنڈے صاف فرش پر وہ ننگے پیر چلتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیوں تک آئی۔

یہ گھر بہت بڑا تھا۔

بڑے سے رقبے پر پھیلا لان' پھر تین منزلوں پر مشتمل رہائشی حصہ' کتنے ہی سرونٹ کوارٹر۔ سفید ماربل سے بنا ہوا محرابوں والا الگ تھلگ دکھائی دیتا برآمدہ۔ جہاں سے ایک زمانے میں اس کی بھابھی سعیدہ اور خالہ بتول بھی خیرات لینے آتی تھیں۔

چاند کی پہلی جمعرات کا یہ معمول اب بھی بندھا ہوا تھا' مگر اسے یہاں آئے ہوئے ابھی صرف تین دن ہوئے تھے اور چاند کی پہلی جمعرات اس کے آنے سے چند دن پہلے گزر چکی تھی۔ سو اس رونق کو دیکھنے کے لیے اسے انتظار کرنا تھا۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر زری نے برآمدے کی دیوار کے ساتھ سر ٹکایا۔ دیوار پر پھیلی پھولوں کی بیل پر سے پانی کے چند قطرے اس کے چہرے پر گرے۔

ایک سکون بھری مسکراہٹ نے پل بھر کے لیے زری کے چہرے کو چھوا۔ ماحول بدلا' زندگی بدلی' وہ خود ساری کی ساری بدل گئی۔

ہوتا ہے کوئی پل' ایسا بھید بھرا' جو خود پر بھی ذات کے نئے در وا کرتا چلا جاتا ہے۔

ایک نئے انسان سے ملاقات کرواتا ہے۔

ایسا ہی پل اس کی زندگی میں بھی معاذ کی وساطت سے آیا۔ جب اس نے پانے کے بجائے دینے کے لطف کو جانا۔

آج معاذ کے چہرے پر پھیلی خوشی اور اطمینان کا سبب وہ بنی ہے' سو یہ خوش بختی بھی کیا کم ہے۔ یک طرفہ محبت کے عذاب کو جی بھر کر سہہ لینے کے بعد بالآخر وہ سرخرو ہوئی۔

"زری!" راجو نے پیچھے سے آکر اس کے کندھے کو چھوا تو وہ اس کی طرف مڑ گئی۔

"ابھی میری اماں سے بات ہوئی ہے۔ بہت بے تابی سے وہاں گاؤں میں ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔ ولیمہ کی بڑی دعوت رکھی ہے۔" وہ نرم لہجے میں بتانے لگا۔

"اچھا! پھر آپ نے کیا کہا؟" محض اس کا دل رکھنے کے لیے اس نے راجو کی کسی بات میں پوری دلچسپی ظاہر کی۔

"میں نے کہا کہ ابھی ہمیں دو یا تین ہفتے لگ جائیں گے۔ سالار بھائی سے پوچھ کر ہی پروگرام فائنل ہوگا نا۔"

"یہ تو ہے۔" وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ "اور کیا کہہ رہی تھیں آپ کی امی.... میرا پوچھا تھا؟"

"تمہارا ہی پوچھتی رہیں۔" وہ ہلکے سے مسکرا کر اس کے قریب بیٹھا۔ "میں نے کہا' ابھی صبح تو اتنی دیر آپ بات کر چکی ہیں زری سے' پھر بھی دل نہیں بھرا آپ کا۔"

"آپ کو ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ وہ ماں ہیں اور میری خوش قسمتی ہے کہ وہ مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد مجھے فون ملا کر دیجیے گا' میں خود بات کروں گی ان سے۔"

اس بار اس نے محض راجو کو خوش کرنے کے لیے نہیں' بلکہ پورے دل سے کہا تھا۔

راجو نے دانستہ ذرا سا رخ موڑا تھا۔

زری نے اس کی پھیکی پڑتی مسکراہٹ کو بخوبی نوٹ کیا تھا۔

"کیا ہوا؟ میں نے کچھ غلط کہہ دیا کیا؟"

"نہیں تو!" اس نے پھر سے مسکرا کر زری کو مطمئن کرنا چاہا۔ مگر اس کی آنکھوں میں بڑی گہری اداسی تھی۔

زری نے ایک ٹھنڈی سانس اپنے اندر اتاری۔ وہ خوش نہیں تھا۔ صرف خوش رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ۔ دونوں ہی نارسائی کا دکھ جھیل کر یہاں تک پہنچے تھے۔ لیکن وہ راجو سے کہیں زیادہ خوش قسمت تھی۔ یہ بالکل طے تھا۔

"تم بہت اچھی ہو زری! مجھے یقین ہے کہ تم اماں کا دل پوری طرح جیت لوگی۔ وہ ابھی اتنی خوش ہیں۔ تم سے مل لینے کے بعد تو...... مجھے نہیں پتا کہ وہ تمہیں کتنے عرصے واپس نہیں آنے دیں گی۔"

وہ دھیمے دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا اور اس کی نگاہ دور سبزے پر جمی ہوئی تھی۔

"میں ان کے پاس بہت خوشی سے رہوں گی' اگر آپ اجازت دیں گے۔"

راجو نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

زری کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔

وہ بے اختیار ہی اسے دیکھے گیا۔

اس کی باتوں میں کہیں کہیں روزی کی جھلک سی دکھائی دیتی تھی۔ خاص طور پر جب وہ اماں کے پاس جاکر رہنے کا اشتیاق ظاہر کرتی تھی۔ ویسی ہی سادگی اور محرومی۔

زری نے اس کی خود پر جمی نظر سے ہی بچ کر نگاہ جھکائی تھی۔

"تم رک جانا' مجھے تو آنا پڑے گا نا!"

"کیوں' سالار بھائی لمبی چھٹی نہیں دیں گے نا؟"

"وہ ایسا کیوں کریں گے؟" راجو افسردگی سے مسکرایا۔ "پتا ہے انہوں نے تو مجھے یہ تک کہہ رکھا ہے کہ اگر میں وہاں گاؤں میں رہنا چاہوں تو کچھ بھی کاروبار یا زمین لے کر دے سکتے ہیں' مگر میں نے صاف منع کردیا ہے۔ میں انہیں چھوڑ کر اب دنیا کے کسی بھی دوسرے حصے میں نہیں رہ سکتا...... خدا انہیں سلامت رکھے بس......!"

کی آواز دھیمی پڑی تھی‘ مگر لہجہ محبت اور وفاداری کی انتہا کو چھوتا ہوا تھا۔ زری کے دل پر محبت کی ایک اور
ی۔

”خلوص‘ وفا‘ محبت‘ سچائی۔“

زندگی کے اس نئے سفر میں‘ وہ ان سب خوب صورت الفاظ کے حقیقی معنوں کو جاننے کے بہت سے مواقع حاصل کرنے والی تھی۔

”نبیل شاید آج کل میں آنے والا ہے‘ ویسے تو وہ اس طرف کبھی نہیں آتا ہے‘ لیکن پھر بھی اگر تمہارا اس سے سامنا ہو جائے تو......“

”اف!“ زری نے بے اختیار ہی ماتھے کو چھوا۔ ”میں آپ سے کتنی بار کہوں کہ اس شخص سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مر چکا ہے وہ بہت سال پہلے اور جانتے ہیں آپ اس کی ہر ذلالت کو۔ سولہ سال کی تھی میں صرف‘ جب سے وہ مجھے فروخت کرنے کی فکر میں رہا ہے۔ دوست تھا آخر کسی زمانے میں آپ کا۔ پتا نہیں ہے کیا آپ کو؟“

دکھ اور کوفت سے اس کی آنکھوں میں اس بار آنسو آ چکے تھے۔ پچھلے تین دنوں سے نبیل کا نام بار بار ان کے درمیان آ رہا تھا...... راجو کے بہت تحفظات تھے اس بارے میں...... راجو نے ہلکے سے اس کا ہاتھ تھاما۔

”میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا زری! لیکن نبیل بہرحال تمہارا بھائی ہے اور اب وہ بہت‘ بہت برا آدمی ہے۔ تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر تو پتا نہیں کس طرح پیش آئے گا۔ پہلے ہی وہ مجھ سے سخت نفرت کرتا ہے اب۔“

آخری جملہ کہتے ہوئے اس کی آواز پھر سے دھیمی ہوئی۔

”اور وہ خود کتنا قابل نفرت ہے‘ پتا ہے نا آپ کو؟“ زری کا لہجہ مضبوط اور صاف تھا۔ ہمت دلانے والا۔ راجو کی اداس آنکھیں زری کے چہرے پر جم سی گئیں۔

”اگر سالار بھائی نے مجھے مکمل تباہی سے نہ بچایا ہوتا زری! تو یقین مانو کہ میں اسے قتل کر چکا ہوتا۔“

زری یوں ہی اس کی طرف دیکھے گئی۔

”شاید اسے برا لگا ہو۔“ راجو کے دل میں ابھی بھی ہلکی سی چبھن ابھری تھی‘ مگر زری کا چہرہ بے تاثر تھا۔

”وہ اس سے بھی بدتر انجام کا مستحق ہے اور وہ اس تک ضرور پہنچے گا۔ یقین رکھیے آپ۔“ راجو کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے راجو کے دل سے یہ آخری خدشہ بھی مٹایا۔

راجو نے ایک سکون بھرا سانس لیا۔

”آپ مجھے روزی کے بارے میں بتائیں! میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ کتنی محبت کرتی تھی آپ سے‘ میں اس جیسی نہ سہی‘ لیکن آپ سے اس کا ہر دکھ بانٹنا چاہتی ہوں......“

زری کی مہربان آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔

راجو نے بے اختیار ہی اپنا دوسرا ہاتھ بھی اس کے ہاتھ پر رکھا۔

زری صرف پاس نہیں‘ ساتھ بھی تھی اور کتنی عجیب سی بات تھی کہ اس سے شادی کرتے وقت ایک بار بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ محبت کا ہنر بھی ساتھ لے کر آنے والی ہے۔

☼ ☼ ☼

نیچے جویا اور زویا‘ شاکرہ امی کو ٹیکسی سے اتار رہی تھیں۔ آپا گل نے اوپر سے جھانکتے ہوئے شکر کا کلمہ پڑھا۔

”اور جو یہ لوگ مارے شوق کے آج بھی اسپتال میں رکنے کا ارادہ کرتیں تو سارا پروگرام ہی برباد ہو جانا تھا۔“ انہوں نے مڑ کر اپنے پیچھے کھڑے سلمان سے کہا۔

جویا اور زویا ساتھ گئے سامان اور شاکرہ امی‘ دونوں کو سنبھال کر اوپر آ چکی تھیں۔

”حد کر دی آپ لوگوں نے بھی۔ پورے تین دن لگا دیے۔ اسپتال تھا یا کوئی تفریح گاہ‘ جہاں سے واپس آنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا؟“ وہ بولتی ہوئی شاکرہ امی کے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

اور ان کی اس احمقانہ شکایت کا جواب دینا کسی نے بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔

شاکرہ امی کا کمرہ حیرت انگیز طور پر صاف ستھرا تھا۔ نئی بیڈ شیٹ‘ دل لگا کر کی گئی صفائی‘ سامنے دھلا دھلایا صحن اور......

جویا اور زویا دونوں نے شاید ساتھ ہی نوٹ کیا تھا۔

”نیچے والوں کی ساس کو بلا کر صفائی کروائی ہے‘ پیسے بھی دیے۔“ آپا گل نے بتانے میں دیر نہیں کی۔ ”ورنہ تین دن سے تو خاک اڑ رہی تھی۔ وہ حال تھا گھر کا کہ پوچھو مت۔“

ابھی تک ایک بار بھی انہوں نے شاکرہ امی کی خیریت دریافت نہیں کی تھی اور سلمان اسپتال سے لائے ہوئے بچے ہوئے پھل‘ باسکٹ سے نکال کر کھانے میں مصروف ہو چکا تھا۔

”کتنے دن بعد اس گھر میں پھل چکھنے کو ملے ہیں۔“

”اب یہاں کچرا پھیلانا مت شروع کرو‘ شام میں مہمان آنے ہیں۔“

”شام!“ چیزیں سمیٹتی ہوئی جویا کی نگاہ سامنے گھڑی پر گئی۔ پونے چار ہونے کو تھے۔

”کون آ رہا ہے؟“ شاکرہ امی نے نیم دراز ہوتے ہوئے یوں ہی بے توجہی سے پوچھا۔

”فریدالدین اور اس کی دو بہنیں۔ مٹھائی وغیرہ لے کر آئیں گے۔ روز فون کر رہے ہیں بے چارے‘ ورنہ اب اتنی چاہت سے کون ملتا ہے۔ حالانکہ ہم نے تو پلٹ کر انہیں گھر آنے کی دعوت بھی نہیں دی تھی۔ مگر اتنے بااخلاق کہ ذرا جو شکایت کا لفظ بھی زبان پر لائے ہوں۔ آج بھی سختی سے کھانے کا منع کیا ہے۔ بس ایک کپ چائے ہی پئیں گے۔“

کمرے میں موجود وہ سب لوگ بالکل الگ الگ کیفیت سے گزرے تھے۔

زویا کی نگاہ جویا پر جمی تھی۔

اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ چیزیں سمیٹتے ہوئے اس کا ہاتھ صرف ایک لمحے کے لیے رکا تھا اور دوسرے ہی پل وہ انہیں لے کر شاکرہ امی کی الماری کی طرف مڑ گئی تھی۔

”سو یہ تھی آج کی کارگزاری کی وجہ۔“ زویا نے جواب تک ان کے احساس ذمہ داری پر حیران تھی۔ ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”مجھ سے پوچھے بغیر کیوں بلایا تم نے انہیں؟“ شاکرہ امی کی نگاہ آپا گل پر تھی۔

”کیوں؟ کیا حرج ہے؟ بلانا تو تھا نا...... اور ایسے کاموں میں دیر کرنا مناسب بھی نہیں ہے۔ پہلے ہی خاصا وقت نکل گیا ہے۔“ آپا گل کے لہجے میں رکھائی اتری۔

جویا نے ٹھنڈے پڑتے ہاتھ پاؤں کے ساتھ الماری میں ہی منہ دیے رکھنے میں عافیت سمجھی تھی۔

کمرے میں چند لمحوں کا سناٹا پڑا۔

”مجھے یہ رشتہ پسند نہیں ہے۔ میں جویا کی شادی فریدالدین سے نہیں کروں گی۔“ باوجود کمزوری کے شاکرہ امی کا لہجہ صاف اور آواز قدرے بلند تھی۔

جویا نے بے اختیار ہی الماری کے پٹ کو تھاما۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے امی! آرام کریں۔ بے کار کی جذباتیت اچھی نہیں ہے آپ کے لیے۔

فریدالدین سے اچھا رشتہ ہمیں نہیں مل سکتا۔ ہمارے مسائل کا واحد حل ہے وہ اور اب تو بات طے بھی ہو چکی ہے۔ خدا کے لیے بدشگونی کی باتیں مت شروع کر دیں۔"

آپا گل بری طرح تلملائی تھیں۔ مگر شاکرہ امی ذرا بھی خائف نہ ہوئیں۔

"میری اجازت کے بغیر کوئی بھی جویا کا رشتہ طے نہیں کر سکتا۔ تم ابھی فون کر کے منع کرو انہیں کہ وہ یہاں نہ آئیں یا پھر مجھے فون دو' میں خود منع کر دیتی ہوں۔"

آپا گل اور سلمان' دونوں کے ماتھے پر شکن گہری ہوئی۔

"اب بنی بنائی بات کو خراب مت کریں۔ اتنی مشکل سے سب کچھ سیٹ ہوا ہے۔ یہاں تو پتا نہیں کب عقل آئی ہے۔ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ فقیروں سے بدتر حالت ہو چکی ہے۔"

"تو آپ کو کس نے کہا ہے کہ ہماری حالت کو بدلیں؟"

آپا گل' سلمان اور زویا تینوں نے ایک ساتھ زور زور سے بولنا شروع کر دیا تھا۔ جویا ان ہی آوازوں کے بیچ میں سے گزرتی ہوئی تیزی سے باہر نکل آئی۔ اس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا اور چہرہ آنسوؤں سے تر.....

کانپتے ہوئے قدموں سے وہ اپنے کمرے تک آئی تھی۔ پیچھے سے آتی آوازیں' کمرے کا دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی خاموش ہوئی تھیں۔ جویا نے ایک گہری سانس لے کر خود کو سنبھالنا چاہا' مگر..... ہچکیوں سے اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے' بڑی مدت بعد وہ بری طرح روتی رہی' مگر اپنی بدنصیبی پر نہیں۔

آج دل پر ایک عجیب ہی ڈھنگ سے ضرب پڑی تھی..... شاکرہ امی کے حمایت میں کہے جملے' ان کے پچھلے سارے رویے پر بھاری پڑے تھے۔

وہ اس کی بھی ماں تھیں۔ صرف سلمان اور آپا گل کی نہیں۔ درد بھری حیرت میں ڈوبی' وہ ان کے کہے جملوں کی بازگشت میں گھری تھی۔

اپنی بیماری' کمزوری کے باوجود وہ آج اس کی خاطر آپا گل اور سلمان کے آگے کھڑی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان دونوں کے آگے' کسی کی بھی بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مگر وہ ماں ہونے کا حق ادا کر رہی تھیں۔

جویا کا شدت سے دل چاہا کہ وہ جا کر ان کے قدموں میں سر رکھ دے۔ اب انجام کار جو بھی ہو' ماں کی طرف سے دل سے ہر ان کہا گلہ مٹا تھا۔

باہر ایک دم ہی کچھ ہلچل سی شروع ہوئی تھی۔ مگر وہ یوں ہی ساکت بیٹھی رہی تب ہی کمرے کا دروازہ کھول کر زویا اندر آئی۔ اسے اس طرح بے بس سا زمین پر بیٹھا دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے بے اختیار ٹھٹکی۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ اٹھو شاباش!" وہ اس کو سہارا دیتے ہوئے بیڈ تک لائی۔ جویا نے اپنا چہرہ دوپٹے سے خشک کیا۔

"کیا فائدہ اس طرح رونے سے؟ کچھ بدل تو نہیں جائے گا؟ اور وہ لوگ کب کسی کے آنسوؤں کی پروا کرنے والے ہیں۔ اب تک رو کر کچھ ملا ہے' جواب....." زویا کا لہجہ تلخ ہو رہا تھا۔

"کاش! امی نے یہی سب کچھ بہت پہلے سمجھ لیا ہوتا۔ اب تو وہ نہ ان کی بات کو ویلیو دینے کے لیے تیار ہیں اور....."

"وہ لوگ آ گئے ہیں!" آپا گل نے ادھ کھلے دروازے میں سے جھانک کر اطلاع دی۔ "اپنے حلیے درست کرو دونوں..... اور زویا! تم آ کر چائے کا بندوبست شروع کرو۔ وہ لوگ بس تھوڑی سی دیر ہی رکیں گے۔"

وہ اب بالکل پرسکون تھیں۔ گویا جو کچھ وہ چاہ رہی تھیں' سب کچھ ویسا ہی ہوتے جا رہا تھا۔

جویا یوں ہی چپ چاپ ساکت بیٹھی رہی۔

"ان لوگوں کے سامنے کوئی الٹی سیدھی حرکت مت کرنا جویا! یہ میں تم سے صاف کہہ رہی ہوں۔ امی ابھی سمجھ نہیں رہی ہیں' لیکن بہت جلد وہ اس فیصلے پر' بہت خوشی اور اطمینان محسوس کریں گی اور تم بھی..... سن رہی ہو نا میری بات؟"

جویا کے بے تاثر چہرے نے انہیں ہمیشہ کی طرح کوفت میں مبتلا کیا تھا' مگر وہ اتنی جلدی میں تھیں کہ مزید رک کر اپنا دل بھی نہیں جلا سکتی تھیں۔

دروازہ ہلکی سی آواز میں بند ہوا تھا۔

زویا نے رحم بھری نگاہوں سے جویا کو دیکھا۔

پتا نہیں وہ کیا سوچ رہی ہے۔

ایک دکھ بھرا اندازہ' اب بعد از وقت تھا۔

"کل یہ لوگ' ابو سے ملنے گئے تھے سلمان بھائی اور آپا گل دونوں۔"

جویا کی حیرت بھری نگاہ اٹھی اور زویا کے چہرے پر جم گئی۔ اس طویل عرصے میں یہ پہلا اتفاق تھا۔

"فریدالدین بھی ساتھ گیا تھا۔" زویا نے اس سے نگاہ چراتے ہوئے بات کو تھوڑا سا اور آگے بڑھایا۔ "ابو نے اس رشتے کے لیے اپنی سو فیصد منظوری دے دی ہے۔"

آخری جملہ تیزی سے مکمل کر کے اس نے ایک گہری سانس لی تھی۔ خیال تھا کہ اس مکمل بربادی کی خبر پر اس کی طرف سے کچھ تو رد عمل ہو گا' مگر وہاں ایسا کچھ نہ تھا۔

مکمل بربادی کا قصہ کہیں پہلے ہی تمام ہو چکا تھا۔

"تم اب بھی کچھ نہیں کہو گی؟"

"کہا تو ہے امی نے' شاید وہ انہیں روک سکیں۔" جویا کی آواز نیچی اور سہمی ہوئی تھی۔

زویا نے بے ساختہ ماتھے کو چھوا "کیا تم اتنی احمق ہو جویا کہ اب بھی آنکھیں بند کیے ہی بیٹھی رہو گی' کس کا انتظار کر رہی ہو' جو تمہارے لیے کچھ کرنے کے لیے آئے گا....." کسی کا حوالہ آج بھی ناقابل برداشت تھا۔

"میں کسی کا انتظار نہیں کر رہی ہوں۔ پتا ہے تمہیں۔" اس نے بہت تیزی سے زویا کی بات کاٹی تھی۔ "لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتی' ساری زندگی بھی نہیں۔ لیکن اگر امی کہتیں تو میں نے ان کی خاطر ہر بات کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

اس کے لہجے کا دبا دبا سا غصہ' اجنبی سا لگ رہا تھا۔ اتنے سال سے اب وہ ایک سی بے حسی کے ساتھ زندگی گزارنے کی عادی ہو چکی تھی۔

"زویا' زویا!" باہر سے زویا کے نام کی آواز پڑنی شروع ہو گئی تھی۔

اس نے الجھن بھرے انداز میں جویا کی طرف دیکھا۔

تب ہی ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر آپا گل اور دو نئی شکلوں کی خواتین اور کچھ بچے اندر چلے آئے۔ چھوٹا سا کمرہ ایک دم ہی بھر گیا۔

ہنسی' قہقہے' اشتیاق۔

سب نے اسے ایک دم گھیرا تھا' چھوٹے سے بیڈ پر جگہ بھی باقی نہیں رہی تھی' کسی نے آنا" فانا" ایک گلابی جھلملاتا دوپٹہ جویا کے سر پر ڈالا تھا اور گلاب جامن جیسے زبردستی اس کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کی تھی۔

"ماشاء اللہ کتنی پیاری ہے۔"

"فرید بھائی تو بہت ہی خوش قسمت ہیں......"
"دیر آید درست آید۔ انتظار کیا تو اس کا صلہ بھی تو انہیں مل گیا......" وہ سب ایک ساتھ بول رہی تھیں۔
"مبارک ہو، بہت بہت!" جویا نے آپا گل کی خوشی سے کھنکتی ہوئی آواز پر نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھنا چاہا مگر آنسوؤں کے تسلسل نے سامنے کا منظر دھندلا دیا تھا۔



یوسف کمال نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر ہاتھ کو تھاما ہوا فوٹو سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔
ان کا موبائل بج رہا تھا۔ آفس سے کسی کا فون تھا وہ فون ریسیو کرتے ہوئے اسٹڈی سے ملحقہ بالکونی میں آ کھڑے ہوئے۔
جب سے لاہور سے آئے تھے کاروباری معاملات میں دلچسپی کم سے کم ہوتی جا رہی تھی۔ مینجمنٹ میں پرانے لوگ تھے اور ان کے سارے آفس پوری طرح سیٹل بھی تھے۔ مگر پھر بھی ساری زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ ان کی عدم دلچسپی ہر ایک کو حیران کر رہی تھی۔
فون بند کر کے بھی وہ خاصی دیر وہیں کھڑے رہے تیزی سے گزرتا وقت مایوسی میں بھی اضافہ کر رہا تھا اور وسوسوں میں بھی۔
اس بے محابا پھیلے پرہنگام شہر میں خیام کو ڈھونڈنا اب تک ایسا ہی تھا جیسے صحرا میں سوئی تلاش کرنا۔
مگر اب پھر سے امید بندھی تھی۔
وہ کسی کو فون ملانے لگے تھے کہ انہوں نے پیچھے سے زوبیہ کی آواز سنی۔
"ڈیڈی!" وہ واپس اندر آئے تو وہ انہیں کمرے کے وسط میں کھڑی دکھائی دی۔ "آج آپ نے ناشتہ بھی نہیں کیا اور اب لنچ کا وقت ہو رہا ہے۔ آپ اسٹڈی سے باہر ہی نہیں آئے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"
وقت گزرنے کے ساتھ وہ پرسکون اور خاصی بدلی بدلی سی محسوس ہوتی تھی۔ غصہ، بے چینی، تلخی، سب ہی سلمان کے ساتھ رشتے کے خاتمہ پر آہستہ آہستہ اس کی ذات سے الگ ہوئے تھے۔
"میں ٹھیک ہوں بیٹا! کچھ کام ہیں ضروری وہی کر رہا ہوں۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر کو تھپتھپایا۔
زوبیہ کی زندگی میں آئی تلخیوں کے ذمہ دار کہیں نہ کہیں وہ بھی تھے...... یہ ماننے میں بھی اب کوئی تامل نہیں تھا۔ ایک کامیاب ترین بزنس مین مگر ناکام ترین ذاتی زندگی۔
"ٹھیک ہے پھر میں آپ کے لیے کچھ بھجواتی ہوں بلکہ خود ہی لے آتی ہوں!" وہ کہتے ہوئے مڑنے لگی تب ہی اس کی نگاہ سائیڈ ٹیبل پر رکھی خیام کی فوٹو پر پڑی۔
"یہ کون ہے؟" زوبیہ نے بڑی دلچسپی سے اس کی تصویر کو دیکھا۔ "بہت خوب صورت لڑکا ہے ڈیڈی! ورنہ عام طور پر لڑکے اتنی اچھی شکلوں کے ہوتے نہیں ہیں۔ مگر یہ تو پورا ہیرو ہے۔"
وہ افسردگی سے مسکرا دیے۔
زندگی کی ساری ٹھوکروں کے باوجود زوبیہ کی جمالیاتی حس آج بھی برقرار تھی۔ خوب صورتی کو سراہنے والی فطرت اس نے سو فیصد ان سے ہی لی تھی۔
"کون ہے، بتائیے نا؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ بالکل نہیں اندازہ لگا سکتے تھے کہ زوبیہ خیام کے بارے میں جان کر کیسا ری ایکٹ کرے گی، مگر اب اس سوال کو وہ ٹالنا بھی نہیں چاہتے تھے۔
"یہ خیام ہے...... تمہارا چھوٹا بھائی!"

زوبیہ کے لب حیرت سے تھوڑے سے کھلے تھے اور صاف ظاہر تھا کہ یہ ایک بالکل غیر متوقع اطلاع تھی

"فیروزہ آنٹی کا بیٹا..... یہ وہی ہے کیا؟"

ماضی کے اس رشتے کے بارے میں وہ اپنی ماں سے اتنی بار سن چکی تھی کہ خود بخود صحیح نتیجے پر پہنچی۔

یوسف کمال نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"ممی ہمیشہ کہتی تھیں کہ آپ کی اولاد ہے ان سے، مگر مجھے کبھی یقین نہیں آتا تھا۔ اس لیے کہ مجھے لگتا تھا کہ اگر کوئی ہوتا تو وہ کبھی نہ کبھی تو سامنے بھی آتا اور پھر آپ اپنی اولاد کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں بھلا، کوئی بھی نہیں چھوڑ سکتا۔"

زوبیہ کے لہجے میں افسردگی سی تھی۔ اس نے غصے، ناراضی کے بجائے، ایک شفاف سا تجزیہ کرتے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"ہوتے ہیں کچھ بد نصیب میری طرح بھی زوبی..... میں ڈر گیا تھا، تمہاری ماں کا اور میرا خاندان، دونوں ہی اسے قبول کرنے سے انکار کر چکے تھے..... حالانکہ زرتاج کی تو میں نے بہت خوشامد کی تھی..... کہ وہ اسے رکھ لے، مگر ایک چار سال کا بچہ اتنے بڑے گھروں میں کہیں بھی ذرا سی جگہ نہیں پا سکا۔"

ایک عمر کا دکھ پہلی بار کسی اپنے کے ساتھ شیئر ہوا تھا۔ مگر وہ انہیں غلطی کا مارجن دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"زرتاج آنٹی یا کسی کی بھی کوئی غلطی نہیں ہے ڈیڈی! قصور وار صرف آپ ہیں۔ وہ بچہ آپ کا تھا، ان میں سے کسی کو اس سے کیوں ہمدردی ہوگی، جب سگا باپ اس کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہیں۔ نہ رکھتے آپ اسے گھر میں، کسی ہاسٹل میں بھیج دیتے۔ ذرا بڑا ہوتا ملک سے باہر پڑھنے چلا جاتا، سرپرستی تو کرتے کم از کم۔ ظلم تو آپ نے کیا نا اور وہ بھی ناقابل تلافی۔"

"میں تمہاری ماں اور اس کے خاندان سے ہمیشہ ڈرتا رہا ہوں۔ بہت بڑا فساد اٹھانے والے لوگ ہیں یہ اور اسی وجہ سے مجھے زرتاج سے بھی نفرت ہو گئی تھی....."

ایک کمزور سی صفائی۔ جسے زوبیہ نے ذرا سی بھی اہمیت نہیں دی۔

"اب آپ کیا کرنے والے ہیں اس کے ساتھ؟"

"میں اسے واپس لانا چاہتا ہوں، مگر اس فوٹو کے علاوہ کوئی دوسرا سرا نہیں ہے میرے ہاتھ میں۔"

میری ماں، ان کا خاندان، زرتاج آنٹی، وہ سب آج بھی بالکل ویسے ہی ہیں۔"

طنزیہ انداز میں اس نے انہیں جتایا تھا، مگر انہیں ذرا بھی برا نہیں لگا۔

"میں اب کسی کی پروا نہیں کرتا۔ مجھے اسے واپس لانا ہے، کسی بھی طرح، چاہے وہ مجھ سے کتنی بھی نفرت کرتا ہو مگر میں اب اسے اتنی بڑی دنیا میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ بہت مظلوم بچہ ہے۔"

"جس وقت وہ چار سال کا تھا، اس وقت سے زیادہ بے بسی اور کیا ہوگی۔" زوبیہ کی آواز میں نمی آنے لگی تھی، بات ادھوری چھوڑ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

ادھ کھلے دروازے سے جب تک وہ دکھائی دی، یوسف کمال اسے دیکھے گئے۔

آج شاید پہلی بار وہ اپنے علاوہ کسی اور کے لیے دکھی ہوئی تھی۔

"خون کی کشش تھی یا پھر.....؟"

کوئی دوسرا جواز، فوری طور پر ذہن میں بھی نہیں آیا تھا۔ مگر یہ دکھ بھری خوشی دل پر سے تھوڑا سا بوجھ کم کر رہی

تھی۔

وہ اپنے سب سے ضروری کام کی طرف پلٹے۔

✻ ✻ ✻

معاذ گھر پر ہی تھا، جب اسے یوسف کمال کی وہ "بہت ضروری" کال ملی تھی۔

"معاذ! کسی کو ڈھونڈنے میں تمہاری مدد چاہیے۔ ایک اشتہار دلوانا ہے گمشدگی کا۔ جہاں جہاں بہتر سمجھتے ہو چلوا دو..... تم اور اسلام صاحب دونوں کا میڈیا پر خاصا اثر ہے، یہ کام جلد سے جلد ہو سکتا ہے، کہو تو میں ابھی آجاؤں تمہارے پاس۔"

بنا کسی تمہید کے وہ اصل موضوع پر آگئے تھے۔ سالار کی وساطت سے وہ اسے جتنا جان چکے تھے، انہیں پورا یقین تھا کہ معاذ ہی ان کے اس مسئلے کو حل کرنے میں سب سے زیادہ معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

مگر اس وقت.....

معاذ نے ایک نگاہ گھر پر پھیلی افراتفری پر ڈالی۔

"ابا کے آسٹریلیا والے دیرینہ دوست آج بمعہ فیملی یہاں مدعو تھے۔ رات کے کھانے پر، اور ربیعہ کے ان کے بیٹے سے رشتے کی بات باضابطہ طور پر آپس میں ہونی تھی۔ سو شام تک نمٹائے جانے کے لیے ایک لمبی کاموں کی لسٹ اس کے پاس باقی تھی۔

مختصر ترین لفظوں میں اس نے انہیں اپنی مجبوری بتائی۔

"مگر آپ ایسا کریں کہ وہ تصویر اور دیگر جو کچھ بھی آپ جانتے ہوں، ایک پیپر پر لکھ کر ڈرائیور کے ہاتھ اسکول بھجوا دیں۔ میں کسی بھی وقت وہاں سے لے لوں گا۔ بالکل فکر مت کریں۔ سمجھیں، یہ کام ہو گیا....."

لوگوں کو مایوس کرنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ فون کے دوسرے سرے پر موجود یوسف کمال نے بڑا گہرا اطمینان محسوس کیا تھا۔

معاذ نے وہیں کھڑے کھڑے ایک مختصر میسج خیام کو اس بارے میں کیا اور تیزی سے اندر آیا۔

اس کا والٹ وہیں بڑے کمرے میں رہ گیا تھا۔

دادی آج اپنا کمرہ چھوڑ کر وہیں بیٹھی تھیں اور پہلے زری کی بخیر و خوبی شادی اور اب ربیعہ کے لیے خوش امیدی دونوں ہی نے ان کی صحت پر بڑا اچھا اثر ڈالا تھا۔

"تم گئے نہیں ابھی!" اسے آتا دیکھ کر وہ ایک دم ہی خوش ہو گئیں۔ "مجھے کچھ چیزیں اور یاد آگئی تھیں منگوانے کے لیے۔ ذرا لکھ لو۔"

"بتا دیجیے، میرا حافظہ ابھی کام کر رہا ہے اچھا خاصا۔" معاذ نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا تو وہ بھی مسکرا دیں۔

"اللہ لمبی عمر، صحت تندرستی دے۔"

"لمبی عمر....." محض دادی کی دل آزاری کے خیال سے وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔

"سنا ہے کہ ابرار بھائی کی آج کل میں ضمانت ہونے والی ہے۔" امی ابھی ابھی اندر آئی تھیں اور ان کے لہجے کا دبا دبا سا جوش معاذ کے ساتھ دادی کو بھی چونکا گیا تھا۔

"اچھی خبر ہے۔ اللہ اس کی بھی پریشانیاں دور کرے۔ بہت سزا کاٹ لی ہے بے چارے نے، میں تو پانچوں وقت دعا کرتی ہوں اس کے اور اس کے بچوں کے لیے۔" شائستہ امی کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ اتری۔

"اللہ نے شاید آپ ہی کی سنی ہے۔ ان کا اور ان کی اولاد کا بیڑہ پار ہو ہی گیا ہے' سنا ہے بڑا ہی اچھا وکیل ملا ہے انہیں' سارے کیس کو سنبھال لیا ہے۔ جب ہی تو ضمانت کی نوبت آرہی ہے۔" وہ قریب آکر صوفے پر بیٹھیں۔ معاذ ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔

"تم باپ بیٹا خواہ مخواہ میں ہی اتنے فکر مند تھے۔ حالانکہ ابرار بھائی' شاکرہ ہمیشہ سے اپنے کام نکالنا جانتے ہیں۔ اب بھی نکل آئے سارے مسئلوں سے۔" وہ بڑی متضاد سی کیفیت میں تھیں۔

معاذ کو اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ خوش زیادہ ہیں' یا پھر خفا۔

"آپ کو اتنی جلدی کہاں سے اطلاع مل جاتی ہے لوگوں کے بارے میں۔" وہ والٹ اٹھا کر کہتے ہوئے مڑنے لگا تھا۔ تب ہی وہ کچھ برا مان گئیں۔

"میں کسی کی کھوج میں نہیں رہتی ہوں' خاندان پھیلا ہوا ہے سارے شہر میں' ظاہر ہے' ایک دوسرے سے خبر مل ہی جاتی ہے۔ اور لوگ باتیں بنانے سے کب چوکتے ہیں۔ اسی وکیل سے جویا کی شادی ہو رہی ہے۔ سارا خاندان تھو تھو کر رہا ہے کہ بیٹی کو ابرار بھائی نے چارہ بنایا ہے۔"

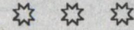
شائستہ بیگم کے لہجے میں ایک بار پھر دل توڑتی حقارت تھی۔

معاذ نے اپنے قدم زمین میں جمتے ہوئے محسوس کیے۔

"کس سے ہو رہی ہے جویا کی شادی؟" دادی نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

"کوئی فریدالدین وکیل ہے۔ اس سے ہو رہی ہے' ابرار بھائی کی ضمانت کے دو چار دن بعد..... میں تو کہتی ہوں اچھا ہے' ہو جائے۔ اس لڑکی کے مقدر میں بھی کوئی نحوست ضرور بندھی ہے۔ جو خوشی راس نہیں آتی اسے' ورنہ زری جیسی بے آسرا لڑکی بھی آج گھر بار والی....."

وہ بے جان قدموں کے ساتھ آکر برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔



کچھ تھا' جو زرتاج کو بری طرح چونکا رہا تھا۔

"پہیلیاں مت بجھواؤ نبیل۔ کیا ہے جو تم کو اتنا بے خوف کر رہا ہے؟" اس کی نگاہ سامنے بیٹھے نبیل پر جمی تھی۔ جو بڑے اطمینان سے صوفے پر نیم دراز ہاتھ میں ریموٹ لیے' چینل پر چینل بدل رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے مخالف وکیل' تمہارے پرخچے اڑانے کے لیے بے تاب ہے۔ لاکھوں روپے خرچ کیے ہیں میں نے اب تک' تمہیں اس کے سامنے آنے سے بچانے کے لیے۔ مگر اب بالکل بھی گنجائش نہیں ہے۔ اوپر سے تم نے کوئی میڈیکل سرٹیفکیٹ بنانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ بھی میں نے ہی....."

ایک ہی سانس میں بولتی ہوئی زرتاج کو اچانک ہی لگا کہ وہ اس کا کہا کوئی ایک لفظ بھی نہیں سن رہا ہے۔ اس کی ساری توجہ ٹی وی پر آتے کسی آئٹم نمبر پر رقص کرتی لڑکی پر تھی۔

پوری شدت کے ساتھ اس نے دانتوں تلے اپنے نچلے لب کو دبایا تھا۔

"بھاڑ میں جائے یہ کیس' نبیل' سامنے چلتا ہوا ٹی وی اور رقص کرتی ہوئی یہ لڑکی۔"

کاش وہ ایک بالکل چھوٹے سے پل میں ان سب کو لات مار کر اس گھر سے اور اپنی زندگی سے بھی خارج کر سکتی۔

مگر زندگی میں مچے اس سارے گڑبڑ گھٹالے میں یہ ساری چیزیں اس بری طرح الجھی تھیں کہ انہیں خود سے جدا کرنا' ناممکن تر ہوا تھا۔

اس کی خوشحال مامون زندگی میں وہ کوئی منحوس ترین گھڑی تھی۔ جب وہ نبیل کے نام نہاد عشق میں مبتلا ہوئی تھی۔ اسے اپنی عقل پر حیرت ہوتی تھی اور پہلی بار اسے خود پر رحم آنے لگا تھا۔

"کیا تم نے خود کو جیل جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا ہے نبیل؟" وہ بمشکل خود کو کمپوزر کھ پائی تھی۔

"جیل جائیں میرے دشمن..... میں نے کیا کیا ہے' جو میں جیل جاؤں گا۔ تم مذاق اچھا کر لیتی ہو زرتاج۔" آج وہ نہ اس کی چبھتی ہوئی تیز نظر سے خائف تھا اور نہ ہی سرد لہجے سے۔

"تم پاگل ہو چکے ہو یا پھر مجھے پاگل کرنے کی ٹھان لی ہے تم نے۔ روزی کی خودکشی' اس کا ریپ سب تمہارے کھاتے میں....." اس بار وہ بری طرح چلائی تھی۔

نبیل کو اپنی ساری خوش دلی ایک طرف رکھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھنا پڑا۔

"آہستہ! دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ کچھ نہیں ہونے والا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ پھر تم کیوں چلا چلا کر زمانے بھر کو سنانے پر تلی ہو زرتاج۔"

وہ بہت پراعتماد تھا۔ مگر اپنے اس اعتماد کی وجہ کو کسی پوشیدہ خزانے کی مانند چھپائے ہوئے تھا۔ زرتاج نے ایک گہری سانس لی۔

"مجھے بتاؤ پلیز..... ورنہ میرے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔ نبیل! بہت پریشان ہوں میں اس کیس کی وجہ سے۔ الیکشن آنے والے ہیں اگلے چھ ماہ میں۔ ابھی تک پورا چانس ہے مجھے ٹکٹ ملنے کا۔ لیکن اگر یہ کیس بگڑ گیا تو میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ میری ساری عمر کی نیک نامی پر پانی پھر جائے گا۔"

"نیک نامی!" نبیل نے زیر لب دہراتے ہوئے بمشکل اپنی ہنسی کو روکا اور وہ اتنی الجھی ہوئی تھی کہ اس زیر لب ہنسی کو نوٹ بھی نہ کر پائی۔

"جو کچھ بھی تمہارے ذہن میں چل رہا ہے' وہ ہمیں اور مصیبت میں نہ ڈال دے۔ ہم اس وقت اور پریشانی بڑھانا افورڈ نہیں کر سکتے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بے فکر رہو۔ اعتبار کرو مجھ پر۔" نبیل کا لہجہ نرم تھا۔

"سچ کہہ رہے ہو نا!"

"بالکل سچ! تم اب اس کیس کی ٹینشن ختم کرو۔ سوچو کچھ ہوا ہی نہیں ہے اور اگر ہوا ہے تو کم از کم ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

اسے زرتاج کی فکر اور اجڑی سی شکل پر رحم آہی گیا۔

"میں کر لوں گا ٹھیک۔ اعتبار کرو!"

"ٹھیک ہے اگر میری ضرورت ہو تو بتا دینا!"

زرتاج نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کچھ بوجھ ہلکا کیا۔ ذہنی طور پر وہ اتنی تھک چکی تھی کہ اس وقت نبیل کی یقین دہانی پر بے ساختہ ہی یقین بھی کرنے کو دل چاہا تھا۔

نبیل نے مسکرا کر اس کا سر ہلکے سے تھپتھپایا۔

"میں جا کر لیٹوں گی تھوڑی دیر' سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی تو نبیل بھی ساتھ ہی اٹھ گیا۔

"چلو' میں تھوڑی دیر تمہارا سر دبا دیتا ہوں۔"

"نہیں! میں اکیلی رہنا چاہتی ہوں' ٹیبلٹ لے کر آرام کروں گی۔" وہ کہتی ہوئی کمرے کی طرف چلی گئی۔

نبیل وہیں کھڑا رہ گیا۔ زرتاج کی کوئی ایک ادا' کوئی ایک فقرہ' اوقات کو فی الفور متعین کرتا تھا۔

"ہا!" ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنی خوش گمانیوں کو سنبھالنا چاہا۔

یہ وقت زرتاج جیسی عورت کے رویوں پر دل جلانے کا تھا بھی نہیں۔

وہ لاؤنج کی گلاس وال کے قریب آکھڑا ہوا۔

سامنے پھیلے سبزہ زار اور درختوں کے جھنڈ سے انیکسی کی سیڑھیاں' برآمدے کا کچھ حصہ اور دیواروں کھڑکیوں پر چڑھی کاسنی پھولوں کی بیلیں نظر آئی تھیں۔

یہ چھوٹا سا خوبصورت رہائشی حصہ اب راجو بدبخت کے تصرف میں تھا۔ سوچ کر بھی دل پر جیسے ہاتھ سا پڑتا تھا۔ اس کی شادی کی خبر اور دلہن کی خوبصورتی کا حال اسے لاہور میں ہی معلوم ہو گیا تھا۔

وہ راجو جسے اگر روزی کی گم شدگی کے فوراً" بعد ہی وہ دھکے دے کر نکال دیتا تو اب تک کسی خیراتی ادارے یا پاگل خانے میں اپنی زندگی کے دن گزار رہا ہوتا۔ آج کل وہ اپنی غلطیوں کا ایمان داری کے ساتھ تجزیہ کر رہا تھا اور راجو کو نظرانداز کرنا ایک بھیانک ترین غلطی تھی۔

وہ تھا جو سالار کو روزی کے کیس کی طرف متوجہ کرنے کا سبب بنا تھا۔

مگر خیر!

انسان اپنی غلطیوں سے ہی سیکھتا ہے اور وہ آج کل یہی کر رہا ہے۔

سیڑھیوں سے اترتی گیتی آرا نے گلاس وال کے قریب کھڑے نبیل کو دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے واپس پلٹنے کا سوچا مگر پھر ہمت کر کے گزرنا چاہا۔

"اوہ!" وہ اس کی آہٹ پر چونک کر مڑا۔

"صبح ہی صبح اتنے خوبصورت چہرے دیکھنے کو ملیں تو اپنی خوش قسمتی پر رشک آتا ہے۔" اس کی نگاہ گیتی پر جم سی رہی تھی اور وہ ٹھیک اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

نبیل کی آوارہ مزاجی اب گیتی کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی سو اس نے کترا کر گزرنا چاہا۔ مگر وہ بہت تیزی سے ایک بار پھر اس کے آگے آیا۔ اس طرح کہ گیتی بری طرح لڑکھڑائی۔

"سنبھل کر......" نبیل نے اس کا بازو تھاما مگر دوسرے ہی لمحے گیتی نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ کی گرفت سے خود کو چھڑایا۔ "کیا بے ہودگی ہے یہ۔ ہٹیں سامنے سے۔"

اپنے طور پر اس نے پوری بہادری کا مظاہرہ کرنا چاہا تھا۔ مگر وہ بری طرح خوف زدہ ہوئی تھی۔ نبیل کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہوئی تھی اور آنکھوں میں اتری چمک اور بھی سفاک۔

"نخرے تو ایسے دکھا رہی ہو جیسے شاہی محلے سے نہیں' کسی شاہی محل سے رخصت ہو کر آئی ہو۔ گیتی آرا بیگم......"

اس کی آواز دھیمی اور سرد ہوئی۔

دھک...... دھک......

گیتی نے اپنے خوف زدہ دل کی دھڑکن کو بجا طور پر سنا۔

جس لمحے کے خوف سے وہ ہمیشہ نظر بچا کر چلی' آج آخر سامنا ہو کر رہا۔

"کیا سمجھ رہی تھیں سالار سے شادی ہو کر عزت کا تاج رکھا گیا ہے تمہارے سر پر ہمیشہ کے لیے۔ ہوں۔" اس نے ذرا رک کر گیتی کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھ کر اپنی پہلی بڑی کامیابی پر خود کو داد دی۔

وہ اسے پہلے قدم پر خوف زدہ کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

"چار دن...... فقط چار دن یا پھر اس سے بھی کم وقت کا کھیل...... سمجھ رہی ہو نا۔" اور وہ سمجھ رہی تھی۔

"جب تک تمہاری حقیقت چھپی ہے سالار کی نظروں میں چڑھی رہو جس دن تمہاری حقیقت کے پوسٹر اس شہر کی سڑکوں پر لگے۔ یہ شریف زادہ دنیا کو منہ دکھانے لائق نہیں رہے گا' اسی دن لاہور کی فلائٹ میں بٹھا دے گا نہیں۔ یقین رکھو اس بات پر۔"

"میں کوئی خراب لڑکی نہیں ہوں اور سالار کبھی ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ بیوی ہوں میں ان کی۔" اس نے اپنی زندگی میں آئے سب سے بڑے فخر کی مورل سپورٹ لی مگر وہ ہنستا چلا گیا۔

"سالار کی گھر سے غیر موجودگی میں کمرے سے نکلنا اس کی سب سے بڑی غلطی ہے آج۔" گیتی نے شدت سے خود کو الزام دیا تھا۔

"ٹھیک کہا۔ وہ واقعی ایسا کچھ نہیں کرے گا جس سے تمہیں تکلیف ہو۔ لیکن تمہاری وجہ سے وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے' جہاں سے وہ گزرے ہر ایک اس پر انگلیاں اٹھائے کہ یہ ہے سالار کی بیوی۔ منہ مانگی قیمت پر خرید کر لائی ہوئی نگینہ جان کی بیٹی۔ کون نگینہ جان۔ نچلے ترین درجے کی ڈانسر۔ ہا! بار بار بکنے والی چیزیں۔"

لہجے کی حقارت۔ نظروں کی گندگی۔

گیتی نے کسی ان دیکھی غلاظت کے چھینٹے اپنے پورے وجود پر محسوس کیے۔

ہاتھ' پاؤں' چہرہ' لباس سب چھینٹوں چھینٹ

اعصاب' زبان' قدم۔ سب شل

"کاش وہ ابھی اسی لمحے اسی پل مر سکتی!"

"کیسا لگے گا تمہیں گیتی آرا! جب سالار تمہاری وجہ سے......"

"آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ کچھ بھی نہیں پلیز۔" خوف اور آنسوؤں سے بھیگی آواز اتنی نیچی تھی جیسے کوئی سرگوشی۔ نبیل نے بڑی طمانیت سے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا۔

"میں ایسا ہی کروں گا۔ ایک ہی بار میں اس کے ساتھ ہر پچھلے حساب کو بے باق کرنے کا دوسرا موقع مجھے نہیں ملنے والا ہے اور میری جان' مال' عزت' آبرو سب سالار کے ٹھیک نشانے پر ہے' یہ ایک کھلی جنگ ہے گیتی اور عشق اور جنگ میں کچھ بھی تو ناجائز نہیں۔" وہ کہتا ہوا لاپروائی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا تب ہی گیتی تیزی سے اس کے پیچھے آئی۔

"دیکھیں! میں آپ سے درخواست کرتی ہوں۔ ہاتھ جوڑتی ہوں۔ سالار کے ساتھ کچھ برا مت کریں۔ وہ بہت شریف انسان ہیں۔" اپنے بے تحاشا گرتے آنسوؤں کی دھند میں اسے ٹھیک سے نبیل کی مکروہ شکل دکھائی بھی نہیں دے رہی تھی مگر اس کی ہنسی کی آواز وہ سن سکتی تھی۔

"اگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ تو پھر میں خود باقی نہیں رہوں گا گیتی آرا! تمہیں اتنی ہی اس کی پرواہ ہے تو میرے نہیں' اس کے آگے ہاتھ جوڑو کہ وہ روزی کا کیس واپس لے لے۔ اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں۔ خاک ڈال دے اس قصے پر۔ روزی مر کھپ گئی کب کی۔ اب ایک کم تر لاوارث لڑکی کی خاطر اتنا بڑا ڈرامہ کری ایٹ کرنے کے بجائے خود بھی سکون سے رہے مجھے بھی رہنے دے۔ کیوں میری دشمنی پر اترا ہوا ہے۔"

گیتی نے ہاتھ کی ہتھیلی سے چہرے پر آئے آنسوؤں کو خشک کیا۔

وہ اس کے جواب کا منتظر تھا اور اس بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں' گہری سنجیدگی تھی۔

"تم اسے راضی کر سکتی ہو اور تمہیں کرنا بھی چاہیے۔ کیونکہ اس میں صرف میری نہیں' تمہاری بھی بھلائی ہے گیتی آرا۔"

باقی آئندہ شمارے میں

کوئی تو ہے کہیں ضرور

کس کی آرزو میں یہ
آفتاب نکلا ہے
اور کس تمنّا میں
ماہتاب ڈوبا ہے
کس کی جستجو میں یہ
راستے بھٹکتے ہیں
کوئی تو ہے کہیں ضرور
جس کی آرزو میں یہ
رات دن نکلتے ہیں
صبح و شام ہوتے ہیں

دستگیر شہزاد

افسردگی کے ہاتھوں جل جل کے تھک گئے ہیں
اے دل ذرا ٹھہر، ہم چل چل کے تھک گئے ہیں

جیسے کہ بے یقینی تعبیر ہو چکی ہو
ہم اہلِ خواب آنکھیں مل مل کے تھک گئے ہیں

کیا جانے کتنی گہری ظلمت میں ہے مقدّر
کیا جانے کتنے سورج ڈھل ڈھل کے تھک گئے ہیں

واماندگی ہی ٹھہری حاصل سفر خضر کا
تم رُک کے تھک گئے ہو، ہم چل کے تھک گئے ہیں

اس کنج عافیت سے دشمن کی قید اچھی
سائے میں ہم تمہارے آنچل کے تھک گئے ہیں

شاید کہ تازہ دم ہوں اب دامنِ غزل میں
دُکھ درد آنسوؤں میں ڈھل ڈھل کے تھک گئے ہیں

لیاقت علی عاصم



ستارہ حرف بناتے ہیں، خواب لکھتے ہیں
تمہارے نام پر انتساب لکھتے ہیں

حیات سب کے لیے اک سوال لاتی ہے
تمام عمر اسی کا جواب لکھتے ہیں

میں ان کو حرف بناتا ہوں اور پڑھتا ہوں
یہ حادثے مرے دل میں کتاب لکھتے ہیں

بُرا نہ مان کہ یہ شاعروں کی باتیں ہیں
یہ لوگ اپنے عذاب و ثواب لکھتے ہیں

سلیم میرے حریفوں میں یہ خرابی ہے
کہ جھوٹ بولتے ہیں اور خراب لکھتے ہیں

سلیم احمد

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دُھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

تھے بہت بے درد لمحے ختم دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد

ان سے جو کہنے گئے تھے فیضؔ جاں صدقہ کیے
اَن کہی ہی رہ گئی وہ بات ساری باتوں کے بعد

فیض احمد فیض

سائرہ غلام نبی

حسن بیان

ایک صاحب کو مچھلی کے شکار کا بہت شوق تھا مگر ان کی بیگم کو ان کا یہ مشغلہ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ایک دن ان صاحب نے اپنے جگری دوست سے فریاد کی۔

"میرے پاس مچھلی پکڑنے کی بہترین چھڑی تھی مگر بیگم نے اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔" دوست نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"تم بازار سے دوسری چھڑی خرید لینا۔"

"مگر اس سے میرے سر میں پڑا گومڑ تو دور نہ ہو گا۔" وہ صاحب بے چارگی سے بولے۔

(ردا کوثر..... کراچی)

خوف

میاں بیوی میں کسی بات پر جھگڑا ہو رہا تھا' جب جھگڑا نازک صورت اختیار کر گیا تو شوہر نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اب تم مزید کچھ نہ کہنا ورنہ میرے اندر جو حیوان چھپا بیٹھا ہے' وہ جاگ جائے گا۔"

"تمہارے اندر جو حیوان چھپا بیٹھا ہے اسے جاگ لینے دو۔" بیوی نے چیختے ہوئے کہا۔ "بھلا چوہے سے بھی کوئی ڈرتا ہے۔"

(ارم کمال۔ فیصل آباد)

سر درد

ایک شخص جنرل اسٹور میں داخل ہوا اور سیلز مین سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"کیا آپ کے پاس سر درد کی دوا ہے؟"

"کیا آپ شادی شدہ ہیں؟" سیلز مین نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔" اس شخص نے قدرے حیرانی سے جواب دیا۔

"معاف کیجیے گا! شادی کے بعد ہونے والے سر درد کی دوا ہمارے پاس نہیں ہے۔" سیلز مین نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔

(الماس تنویر۔ ہزارہ)

باکمال

دفتر جاتے ہوئے ایک شخص نے دیکھا کہ کوئی سڑک کے کنارے زمین سے کان لگائے بیٹھا ہے۔ تجسس کے مارے وہ شخص اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"ہرے رنگ کی کار جسے ادھیڑ عمر شخص چلا رہا ہے۔ کراچی کی نمبر پلیٹ ہے اور بمپر پچکا ہوا ہے۔"

"کمال ہے! آپ صرف زمین سے کان لگا کر بتا سکتے ہیں کہ ایسی کوئی کار اس جانب آ رہی ہے؟" اس شخص نے کہا تو وہ کراہ کر بولا۔

"آ نہیں رہی بے وقوف! میں تو تمہیں اس کار کے بارے میں بتا رہا ہوں' جو ابھی مجھے ٹکر مار کر یہاں سے گزری ہے۔"

(رشیدہ بتول۔ کراچی)

خواہش

ایک دولت مند کنجوس اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیتے ہوئے بولا۔

"میرے پاس کئی کلو سونا ہے۔ کاش! میں مرنے کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جا سکتا۔"

اس کے آس پاس کئی لوگ موجود تھے۔ ان ہی میں

سے ایک اس کے ظلم کا شکار تھا' اس نے جل کر کہا۔

"آپ کی خواہش فضول ہے۔ جہاں آپ جا رہے ہیں' وہاں اس قدر گرمی ہے کہ سارا سونا پگھل جائے گا۔"

(نورین فیاض۔ میٹرو ول)

گارنٹی

ایک ڈاکٹر صاحب کا ٹی وی خراب ہو گیا۔ مکینک نے اسے چیک کرنے کی اجرت دو سو روپے بتائی اور کہا کہ "اگر کوئی پرزہ خراب نکلا تو آپ خود منگوائیں گے۔"

ڈاکٹر نے زچ ہو کر کہا۔ "بھئی! تم تو ہم سے بھی دو ہاتھ آگے نکلے۔ ہم تو مریضوں سے صرف سو روپے فیس لیتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! مگر ہم گارنٹی بھی تو دیتے ہیں۔" مکینک نے اطمینان سے جواب دیا۔

(شگفتہ فیاض۔ امریکہ)

وجہ

ایک صاحب کو رات سوتے وقت اچانک بہت بھوک لگی۔ تلاش کرنے پر انہیں ایک دراز سے دو بسکٹ مل گئے۔ انہوں نے وہ بسکٹ کھائے تو انہیں بہت لذیذ لگے۔ انہوں نے اپنی بیگم سے کہا کہ ایسے مزید بسکٹ لے کر آئیں۔

دوسرے روز ان کی بیگم وہ بسکٹ خریدنے گئیں تو دکان دار نے کہا۔

"آپ اتنے سارے بسکٹوں کا کیا کریں گی۔ آپ کا تو ایک ہی کتا ہے۔"

بیگم نے کہا۔ "میرے شوہر کو یہ بسکٹ بہت لذیذ لگے ہیں۔"

"مگر یہ بسکٹ تو خاص طور پر کتوں کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔ انسان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔" دکان دار نے خبردار کیا مگر وہ خاتون اس سے روزانہ بسکٹ لے جاتیں اور ان کے شوہر مزے سے وہ بسکٹ کھاتے۔ ایک دن خاتون نے دکان دار سے کہا۔

"میرے شوہر کا کل انتقال ہو گیا ہے۔"

دکان دار نے کہا۔ "میں نے کہا تھا ناں' انہیں کتوں والے بسکٹ نہ کھلائیں' وہ مر جائیں گے۔"

"مگر وہ بسکٹ کھانے سے تو نہیں مرے۔" خاتون نے حیرت سے کہا۔ "وہ تو کاروں کے پیچھے بھاگنے سے فوت ہوئے ہیں۔"

(یاسمین ظفر۔ لاہور)

مشورہ

"میں ذہنی اور اعصابی سکون کے سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنے آیا ہوں۔"

ایک صاحب پریشانی کے عالم میں ایک کمرے میں داخل ہوئے اور وہاں بیٹھے شخص سے کہا۔

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں ڈاکٹر نہیں وکیل ہوں۔" اس شخص نے حیرانی سے پوچھا۔

"مجھے معلوم ہے۔" آنے والے شخص نے اطمینان سے کہا۔ "میں طلاق کے سلسلے میں مشورے کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

(نسیم سحر۔ گلشن اقبال)

دوستی

"مجھے وہ دن خوب اچھی طرح یاد ہے' جب ہم نہر کے کنارے جا رہے تھے کہ اچانک میرا پاؤں پھسلا اور میں نہر میں جا گرا..... میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا کہ تم میرے پیچھے پانی میں کود پڑے تھے اور میری جان بچائی تھی۔"

ایک دوست نے دوسرے دوست سے بہت محبت سے کہا۔ دوسرے دوست نے سنجیدگی سے کہا۔

"تمہارے پاس میرا قیمتی طلائی سگریٹ لائٹر تھا۔ اگر

میں نہر میں نہ کودتا تو اور کیا کرتا؟"

(افشاں فرقان۔ سخی حسن)

ترکیب

ایک وزیر نے پاگل خانے کا معائنہ کرتے ہوئے نرس سے پوچھا۔ "آپ کو مریض کی صحت یابی کا علم کیسے ہوتا ہے؟"

نرس نے جواب دیا۔ "ہم کئی طریقوں سے مریضوں کو آزماتے ہیں۔ مثلاً" حوض میں نلکا کھول کر مریض کو بالٹیاں تھما دیتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ حوض کو خالی کرو۔"

"یہ کیا آزمائش ہوئی؟" وزیر نے قدرے الجھ کر پوچھا۔

"جناب! جو مریض مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر نلکا بند کر دیتا ہے۔" نرس نے کہا۔

"بھئی واہ! بڑی نرالی ترکیب ہے۔ یہ بات تو میرے ذہن میں بھی نہیں آئی تھی۔" وزیر نے بے ساختہ قہقہہ لگا کر کہا۔

(بینا عابد۔ کورنگی)

وعظ

ایک آئرش پادری وعظ کر رہا تھا۔

"شراب نوشی ایک لعنت ہے۔ انسان دوسروں سے جھگڑتا ہے۔ اپنے پڑوسیوں سے لڑتا ہے۔ اپنے مالک مکان پر گولی چلاتا ہے..... اور نشانہ خطا ہو جاتا ہے۔"

(رضیہ سلطانہ۔ ناگن چورنگی)

رخ زیبا

بیگم کی فرمائش جب حد سے بڑھ کر ضد کو چھونے لگی تو ان کے میاں جی پھولے ہوئے منہ کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے انہیں کلفٹن لے گئے۔ ساحل کی بھیگی بھیگی ہوائیں بیگم کے مزاج پر اثر انداز ہوئیں، انہیں محبت میں آسمان سے تارے توڑ لانے والا محاورہ یاد آیا تو انہوں نے تاروں بھرے آسمان کو تکتے ہوئے قدرے مخمور لہجے میں اپنے میاں سے کہا۔

"بتائیے..... وہ کیا چیز ہے جسے آپ روز دیکھتے ہیں ..... دیکھتے ہی رہتے ہیں مگر توڑ نہیں سکتے۔"

میاں جی کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے بلاتوقف کہا۔ "تمہارا منہ!"

(سعدیہ ہاشمی۔ کراچی)

بے وقوفی

مشاعرہ ہو رہا تھا۔ حاضرین محفل لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شاعر نے مصرعہ پڑھا۔

"دل سی نایاب شے فدا کر دی"

سامعین نے کہا۔ "واہ واہ..... ارشاد..... مکرر۔"

شاعر نے پھر کہا۔

"دل سی نایاب شے فدا کر دی۔"

محفل میں سے کسی منچلے نے آواز لگائی۔

"اور بے وقوفی کی انتہا کر دی۔"

(آمنہ اجالا۔ ڈہرکی)

پپو اور پاپا

پاپا چھت پر ٹنکی کا والو ٹھیک کرنے میں مصروف تھے۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا پپو بھی تھا۔

"بیگم! ذرا پھر سے نل کھول کر دیکھیں پانی آیا؟" پاپا نے بلا مبالغہ کوئی ساتویں بار مما سے دریافت کیا۔

"نہیں آیا۔" نیچے سے ان کی زوجہ کا وہی رٹا رٹایا جواب آیا۔ پاپا کو تاؤ آ گیا۔ وہ فیصلہ کن انداز میں اٹھے، جوش سے آستینیں چڑھائیں اور پورا زور لگا کر جو والو کو کھولنا چاہا تو اپنے ہی زور میں ٹنکی کے اندر گر گئے۔

متجسس نظروں سے سب کچھ اپنی آنکھ کے کیمرے میں فٹ کرتا ان کا بیٹا فوراً آگے بڑھا۔ ایک نظر ٹنکی کے اندر جھانکا اور چلا کر مما سے بولا۔

"مما جی! جلدی نل کھولیں، اب پاپا جی خود آ رہے ہیں۔"

(تنزیل زہرہ۔ شہداد پور)

شگفتہ جاہ



رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کھانے والا شکر گزار صبر کرنے والے روزے دار کے درجے میں ہے۔"

فوائد و مسائل:۔

1۔ صبر و شکر دونوں اسلام کی تعلیمات میں اہم مقام رکھتے ہیں، مسلمان کو نعمت پر شکر، مصیبت پر صبر اور نیکی پر ثابت قدمی اختیار کرنی چاہیے۔

2۔ کھانا کھا کر شکر ادا کرنا بھی ایک نیکی ہے جبکہ کھانا حلال طریقے سے حاصل کیا گیا ہو اور وہ چیز خود بھی حلال ہو۔

3۔ جس طرح مردار اور خنزیر کا گوشت حرام ہے۔ اسی طرح چوری ڈاکے، دھوکے اور جھوٹ کے ذریعے سے یا تصویر سازی، شراب نوشی اور سودی کاروبار وغیرہ سے کمایا ہوا رزق بھی حرام ہے۔ ایسا رزق کھا کر زبان سے شکر کا لفظ کہہ دینے سے شکر ادا نہیں ہوتا۔

4۔ روزے کی افضلیت اس لیے ہے کہ وہ صبر پر مشتمل ہے۔ اللہ کے منع کیے ہوئے کاموں سے اجتناب کرنا بھی صبر ہے۔ اور نیکی کی راہ پر قائم رہنا بھی صبر ہے۔

بری صحبت،

حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا آغوش نبوت میں پرورش پانے کے باوجود ایمان نہ لایا اور بالآخر عبرت ناک انجام سے دوچار ہو گیا۔ آپ کا بیٹا کافروں کے ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے کافروں کے عقائد و اعمال پر کاربند ہو گیا اور اس کا نتیجہ ذلت و رسوائی نکلا۔

زمین پر سب سے پہلا کھانا،

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ آدم علیہ السلام نے زمین پر سب سے پہلے جو کھانا کھایا وہ یہ تھا۔

جبرئیل علیہ السلام اُن کے پاس گندم کے سات دانے لائے۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا۔

"یہ کیا ہے؟"

جبرئیل نے فرمایا۔ "یہ اسی درخت کا پھل ہے جس سے آپ کو منع کیا گیا تھا اور آپ نے کھا لیا تھا۔"

انہوں نے پوچھا۔ "میں اس کا کیا کروں؟"

فرمایا۔ "اسے زمین میں بو دیجیے۔" انہوں نے بو دیے۔ ان میں سے ہر ایک دانے کا وزن (موجودہ دور کے) ایک لاکھ دانوں سے زیادہ تھا۔ وہ اُگ آئے (وقت آنے پر) انہیں کاٹا، گاہا۔ بھس سے دانے الگ کیے گئے۔ پھر انہیں پیسا اور گوندھا پھر اس آٹے کی روٹی پکائی اور کھائی۔

اس طرح انہیں بہت محنت اور مشقت کے بعد کھانا ملا۔ سورہ طٰہٰ کی اس آیت مبارکہ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

ترجمہ:۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ وہ (شیطان) تمہیں جنت سے نکلوا دے پھر تمہیں سخت مشقت برداشت کرنی پڑے۔ (سورہ طٰہٰ 117/20)

علامہ اقبال نے کہا،

٭ قرآن کریم کا صرف مطالعہ ہی نہ کرو بلکہ اسے سمجھنے

کی کوشش کرو۔

- علم کی جستجو جس رنگ میں بھی کی جائے عبادت کی ایک شکل ہے۔
- مسلمانوں کے لیے جائے پناہ صرف قرآن پاک ہے۔
- تاریخ ایک طرح کا ضخیم گراموفون ہے جس میں قوموں کی صدائیں محفوظ ہیں۔

اقوال امام جعفر صادق،

- جب روزی ملنے میں دیر ہو تو استغفار میں جلدی کرو۔
- مفلس وہ ہے جو دوسروں کے مال پر نظر رکھتا ہے۔
- اللہ تعالیٰ جب کبھی تمہیں کوئی نعمت دے اور تم اس کو ہمیشہ رکھنا چاہو تو زیادہ سے زیادہ شکر ادا کرو۔
- غنی وہ ہے جو اپنی قسمت کے حصے پر قناعت کرتا ہے۔

مقدسہ، مدیحہ۔ فیصل آباد

چشمے کے قطروں سے سبق،

مشہور امام اور مفسر قفال شاشی ابتدائے عمر میں لوہار کا کام کرتے تھے اور اپنے فن میں نظیر نہ رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہوں نے ایک فولادی صندوقچہ بنایا۔ اس کا قفل اس طرح بنایا کہ اس کی کنجی دوسرے قفل میں منتقل کردی جس کا وزن نصف قیراط سے زیادہ نہ تھا۔ جب یہ صندوقچہ، اس کا قفل اور کنجی تیار ہو گئے تو وہ ان کو لے کر بادشاہ کی خدمت میں پہنچے اور تحفے کے طور پر پیش کیے۔

بادشاہ اور اس کے درباری اس نادر تحفے پر بہت حیران ہوئے اور تعریف کرنے لگے۔ اتنے میں اس زمانے کا کوئی عالم، بادشاہ سے ملنے آیا۔ اسے دیکھ کر بادشاہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ اسے اپنی جگہ لاکر بٹھایا اور خود ادب سے ایک طرف بیٹھ گیا۔

لوہار نے یہ کیفیت دیکھی تو اپنے دل میں سوچنے لگا کہ "اس شخص کی اتنی تعظیم علم کے سبب سے ہے۔ ایک میں ہوں کہ ساری عمر قفل سازی کے کام میں ضائع کی اور دین اور دُنیا کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔ بہتر یہ ہے کہ اب سے میں بھی شریعت کا علم سیکھنا شروع کروں اور باقی عمر اسی کی تحصیل میں صرف کردوں۔"

یہ سوچ کر وہ دربار سے نکلے اور سیدھے ایک بہت بڑے عالم کی خدمت میں پہنچے۔ اُس وقت اُن کی عمر تیس سال تھی۔

جب انہوں نے اس عالم کو اپنا مقصد بتایا تو وہ بہت حیران ہوا۔ بولا "تیس سال کے بوڑھے طوطے ہو کر اب کیا پڑھو گے؟ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونے سے کیا حاصل؟"

مگر امام نے ایک نہ سُنی اور شریعت کا علم سیکھنے پر اڑے رہے۔ مجبوراً عالم نے کہا۔

"تم مانتے ہی نہیں ہو تو آؤ تمہارا امتحان لیتا ہوں۔ دیکھو ایک فقرہ تمہیں بتاتا ہوں، کل صبح اسے یاد کرکے لانا اور مجھے سنانا۔ دیکھوں تو سہی کیسا یاد کرتے ہو۔"

امام قفال ایک ستون کے پیچھے جاکر بیٹھ گئے اور اس فقرے کو یاد کرنے لگے۔ ایک ہزار مرتبہ اسے دُہرا کر دوسرے دن حاضر ہوئے۔

عالم نے پوچھا۔ "کل والا سبق یاد ہو گیا ہو تو سناؤ۔"

امام قفال نے فقرہ سنایا۔

شیخ کی جگہ "کلب" اور "کلب" کی جگہ "شیخ" پڑھنے کی وجہ سے دوسرے طلبا ہنسنے لگے۔ استاد نے ان کو منع کیا اور نئے شاگرد کو ایک اور سبق پڑھا دیا۔

اس طرح ایک سال گزر گیا مگر امام قفال جیسے پہلے علم سے کورے تھے، ویسے ہی کورے رہے۔

آخر تنگ آکر سیاحت کی ٹھانی۔ وطن سے باہر نکل کر پہاڑ کا رُخ کیا۔ دُھوپ تیز اور ہوا گرم ہو گئی تو ایک سایہ دار مقام پر پہنچے، جہاں ایک چشمہ پہاڑ کی اونچائی سے نکل کر قطروں کی شکل میں رس رس کر پہاڑ کے دامن میں ایک پتھر پر گر رہا تھا اور ان قطروں کے

اثر سے پتھر میں سوراخ ہو گیا تھا۔

اس پتھر پر نظر پڑی تو امام پر بہت اثر ہوا۔ سوچا کہ "علم اس پانی سے زیادہ نرم اور میرا دل اس پتھر سے زیادہ سخت نہیں ہے۔ اگر پانی کے حقیر قطرے اس پتھر پر اتنا اثر کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ میں محنت کروں تو علم میرے سخت دل پر اپنا نقش نہ جما سکے۔"

یہ سوچ کر اسی وقت شہر میں لوٹ آئے اور دل و جان سے پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ پورے تیس سال تک محنت کرکے آخر ساٹھ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔

ان ریاضتوں اور مشقتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر علوم کے دروازے کھول دیے اور وہ اپنے وقت کے امام مانے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تیس سال کی عمر میں پڑھنا شروع کیا، تیس سال پڑھا، تیس سال پڑھایا اور تیس سال فتوے دینے میں مشغول رہے۔

(جوامع الحکایات سے انتخاب)

(بشکریہ جسارت فرائی ڈے اسپیشل)

حضرت عمرؓ نے فرمایا،

- اگر تم کو دو کاموں میں سے ایک کے کرنے کا اختیار دیا جائے اور ان دونوں میں ایک سے دُنیا سدھرتی ہو اور دوسرے سے آخرت تو وہ کام اختیار کرو جس سے آخرت سدھرے کیونکہ دُنیا فانی ہے اور آخرت باقی۔
- دُعا کی قبولیت اور عدم قبولیت کا انحصار خلوص پر ہے نہ کہ الفاظ پر۔

زوباریہ خالد۔ لاہور

احسان کا جال،

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ احسان ایک ایسا جال ہے جس سے دشمن بھی نہیں بچ سکتا۔ اگر جانور کا شکار کرنا ہو تو جال لگاؤ۔ انسان احسان سے اور جانور جال سے شکار ہو جاتا ہے۔ اگر دشمن پر پے در پے مہربانیاں کرو گے تو وہ بالآخر متاثر ہو جائے گا۔ ممنون ہو کر تمہاری دل آزاری ترک کر دے گا۔

اگر کسی کے ساتھ بدی کرو گے تو تمہارے ساتھ بھی بدی ہو گی۔ یہاں تک کہ بدکار کے نیک ترین ساتھی بھی بدی کرنے لگتے ہیں۔ اگر دوستوں کے ساتھ سخت گیر رویہ رکھو گے تو وہ تمہاری صورت سے بے زار ہو جائیں گے۔

صبا سلیم۔ ٹنڈو جان محمد

ناکامی کا خوف،

ناکامی کا خوف اکثر ناکامی سے زیادہ بُرا ہوتا ہے ناکامی کسی انسان پر وارد ہونے والی بدترین کیفیت نہیں ہے۔ جو لوگ ناکامی کے خوف سے کسی کام کو کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ پہلے ہی ناکام ہو چکے ہوتے ہیں۔ آپ نے ننھے بچوں کو چلنے کی کوشش کرتے دیکھا ہو گا۔ وہ بار بار ناکام ہوتے ہیں تاہم ان کے لیے یہ ناکامی نہیں ہوتی۔ ان کے لیے یہ سکھلائی (learning) ہوتی ہے۔ اگر وہ بے حوصلہ و دل شکستہ ہو جائیں تو وہ کبھی چل نہیں سکیں گے۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر مرنا صرف خوف کے عالم میں گھٹنوں کے بل کھڑے رہنے سے ہزار درجے بہتر ہے۔

(تم جیت سکتے ہو۔ شیو کھیڑا)

اوقات،

بارش کا ایک قطرہ زمین پر سمندر کے اوپر گرا۔ جب قطرے نے اپنے ننھے وجود کو سمندر کے سامنے پایا تو وہ بڑا شرمندہ ہوا۔ کہ میں تو بہت ہی چھوٹا ہوں۔ میری کیا حیثیت اتنے بڑے سمندر کے آگے۔ اُس نے اپنی ذات سے شکوہ کیا۔ اتنے میں ایک سیپ نے اپنا مُنہ کھولا اور اُس ننھے قطرے کی دل و جان سے حفاظت کی۔ جلد ہی وہ ننھا قطرہ ایک موتی بن گیا اور پھر بادشاہ وقت کے تاج کی زینت بنا۔

نوال افضل گھمن۔ گجرات



کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

خالدہ جیلانی

صائقہ جبیں ـــــ گاؤں بھابڑہ
جو آتا ہے خوشی کی انتہا پر
بہت روئے تھے اس آنسو کی خاطر

عروج انجم ـــــ ہیڈ فقیریاں
اُس خوشی کا حساب کیسے ہو
تم جو پوچھو، جناب کیسے ہو

فریحہ شبیر ـــــ شاہ نکڈر
سلجھتی ہے جو ایک اُلجھن تو مشکل اور بڑھتی ہے
کسی صورت محبت کی پریشانی نہیں جاتی

ثمرانہ تنویر ـــــ سوہاوہ
حق تنقید تمہیں ہے مگر اس شرط کے ساتھ
جائزہ لیتے رہو ساتھ اپنے گریبانوں کا

آسیہ طارق ـــــ منڈی بہاؤالدین
یوں غلط تو نہیں چہروں کا تصور لیکن
لوگ ویسے بھی نہیں جیسے نظر آتے ہیں

شائستہ مرزا ـــــ جہلم
اب کس سے کہیں اور کون سُنے، جو حال تمہارے بعد ہوا
اس دل کی جھیل سی آنکھوں میں اک خواب بہت برباد ہوا
اس شہر میں کتنے چہرے تھے، کچھ یاد نہیں سب بھول گئے
اک شخص کتابوں جیسا تھا وہ شخص زبانی یاد ہوا

حفصہ خان ـــــ میاں چنوں
جو کہہ رہا تھا روشنی ہے زندگی میری
وہ شخص اپنے گھر کے چراغوں سے ڈر گیا

فوزیہ ثمر بٹ ـــــ گجرات
میں لوگوں سے ملاقاتوں کے لمحے یاد رکھتا ہوں
میں باتیں بھول جاتا ہوں لہجے یاد رکھتا ہوں
میں یوں تو بھول جاتا ہوں خراشیں تلخ باتوں کی
مگر جو زخم گہرے دیں، رویے یاد رکھتا ہوں

مشعال جنید ـــــ کراچی
عکس میرا بھی آئینے میں ہے
میں بھی اک چشم معتبر میں ہوں
گیلی مٹی کی طرح میں شاید
آج بھی دستِ کوزہ گر میں ہوں

ندا، فضہ ـــــ حیدرآباد
غموں کی، درد کی، چھالوں کی بات کرتا ہوں
میں زندگی کے حوالوں کی بات کرتا ہوں
تلاش رہتی ہے شب میں بھی زندہ چہروں کی
اندھیرے میں بھی اُجالوں کی بات کرتا ہوں

طوبیٰ ـــــ گجرات
یہ ستارہ جو بام پہ میرے رکھا ہوا ہے
اسے مامور کسی کام پر رکھا ہوا ہے
کیا تیرے عشق کے آغاز میں راحت ڈھونڈیں
دل نے تو دھیان ہی انجام پر رکھا ہوا ہے

امبر گل ـــــ جھڈو (سندھ)
جلتے والا یادوں کے دو عکس ادھورے چھوڑ گیا
اک تصویر جدائی کی ہے، اک منظر حیرانی کا
ہانک رہے ہیں، کھول رہے ہیں، باندھ رہے ہیں لفظوں کو
اُس نے کام ہمیں سونپا ہے فکر کی گلہ بانی کا

نوشین اقبال نوشی ـــــ گاؤں بدمرجان
ہر اک بات نہ کیوں زہر ہماری لگے
کہ ہم کو دست زمانہ سے زخم کاری لگے
ہمارے پاس بھی بیٹھو بس اتنا چاہتے ہیں
ہمارے ساتھ اگر طبیعت تمہاری لگے

سادیہ چودھری ـــــ ڈوگہ گجرات
درد حد سے بڑھا ہے تو احساس ہوا ہے
دل بجھ کے بھی دل رہتا ہے پتھر نہیں ہوتا
ہر شخص کو منہ مانگی مرادیں نہیں ملتیں
ہر شخص مقدر کا سکندر نہیں ہوتا

آسیہ قادر ـــــ کوئٹہ کینٹ
اداسیوں کا یہ موسم بدل بھی سکتا تھا
وہ چاہتا تو میرے ساتھ چل بھی سکتا تھا
وہ شخص جسے تو نے چھوڑنے میں جلدی کی
تیرے مزاج کے سانچے میں ڈھل بھی سکتا تھا

شمع مسکان ـــــ جام پور
کوئی آہٹ، کوئی آواز، کوئی چاپ نہیں
دل کی گلیاں سنسان ہیں، آئے کوئی

عاصمہ غفار گجر ـــــ ٹھٹھر بورد
قافلے ریت ہوئے دشتِ جنوں میں کتنے
پھر بھی آوارہ مزاجوں کا سفر جاری ہے

عالیہ بتول ـــــ حویلی بہادر شاہ
تجھ سے بچھڑ کے بس اتنا ہوا وصی شاہ
تیرا کچھ گیا نہیں، میرا کچھ بچا نہیں

عابدہ نثار ـــــ کراچی
یوں ہے تیری یاد کا سایہ عزیز جاں مجھے
دھوپ میں جیسے مسافر کو شجر پیارا لگے

مہوش ڈوگر ـــــ گوجرانوالہ
جو بات کرتے ہیں کم اور مختصر سی عدم
وہ لوگ کتنے قرینے کی بات کرتے ہیں

ارم کمال ـــــ فیصل آباد
وہ پیڑ جن پہ پرندوں کے گھر نہیں ہوتے
دراز جتنے بھی ہوں، معتبر نہیں ہوتے
نہ جانے کس نے بغاوت کی رسم ڈالی ہے
کہ متحد کبھی شام و سحر نہیں ہوتے

فوزیہ ثمر بٹ ـــــ گجرات
اتنے بے حس تو ہوا کرتے نہیں اہل وفا
جانے کیا سوچ کے توہین وفا کی تو نے
کوئی جھونکا بھی چھو نہ سکا جسے تیرے بغیر
اپنے ہاتھوں سے وہی شمع بجھا دی تو نے

شائستہ اکبر ـــــ ڈگری کالج گڈو
آؤ اس عید پر بھلا دیں پرانے غم
جن کا کوئی نہیں ان کے ہو جائیں ہم
عید تو مل جل کر ہنسنے مسکرانے کا نام ہے
تو پھر روتے چہروں کو ہنسائیں ہم

امامہ حبیب ـــــ عبدالحکیم
دستور ہے دُنیا کا مگر اتنا تو بتاؤ
ہم کس سے کہیں، کس سے سُنیں عید مبارک

نمرہ، اقراء ـــــ کراچی
اب دیکھیے اُداس نگاہوں کو کیا ملے
ہر سمت پھول بانٹتی پھرتی ہے شام عید

فوزیہ ثمر بٹ ـــــ گجرات
یہ دعا مانگتے ہیں ہم عید کے دن
باقی نہ رہے آپ کا کوئی غم عید کے دن
آپ کے آنگن میں اُترے ہر روز خوشیوں بھرا چاند
اور مہکتا رہے پھولوں سے چمن عید کے دن

حمنہ جبٹ ـــــ عبدالحکیم
مجھ کو اک خواب پریشاں سا لگا عید کا چاند
میری نظروں میں ذرا بھی نہ جچا عید کا چاند
آنکھ نم کر گیا بچھڑے ہوئے لوگوں کا خیال
درد دل دے کر ڈوب گیا عید کا چاند

عائشہ ـــــ گوجرہ
اس کی یادوں میں اُس کی باتوں میں
کہیں میرا عکس بھی تو جھلملاتا ہو گا
لاکھ مصروف ہو گا اپنے کاموں میں
وہ عید کا تہوار تو مناتا ہو گا

تحریم ـــــ فیصل آباد
نظر کا چین دل کا سرور ہوتے ہیں
کچھ ایسے لوگ جہاں میں ضرور ہوتے ہیں
سدا چمکتا رہے اُن کی عید کا تہوار
قریب رہ کے بھی ہم سے جو دور ہوتے ہیں

شاعری سچ بولتی ہے

فرخ فاطمہ اشرف

شاعری جذبات واحساسات کی زبان ہے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے "شاعری بھید کھولتی ہے"۔

بات شاعری کی ہو رہی ہو تو اقبال کا نام ہی اولیت کا مستحق ہے۔ اقبال کا شعر ملاحظہ ہو۔

تیرے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ، رزاقی نہیں ہے

اقبال ہی کا یہ شعر، جو مجھے بے انتہا پسند ہے۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایمان کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا
اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال نے اپنی ساری شاعری میں صرف ایک ہندی لفظ استعمال کیا اور وہ "اپدیشک" ہے۔

عبدالحمید عدم کی شاعری مجھے بے حد اچھی لگتی ہے۔ ان کی شاعری میں بے ساختگی نمایاں ہے۔

مطلب معاملات کا کچھ پا گیا ہوں میں
ہنس کر فریب چشم کرم کھا گیا ہوں میں

بس انتہا ہے چھوڑیے بس رہنے دیجیے
خود اپنے اعتماد سے شرما گیا ہوں میں

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

نکلا تھا میکدے سے کہ اب گھر چلوں عدم
گھبرا کے سوئے میکدہ پھر آ گیا ہوں میں

احسان دانش کی شاعری فطرت کے عین مطابق ہے اور تمام فطری تقاضے نباہتی ہے۔ ان کی یہ غزل اس امر کی نمائندہ ہے۔

جب جوانی کی دھوپ ڈھلتی ہے
خود سری سر جھکا کے چلتی ہے

یاس میں ان کے لطف کی امید
ظلمتوں میں کرن مچلتی ہے

بعض اوقات دل کی دنیا بھی
آنکھ کے فیصلوں پہ چلتی ہے

اف! وہ معذوری گناہ کہ جب
زندگی بندگی میں ڈھلتی ہے

تجربہ ہے کہ دشمنی اکثر
دوستی کے لہو سے پلتی ہے

عشرت بے ثبات کی لو میں
جسم ہنستا ہے، روح جلتی ہے

دور حاضر کی دوستی دانش
کس قدر جلد رخ بدلتی ہے

احسان دانش عشق کا بھید بھرا اسرار اس شعر میں نمایاں کر رہے ہیں۔

نہیں جو عشق سے آگاہ اس نقطے کو کیا جانے
کہ رسوائی سے بڑھتی ہے محبت کم نہیں ہوتی

بات ہو شاعری کی اور احمد فراز کا ذکر نہ ہو یہ نہیں ہو سکتا۔ فراز کا ہر شعر عمومی رویے کی اصلاح کرتا ہے۔

نشۂ لذت گناہ کے بعد
سخت مشکل ہے پارسا ہونا
آدمی کو خدا نہ دکھلائے
آدمی کا خدا ہونا

فراز کی یہ غزل سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔

تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں، سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ

کیا خبر ان کو کہ دامن بھی بھڑک اٹھتے ہیں
جو زمانے کی ہواؤں سے بچاتے ہیں چراغ

گو سیہ بخت ہیں ہم لوگ پہ روشن ہے ضمیر
خود اندھیرے میں ہیں دنیا کو دکھاتے ہیں چراغ

بستیاں چاند ستاروں پہ بسانے والو
کرۂ ارض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فراز
رات تو رات ہے، ہم دن کو جلاتے ہیں چراغ

شاعر بہ نسبت عام انسان کے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ پروین شاکر کی شاعری میں حساسیت بے پایاں ملتی ہے۔ ان کی یہ غزل یقیناً باذوق بہنوں کو پسند آئے گی۔

کھلے گی اس نظر پر چشم تر آہستہ آہستہ
کیا جاتا ہے پانی میں سفر آہستہ آہستہ

کوئی زنجیر پھر واپس وہیں پر لے کے آتی ہے
کٹھن ہو راہ تو چھٹتا ہے گھر آہستہ آہستہ

بدل دینا ہے رستہ یا کہیں پر بیٹھ جانا ہے
کہ تھکتا جا رہا ہے ہم سفر آہستہ آہستہ

خلش کے ساتھ اس دل سے نہ میری جان نکل جائے
کھنچے تیر شناسائی مگر آہستہ آہستہ

ہوا سے سرکشی میں پھول کا اپنا زیاں دیکھا
سو جھکتا جا رہا ہے اب یہ سر آہستہ آہستہ

ماہ دولت بھی تھوڑی بہت شاعری کر لیتے ہیں۔ ایک شعر حاضر خدمت ہے۔

اے رب تو فقط ایک عنایت کرتا
تو درد ہمارا پیامبر نہ ہوتا
یا ہم اتنے حساس نہ ہوتے
یا زمانہ اتنا ستم گر نہ ہوتا

آپ کو میرا انتخاب کیسا لگا؟ اپنی قیمتی آرا سے ضرور نوازیے گا۔



رضیہ جمیل

خط آپ کے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اُردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
آپ کی عافیت، صحت اور سلامتی کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو اور ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین

پہلا خط ہیڈ فقیریاں سے عروج انجم کا ہے لکھتی ہیں۔

میں ایک چھوٹے سے گاؤں "ہیڈ فقیریاں" سے پہلی بار آئی ہوں خط لکھنے پر مجھے مجبور کیا ہے ٹائٹل نے..... جی ہاں! پہلی بار پس منظر کو بھی واضح دکھایا ہے آپ نے تو بہت اچھا لگا۔ بیک گراؤنڈ، ڈریس، سینڈل، اسٹائل سب ہی اچھا لگا۔ اب چلیے ذرا ٹائٹل سے اندر کی طرف..... نعت کا سیکنڈ لاسٹ شعر عمیرہ احمد کے ناول کی وجہ سے کافی مشہور ہوا تھا اب پتا چلا، اس کے شاعر سلیم کوثر ہیں "بندھن" میں اتنی پرانی شادی کا تذکرہ! خیر چلیں کوئی بات نہیں۔

"جنت کے پتے" میں ہیرو، ہیروئن وہی روایتی کہ ہر سختی، تنگی، پریشانی برداشت کر کے واپس اپنی اپنی جگہ جہاں "خواب نگر" کا ہیرو کہ ہرفن مولا اور بلا کا بے نیاز تو حیا غنڈوں میں پھنس پھنس کر نکلنے والی ہیروئن۔ بہرحال اس افسانوی صورت حال میں ایک چیز پسند آئی اور وہ ہے "ترکی کا تعارف اور سیر۔" نمرہ! آپ کی بتائی گئی ساری جگہیں Net پہ انجوائے کیں ہم نے۔ "اندھیرا اجالا" جوریہ قاضی! ساجدہ کا کردار بہت امید افزا اور حوصلہ افزا تھا۔ مجھے تو اس ناول کی ہیروئن فائزہ لگی۔ فائزہ افتخار! بالکل تصوراتی سا ناولٹ لائی ہیں آپ۔ لیکن یہ تبدیلی اچھی لگ رہی ہے۔ "زندگی کی راہ گزر" کیا اتنی ہی عجیب ہے مریم عزیز! کہ جادو کی چھڑی سے اچھے لوگ ایک دم برے اور برے لوگ ایک دم اچھے بن جاتے ہیں۔ اتنی اچانک تبدیلیاں حیران ہی کرتی رہیں۔ نعیمہ ناز اور بشریٰ احمد کے موضوع حقیقت سے قریب تر اور بہت اچھے لگے۔ نوال افضل! آپ کا انتخاب اچھا تھا اور "کھلتا کسی پہ" میں ایمن فاطمہ کا شعر بہت اچھا لگا سادہ اور بے ساختہ۔

عروج! ہو سکتا ہے کہ آپ کا گاؤں بہت چھوٹا ہو لیکن اگر آپ نے اپنے گاؤں میں تعلیم حاصل کی ہے تو آپ کا گاؤں بہت سے شہروں سے بڑا ہے آپ کی خوب صورت موتیوں جیسی تحریر اور رواں، مکمل تبصرہ ہمیں بہت اچھا لگا اب ہمیں باقاعدگی سے خط لکھتی رہے گا۔

جوریہ قاضی کے ناول میں فائزہ نے بے شک ساجدہ کے ساتھ بہت تعاون کیا اسے حوصلہ دلایا لیکن کوشش اور دنیا کا مقابلہ تو ساجدہ کو ہی کرنا تھا اور جس طرح اس نے اپنی کمزوری کو طاقت میں بدلا۔ وہ بہت سے لوگوں کے لیے امید کی کرن ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کا بہت بڑا المیہ ہے کہ ظاہری شکل وصورت کو آج بھی بہت اہمیت حاصل ہے اور کم صورت لوگوں کو باہر کی دنیا سے زیادہ اپنے گھر والوں کی طرف سے بے اعتنائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مشہور رائٹر اشفاق احمد کہتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں جو چند باتیں سیکھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ لوگ اچھی سیرت کے بجائے اچھی صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔

اقراء مظفر اور عفیرہ مظفر نے گاؤں چھو کر خورد ضلع گجرات سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ٹائٹل گرل کو دیکھ کر بے ساختہ نظریں چرانی پڑیں، کیا تھا جو محترمہ دوپٹا سائیڈ پہ رکھنے کی بجائے شانوں پہ ہی پھیلا لیتیں۔ "جنت کے پتے" جولائی میں شائع ہونے والی یہ قسط بہت مضطرب کر گئی۔ آخری صفحات میں حیا کا کڈنیپ، اس کو دی جانے والی اذیت، میرے خدا..... میں بہت شدت سے روئی۔ کیا تھا جو وہ ظالم روسی اس کے بازو پر whore نہ لکھتا، اور اس کے خوب صورت بالوں پہ جب اس نے گرم گرم ویکس گرائی تو..... اف میرا ضبط جواب دے گیا اور میں نے اتنی بددعائیں دیں اس روسی کو کہ میری سسٹر مجھے پاگل اور نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔
"مصحف" نے نہ جانے کتنی لڑکیوں کو دین کی طرف راغب کیا، جن میں میری ایک دوست بھی شامل ہے اس نے قرآن کا ترجمہ اور تفسیر پڑھنی شروع کر دی اور میں جو ایک نماز تو کبھی دو نمازیں پڑھ کے فرض سے سبکدوش ہو جاتی تھی۔ اب الحمد اللہ پانچ وقت کی نمازی ہوں۔ انٹر کے بعد اب ترجمہ پڑھنے کا ارادہ ہے۔ ہر نماز میں جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہوں تو میں اپنی پیاری نمرہ احمد کی صحت کے لیے، ان کی لمبی زندگی کے لیے ضرور دعا کرتی ہوں۔
اقراء اور عفیرہ! آپ کا خط کچھ نامکمل، ادھورا سا لگا، صرف ایک ہی تحریر پر تبصرہ!
شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ نمرہ احمد تک آپ کے جذبات ان سطور کے ذریعے پہنچ رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی

آمنہ اسلم نے ساہیوال سے لکھا ہے

چار سال سے خاموش قاری تھی۔ مگر نمرہ احمد کی کہانی جنت کے پتے نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ نمرہ احمد نے ترکی کے متعلق اس طرح لکھا ہے کہ تعریف کے لیے الفاظ ہی نہیں مل رہے۔ نمرہ احمد سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تصویری جھلک شعاع میں دکھا دیں۔ باقی رسالہ تو ہمیشہ کی طرح فنٹاسٹک تھا۔ اور آپ سے ایک درخواست تھی کہ شعاع میں کہانی شائع کروانے کا طریقہ بتا دیں اور کہانی لکھنے کا بھی۔
پیاری آمنہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔
نمرہ احمد سے تصویر کے لیے ضرور کہتے ہم اگر یہ نہ جانتے کہ وہ شرعی پردہ کرتی ہیں اور تصویر کی اشاعت پسند نہیں کرتیں۔ آپ کی تعریف ان تک ان سطور کے ذریعے پہنچ رہی ہیں۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شعاع میں کہانی شائع کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ صفحے کے ایک جانب سطر چھوڑ کر لکھیں اور بذریعہ ارجنٹ میل سروس ہمیں بھجوا دیں۔ کہانی اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

عائشہ طارق نے گاؤں دھول کلاں ضلع گجرات سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

شاید آپ نے ہمارے گاؤں کا نام پہلی دفعہ سنا ہو اس لیے اس کا تعارف کروانا ضروری ہے۔ ہمارا گاؤں دھول کلاں کی تحصیل میں واقع ہے اس کے ایک طرف جنگل ہے اور دوسری طرف دریائے چناب ہے۔ ایک سڑک جنگل سے ہوتی ہوئی ہمارے گاؤں کو گجرات جانے والے مین روڈ سے ملاتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے اکثر لوگ پڑھے لکھے ہیں، ہمارے گاؤں میں بجلی بھی ہے لیکن برائے نام بس اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ دریا قریب ہونے کی وجہ سے یہاں پانی کی کوئی کمی نہیں۔ لوگوں کے گھروں میں نلکے اور پانی کی موٹر کی سہولت موجود ہے۔ ہمارے گاؤں میں دو گورنمنٹ اسکول ہیں ایک لڑکوں کا اور دوسرا لڑکیوں کا۔ دونوں

تصحیح

مکمل ناول "زندگی، موسم اور خوشبو" جون کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس پر غلطی سے رباب سحر کا نام لکھ دیا گیا جبکہ اس ناول کی تخلیق کار سحر ساجد ہیں۔
ہم اس سہو کے لیے سحر ساجد سے معذرت خواہ ہیں۔

پرائمری تک ہیں اور دو پرائیویٹ اسکول ہیں ایک مڈل تک اور ایک میٹرک تک دونوں لڑکیوں کے ہیں۔ جس کسی کو سائنس کے مضامین پڑھنے ہوتے ہیں' اسے ایک کلومیٹر دور قصبے میں جانا ہوتا ہے۔ ہمارے گاؤں میں لوگ کمپیوٹر چلاتے ہیں اور انٹرنیٹ کی سہولت بھی موجود ہے۔ جس سے صاحب علم فائدہ اٹھاتے ہیں۔

شعاع کا ہر شمارہ لاجواب ہوتا ہے۔ شعاع ہمارے گھر بہت سالوں سے آرہا ہے۔ ہم نے 1991ء اور اس سے اب تک کے تمام رسالے پڑھ لیے ہیں۔ جولائی کا ٹائٹل بھی بہت اچھا لگا۔ پھر پہلی شعاع پڑھی۔ ہم نے اپنے دل کی صفائی کرنے کا عہد کیا۔ پھر تمام سلسلوں کو پھلانگ کر مکمل ناول جنت کے پتے پڑھا جو آج کل ہم سب کا سب سے پسندیدہ ناول ہے۔

عالیہ بخاری' آمنہ ریاض' ناول بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ناولٹ میں فائزہ افتخار کا سنڈریلا بھی بہت اچھا لگا۔ مہر بہت بری لگی واقعی جادوگرنی کی طرح۔ مہر نے میشا کے ساتھ بہت برا کیا اس کی تعلیم چھڑوا کر۔ اس دفعہ میشا کا گھر مختلف چیزیں اکٹھی کر کے سوٹ بنانا اور پھر اس کو میلے میں پہن کے جانا بہت اچھا لگا۔

اندھیرا اجالا جویریہ قاضی کا ناول بھی بہت اچھا تھا' اس میں ایک تحریک تھی جو لوگوں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ زندگی کی رہ گزر مریم عزیز کا ناولٹ بھی بہت اچھا لگا۔ افسانے بھی سارے اچھے تھے پر بلاعنوان کی کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔

عائشہ! آپ کے گاؤں کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ بجلی کی سہولت نہ سہی لیکن آپ کے گاؤں میں میٹرک تک اسکول ہیں۔ سندھ کے بہت سے علاقوں میں تو لڑکیوں کے لیے پرائمری اسکول بھی نہیں ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

صائقہ جبیں گاؤں بھابڑہ سے تشریف لائی ہیں۔ لکھا ہے

جولائی کا شمارہ زبردست تھا۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح شان دار تھا۔ فائزہ افتخار میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ ان کا ناولٹ اک نئی سنڈریلا بہت ہی اچھا ہے اس میں میشا کا کردار مجھے بہت پسند ہے۔ کنیز نبوی کا افسانہ بہت عمدہ تحریر تھی۔ نمرہ احمد تو ہیں ہی لاجواب۔ ان کا ناول جنت کے پتے اپنی مثال آپ ہے۔ آپی کیا نمرہ احمد عمیرہ احمد کی بہن ہیں؟

دیوار شب اور ستارہ شام بھی زبردست جارہے ہیں۔ جویریہ قاضی کا ناول اندھیرا اجالا بہت متاثر کن تحریر تھی سونیا جیسی لڑکیوں کا یہی انجام ہونا چاہیے۔ نعیمہ ناز سلطان نے ایک چھوٹی سی تحریر میں بہت کچھ سمجھا دیا۔ باقی تمام سلسلے بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ احسن خان کا انٹرویو زبردست تھا۔

صائقہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ عمیرہ احمد اور نمرہ احمد بہنیں نہیں ہیں نہ ہی ان کا آپس میں کوئی رشتہ ہے۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

سائرہ ریاض' عائشہ' اسماء فیصل آباد سے شریک محفل ہیں۔ لکھا ہے

اس ماہ کے شمارے کا ٹائٹل نہایت عمدہ اور ریفریشنگ تھا۔

عالیہ بخاری ہالہ میری پسندیدہ مصنفہ ہیں۔ عالیہ جی معاذ اور جویا کی شادی ضرور کروا دیں۔ فائزہ افتخار کی اک نئی سنڈریلا ہمیں بھی اک نئی فائزہ افتخار سے متعارف کروا رہی ہے۔ افسانے تو ہمیشہ کی طرح لاجواب تھے۔ مگر کنیز نبوی کے افسانے اور ناول سندھ کی دھرتی کی تلخ و شیریں داستانیں سموئے ہوتے ہیں۔ ان کا اس ماہ کا افسانہ لاجواب تھا۔

ہر ناول میں ہیروئنز کی مشترکہ خوبی ان کا کانفیڈنس ہوتا ہے۔ لیکن کیا وہ انسان جس میں کانفیڈنس ہو گا۔ ضروری ہے کہ تمام اردگرد کے لوگوں سے اس کی بن نہ رہی ہو اور ان سے ہر کوئی دب کر بات کرے۔ یہ چیز کچھ خاص کشش نہیں رکھتی۔ ہیروئن کا کردار اک میل جول رکھنے والی مضبوط لڑکی کا ہونا چاہیے۔ اختلاف رائے کا حق موجود ہے پلیز جاوید چوہدری اور FM-94.6 کے آر جے یاسر قاضی کا انٹرویو بمع تصویر شائع کریں۔

سائرہ' عائشہ اور اسماء! شعاع کی محفل میں خوش آمدید

عالیہ بخاری کے بارے میں ایک وضاحت کردیں' عالیہ بخاری کا تعلق ہالہ سے نہیں ہے۔

عالیہ بخاری ہالہ جو خط لکھتی ہیں وہ رائٹر نہیں ہیں۔

اعتماد کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ان کی کسی سے نہ بنے اور ہر کوئی ان سے دب کر بات کرے لیکن مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ پُراعتماد ہوتے ہیں وہ غلط بات پر خاموش نہیں رہ پاتے اور ناجائز بات برداشت نہیں کرتے بہت سارے لوگوں کو یہ چیز ہضم نہیں ہوتی اور اس لیے ان کی بہت کم لوگوں سے بن پاتی ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

لاہور سے ماریہ شاہ نے لکھا ہے

میری امی "خواتین اور شعاع" اس وقت سے پڑھ رہی ہیں جب سے ان کا آغاز ہوا ہے۔ اتنے لمبے عرصے میں ایک بار امی نے عنیزہ سید کے "روبرو" میں شرکت کی تھی مگر اب بہت لمبے عرصے سے ایک خاموش قاری ہیں۔

میں بھی یہ دونوں تقریباً" آٹھ سال سے پڑھ رہی ہوں اور ایک بار میل بھی کی تھی۔ اب ایک طویل عرصے بعد خط لکھنے کی وجہ نمرہ احمد کا ناول "جنت کے پتے" ہے۔ اس ناول میں کچھ غلطیاں ایسی ہیں جن کی اصلاح کرنا میں ضروری سمجھتی ہوں۔ میری امی "ترکی" سے متعلق کچھ سفرنامے بھی پڑھ چکی ہیں اور ہمارے ایک بھائی بھی جو یورپ میں ہی مقیم ہیں۔ ترکی کے "یورپین حصے" میں کچھ چھٹیاں گزار کر آئے ہیں (دو' تین ماہ قبل) چنانچہ ان سے بھی بہت سی جگہوں کی تفصیلی معلومات بمع تصاویر ملیں۔

نمرہ اپنے ناول میں بار بار "ٹاقسم اسکوائر" کا ذکر کر رہی ہیں ایک جگہ یہ وضاحت بھی دے چکی ہیں کہ اصل میں "تقسیم" لفظ بگڑ کر ٹاقسم بن گیا ہے۔ میں یہاں وضاحت کرنا چاہتی ہوں کہ "ترکی" میں کوئی شخص "تقسیم اسکوائر" کو "ٹاقسم اسکوائر" نہیں کہتا اور وہاں عام طور پر "تقسیم اسکوائر" ہی بولا جاتا ہے۔ اگر کوئی انگریز غلط تلفظ سے بولے تو کوئی بات نہیں' لیکن ہالے نور اور جہان سکندر جیسے خالص ترک "تقسیم" کو "ٹاقسم" کہیں تو حیرت کی بات ہے۔

اسی طرح ایک اور جگہ نمرہ نے "ٹاپ کپی قلعہ / محل" کا ذکر کیا ہے یہاں بھی میں بتاتی چلوں کہ اصل اور عام لیا جانے والا نام "توپ قاپی محل / قلعہ ہے۔ یہاں ایک اور وضاحت دیتی چلوں کہ میری معلومات اور تحقیق کے مطابق "ترکی" زبان میں "ٹ" کا حرف نہیں ہے سو پاسپورٹ کو "پسپوریت" اور "ٹورسٹ" کو "تورست" کہنے والے لوگ "ٹاقسم" اور "ٹاپ کپی" جیسے لفظ عام نہیں بولیں گے اور ایک غلطی جو اسی شمارے میں کی گئی ہے کہ ترکی کے مشہور شہر "قونیا" کو "کونیا" لکھا ہوا ہے جبکہ "مولانا روم" کے حوالے سے اس شہر کا نام ہمیشہ "قونیا" ہی پڑھا ہے۔ میرا ان غلطیوں کی نشان دہی کا مقصد یہی ہے کہ ان کی فوری اصلاح کی جائے اور خصوصاً" اگلی قسطوں میں "تقسیم اسکوائر" کو "تقسیم اسکوائر" ہی لکھا جائے۔ اتنی گہری تحقیق کے بعد لکھے جانے والے ناول میں اس طرح کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں بھی بہت کھٹکتی ہیں۔

لیکن جہاں تک کہانی کی بات ہے تو وہ بلاشبہ بہت زبردست ہے اور پہلی قسط سے لے کر اب تک نمرہ نے تجسس کا عنصر ہنوز برقرار رکھا ہے۔ امید ہے کہ یہ بھی نمرہ کا یادگار ناول ہوگا اور اس کے لیے نمرہ کو پیشگی مبارکباد۔

اب بات ہو جائے باقی ناولز اور افسانوں کی تو تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ فائزہ افتخار ہمیشہ کی طرح بہت اچھوتا موضوع لے کر آئی ہیں۔ ان کا ناولٹ مزا دے گیا۔

سلسلے وار ناولز دونوں ہی کافی سست چل رہے ہیں۔

"مریم عزیز" کا ناولٹ بس سو سو تھا۔ "بشریٰ احمد" نے اپنے افسانے میں بہت اچھی بات پوائنٹ آؤٹ کی۔ باقی سلسلے بھی اچھے تھے۔

آخر میں میری امی کی خصوصی فرمائش ہے کہ آپ اپنی ان رائٹرز جو لکھنا چھوڑ چکی ہیں اور کچھ اس دنیا میں نہیں رہیں جیسے' نسیم سحر قریشی' خالدہ اسد' فاطمہ شہناز مرتضیٰ کی یادگار تحریریں دوبارہ شائع کریں۔ ہما کوکب بخاری کی پرانی تحریریں بھی شائع کریں اور ان سے کچھ نیا بھی ضرور لکھوائیں۔

ماریہ! اپنی امی تک ہمارا اسلام اور شکریہ پہنچائیں۔ آٹھ سال کی طویل مدت میں صرف ایک بار میل کی وہ شائع نہیں ہوئی تو آپ نے دوبارہ خط نہیں لکھا۔ آپ نے ہماری غلطیوں کی نشان دہی کی اور معلومات مہیا کیں اس کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

امید ہے اب دوبارہ اتنی طویل خاموشی اختیار نہیں کریں گی۔

مسرت الطاف احمد نے کراچی سے لکھا ہے

جولائی کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی ٹائٹل گرل پر جب نظر پڑی تو دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ڈریسنگ اور کلر کمبی نیشن تو بہت ہی خوب صورت لگا شعاع کا بیک گراؤنڈ بھی بہت زبردست تھا۔ جب خط پر نظر پڑی تو یہ کیا؟ فسانے کے لیے معذرت اتنا ٹکا سا جواب۔ میں نے شعاع سے اتنی بے حسی ایکسپیکٹ نہیں کی تھی۔

دیوار شب کی یہ قسط بھی اچھی لگی' چلو اچھا ہے زری نام کی بلا ٹلی ورنہ وہ تو ہاتھ دھو کر معاذ کے پیچھے ہی پڑی تھی اب ستارہ شام میں میری دلچسپی ختم ہوتی جا رہی ہے پوری اسٹوری ماوی کے ہی اردگرد ہی گھومتی ہے فیضان کو دیکھو تو ماوی کے لیے پریشان ہے' جلال کو دیکھو تو ماوی میں انٹرسٹڈ ہے' شبیہ کو دیکھو تو ماوی سے الجھن کا شکار ہے اور تنوی کو دیکھو تو ماوی کی ذات میں دلچسپی لے رہی ہے ماوی' ماوی آخر یہ بلا ہے کون..... تنوی میرا موسٹ فیورٹ کردار ہے لیکن اس کا کوئی رول ہی نہیں ہے پلیز آمنہ جی اس طرف بھی دھیان دیں۔ نمرہ احمد کے ناول "جنت کے پتے" میں مجھے ایسا لگتا ہے جہاں سکندر کی پر اسرار شخصیت کو اسٹوری کے اینڈ میں نیگیٹو ہی دکھایا جائے گا درحقیقت پاشا ہی حیا کی ہیلپ کر رہا ہے لیکن پلیز نمرہ آپی جہان سکندر اس ناول میں میرا موسٹ فیورٹ کردار ہے حیا کی جوڑی صرف جہان سکندر کے ساتھ ہی سوٹ کرے گی۔ جویریہ قاضی کا ناول "اندھیرا اجالا" بس نارمل سا لگا۔ ٹاپک تو بہت ہی زبردست تھا لیکن کچھ کمی سی محسوس ہوئی پڑھنے میں خاص مزا نہیں آیا۔ مریم عزیز نے بہت ہی فنٹاسٹک ناول لکھا اینڈ تو بہت ہی زبردست تھا "اک نئی سنڈریلا" فائزہ جی نے تو کمال کردیا اس ناول کو پڑھتے ہوئے میں بہت ایکسائٹڈ ہو جاتی ہوں۔ مائرہ اور میشا کی گیدرنگ بہت پسند آئی۔ میشا اور مائرہ کا کشتی میں سفر کرنا بہت ہی خوب صورت منظر لگا۔ افسانوں میں "فیصلہ" بہت ہی متاثر کن تحریر تھی۔

پیاری مسرت! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو ہمارے جواب سے تکلیف ہوئی' یقین کریں اگر ذرا سی بھی گنجائش ہوتی تو ہم تصحیح کر کے ضرور شائع کرتے۔ آپ محنت کر کے دوبارہ کوشش کریں۔

تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

شیبا گل' ریما خان اور ندا گل نے کیماڑی کراچی سے لکھا ہے

ہم دس سال سے شعاع کے قاری ہیں مگر جس ناول نے ہمیں مجبور کردیا خط لکھنے پر وہ ہے "جنت کے پتے" نمرہ احمد بہت خوب صورتی سے کہانی کو بڑھا رہی ہیں۔ ویل ڈن نمرہ احمد' پلیز نمرہ احمد کو "روبرو" میں لائیں اور کیا ہمیں نمرہ احمد کا فیس بک ایڈریس مل سکتا ہے؟

اس بار مریم عزیز زندگی کی رہگزر لے کر آئی تھی بہت اچھی کہانی تھی جویریہ قاضی جو ایک نیا اضافہ ہے شعاع کی رائٹرز میں۔ انہوں نے اچھا لکھا پر کہانی میں کچھ ادھورا پن تھا۔ احسن خان سے ملاقات اچھی رہی۔ پلیز ہماری ایک فرمائش ہے کہ شاہد آفریدی کو بھی بندھن میں لائیں "تاریخ کے جھروکوں سے" ایک اچھا سلسلہ ہے۔ اسے بند نہ کیجیے گا یہ ہمارے گھر کے بڑوں اور بچوں کا پسندیدہ ہے اور سب اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اسکیچز بہت خوب ہوتے ہیں خاص طور پر "مصحف" کا خاکہ بہت خوب صورت ہوا کرتا تھا۔

شیبا' ریما اور ندا! آپ کا خط بہت اچھا تھا کوئی خرابی نہیں تھی بس تاخیر سے موصول ہوا' اس لیے شامل نہ ہو سکا۔

سانحہ ارتحال

عفت سحر طاہر کے جواں سال بہنوئی قضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

عفت سحر طاہر کی بہن' ان کے بچوں اور دیگر اہل خانہ کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ انہیں صبر جمیل اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نمرہ احمد نے ایڈریس شائع کرنے کی اجازت دی تو ضرور شائع کریں گے۔

جام پور سے شمع مسکان نے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

فائزہ افتخار نے جہاں اسٹوری میں ہیرو کو جنم دیا۔ وہیں چاندی کے جھمکے کی بنا پر ہمارے دلوں میں بھی وسوسوں نے سر ابھارا۔ مریم عزیز نے بھی بہت زبردست موضوع پر قلم اٹھایا۔ جویریہ جی کی "اندھیرا اجالا" بھی زبردست تحریر تھی۔ بالکل حقیقت سے قریب تر۔ ویسے تو افسانے بھی سارے ہی اچھے تھے مگر کنیز نبوی کے "ممتا" نے میلہ لوٹ لیا۔ ممتا کے جذبات کی کتنی خوب صورتی سے عکاسی کی گئی تھی۔ شاعری سچ بولتی ہے میں نوال افضل گھمن کے انتخاب بہت پسند آئے۔

پیاری شمع! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

سدرہ عبدالعزیز نے شیخوپورہ سے لکھا ہے

میری کوئی بہن نہیں ہے۔ جو شعاع پڑھے اور ہم ہر رات کو سونے سے پہلے آپس میں پڑھی جانے والی تمام تحریروں کو ڈسکس کریں..... اور..... کوئی دوست بھی اتنی کلوز نہیں ہے..... بہرحال اس ماہ کا شعاع ۲ جولائی کی شام کو ملا۔ شعاع ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے نظر سرورق پر ٹھہری۔ سمپل لیکن گرمی کے موسم میں ٹھنڈا تاثر لیے۔ لان کا سمپل سا ڈریس خوب صورت سا بیک گراؤنڈ، سچ ہم بار بار ہیوی جیولری اور دلہن والا سرورق دیکھ کر اب تو ہم اکتا ہی چکے تھے جناب! اس دفعہ چینج دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگا۔ سب سے پہلے ہم پہنچے "ستارہ شام" تک۔ ناول شروع میں بہت پر تجسس تھا لیکن لگتا ہے کہ ناول ایک ہی جگہ ٹھہر سا گیا ہے۔ پلیز آمنہ جی اس کی رفتار تیز کیجیے اور اسٹوری کو تھوڑا سا آگے بڑھائیے۔ اس کے بعد ہم پہنچے جویریہ قاضی کے "اندھیرا اجالا" تک ہم میں سے چند ایک نہیں بلکہ بہت سارے لوگ دوسروں کو صرف اور صرف اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اگر ہم دوسروں کو آنکھوں کے ساتھ ساتھ دل سے بھی دیکھیں تو ہمیں اپنے معاشرے میں ساجدہ جیسے اعتماد، زندگی، خوشی اور رنگوں سے عاری کردار کبھی نظر نہیں آئیں گے۔ فائزہ کا کردار اچھا لگا۔ "جنت کے پتے" بہت اچھی طرح آگے بڑھ رہا ہے۔ ہر دفعہ جب ہم ناول پڑھ رہے ہوتے ہیں تو ہمیں لگتا ہے کہ یہ بہترین قسط ہے لیکن اگلی قسط اس سے بھی زیادہ بہترین ہوتی ہے۔ "اک نئی سنڈریلا" میں فائزہ جی نے منفرد ٹاپک چنا ہے۔ کہانی کی منظر نگاری بہت زبردست ہے۔ یہ ہمیں واقعی کی خوابوں کی دنیا میں لے جاتی ہے۔ افسانوں میں ممتا اچھا رہا۔ باقی سب بھی ٹھیک تھے۔

پیاری سدرہ! ہم آپ کے دوست ہیں اور ہمیں آپ اپنی بہن بھی سمجھ سکتی ہیں۔ آپ ہر ماہ شعاع کی تحریروں پر ہم سے ڈسکس کریں۔ ہمیں خوشی ہوگی آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا افسانہ قابل اشاعت نہیں ہے۔

ثنا اسلم اور نازیہ اسلم بھاول نگر سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

اس ماہ کا ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ ماڈل کا لباس واہ زبردست۔ تحریریں تو شعاع ہی شعاع، روشنی ہی روشنی نمرہ جی! آپ نے تو ہمیں جنہم کی یاد دلا دی۔

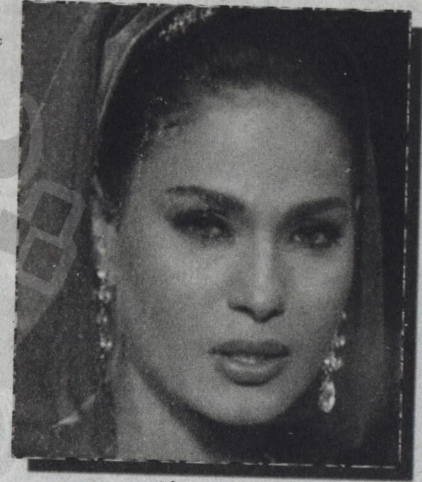
"اندھیرا اجالا" جویریہ قاضی کی تحریر لاجواب تھی۔

مجھے آپ کا ایک جملہ بے حد پسند آیا جب آپ نے ایک قاری بہن کے خط کا جواب دیا کہ زندگی ہر کسی کو آسان نہیں ملتی۔ پلیز آپ دعا کریں۔ اللہ ہم پر بھی زندگی آسان فرمائے۔

ثنا اور نازیہ! اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی میں آسانیاں اور خوشیاں عطا فرمائے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

تبصیر نشاط





توبہ

گزشتہ دنوں ایک مقامی نجی چینل پر وینا ملک کے ایک پروگرام کا پرومو بڑے زور و شور کے ساتھ چلایا گیا۔ جس میں عوام سے رائے طلب کی جا رہی تھی کہ وینا ملک کو اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے یا نہیں (گویا اس توبہ میں وینا کی اپنی مرضی شامل نہیں تھی۔ عوام جیسا کہتے، وہ ویسا ہی کر لیتیں۔)

وینا بھی ایک آنکھ سے آنسو بہاتے اور جذباتی مکالمے بولتی ہوئی نظر آئیں۔ (ہاں! تو دوسری آنکھ میں گلیسرین نہیں لگ سکی ہو گی ناں۔) تاہم عوام کے پُرزور احتجاج پر مذکورہ پروگرام نشر نہ ہو سکا۔ (شکر ہے! کہیں تو عوام کی بھی سن لی گئی۔) ایک طرف اس پروگرام کے پروموز چل رہے تھے تو دوسری طرف "پڑوسی دیار" سے خبر آئی کہ ودیا بالن کی ایوارڈ یافتہ فلم "ڈرٹی پکچر" کا دوسرا حصہ بن رہا ہے اور اس مرتبہ اس فلم میں ودیا کی جگہ وینا ملک جلوہ افروز ہو رہی ہیں۔ اس فلم کے بارے میں وینا نے نہایت جوش و خروش سے بیان داغا کہ۔

"لوگ جب میری فلم دیکھنے سینما کا رخ کریں گے تو اس وقت ان کے ذہنوں میں ودیا بالن نقش ہوں گی، لیکن جب وہ فلم دیکھ کر واپس آ رہے ہوں گے تو پھر اس وقت ان کے ذہنوں پر صرف وینا ملک چھائی ہوئی ہو گی۔"

اب یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ "ڈرٹی پکچر" صرف نام ہی کی نہیں، واقعی "ڈرٹی" ہے اور اس میں کام کرنے کے بعد ودیا کے سابقہ امیج کو زبردست دھچکا پہنچا ہے۔ (ودیا کے صاف ستھرے امیج پر ان سے ایسا کام لیا گیا ہے تو وینا سے کیا کرایا جائے گا کہ ایک تو ان کا امیج ..... دوسرے ان پر "پاکستانی" ہونے کا لیبل لگا ہونا۔ امن کی آشا کے نام پر دوستی کے راگ لاکھ الاپے جائیں "ان کے دل ہیں ہندوستانی" سو "پاکستان دشمنی" کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے..... اور وینا سے تو ہم بس اتنا ہی کہنا چاہیں گے کہ وینا جی! "توبہ کے پروگرام رہنے ہی دیں، کیونکہ آپ کا یہ پروگرام ایک سہ ماہی کا نہیں ہو سکتا۔ اس پر تو کوئی "سوپ سیریل" ہی بنانی پڑے گی۔)

یادگار مقابلہ

گلوکار عدیل برکی کو عوامی سطح پر کوئی خاص پذیرائی نہیں مل سکی، تاہم یہ خاصے باصلاحیت گلوکار ہیں۔



اتنے باصلاحیت کہ انہوں نے وہ کام کیا ہے، جو اب تک کوئی نہیں کر سکا..... امریکا بھی نہیں..... یعنی انہوں نے کئی مخالفین کو ایک رائے پر متفق کر دیا ہے کہ ایک طرف پرویز مشرف ان کے زبردست مداح ہیں تو دوسری طرف انہیں نواز شریف کی پذیرائی بھی حاصل ہے۔ بلکہ جب عدیل کے والد صاحب انہیں گانے بجانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے تو ان دونوں صاحبان نے عدیل کے والد سے ان کی سفارش بھی کی تھی۔ (چلیے! کوئی تو پلیٹ فارم ایسا بھی ہے کہ جہاں ہمارے سیاست داں متفق بھی ہیں۔ عدیل جی! اپنے کسی گانے میں عوام کو درپیش کوئی سنگین نوعیت کا مسئلہ بھی شامل کر لیں پلیز۔)

عدیل نے موسیقی کے کئی مقابلے جیتے ہیں۔ ان میں "میوزک چیلنج" کے علاوہ بھارتی پروگرام "سارے گاما" بھی شامل ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں کالج میں بھی بے شمار مقابلے جیتے۔ عدیل اپنے کالج کا سب سے یادگار مقابلہ اسے قرار دیتے ہیں، جس میں انہوں نے معروف گلوکار شفقت امانت علی کو شکست دی تھی۔ عدیل کہتے ہیں۔

میں نے کالج میں موسیقی کے لاتعداد مقابلے جیتے۔ لیکن میرا سب سے یادگار مقابلہ وہ ہے، جب میں نے ایک نہایت سخت مقابلے کے بعد شفقت امانت علی کو شکست دی تھی۔ شفقت مجھ سے خاصے سینیئر تھے۔ نتیجے کا اعلان ہوا تو غصے میں میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔

"تم تو ممی ڈیڈی فیملی" سے تعلق رکھتے ہو۔ تم گانا کیا جانو۔ اتفاق سے جیت گئے تو اب اس پر اتنا اترا کیوں رہے ہو۔"

اس پر میں نے کہا۔ "مجھے سنانے کے بجائے آپ ججز سے بات کریں۔ انہوں نے مجھے انعام کا حق دار ٹھہرایا ہے۔" (گویا جلتی پر تیل ڈال دیا۔)

شفقت امانت کے ساتھیوں کو میرا جیتنا، اس قدر ناگوار گزرا کہ بدلے کے طور پر انہوں نے میری گاڑی کا شیشہ توڑ دیا۔ میں پرنسپل کے پاس گیا اور ان سے شکایت کی، تاہم میں نے کسی کا نام نہ لیا۔ (گویا ہماری پولیس کی طرح جرم "نامعلوم افراد" کے سر تھوپ دیا۔) چونکہ میں نے کالج کے لیے ایک بڑا اعزاز جیتا تھا۔ لہٰذا پرنسپل صاحب نے میری گاڑی کا شیشہ لگوا دیا۔" (یعنی پرنسپل صاحب نے آپ کے ساتھ خصوصی "شفقت" فرمائی۔)

(ہم نے تو شفقت کے پرکھوں سے سنا تھا کہ "پیار نہیں ہے سُر سے جس کو، وہ مورکھ انسان نہیں"..... تو کیا انسان ہونے کے لیے صرف سُر سے پیار کرنا ہی کافی ہے کیا!)

کام

"چن میرے مکھناں؟" ماضی کا ایک یادگار گیت جسے شازیہ منظور نے دوبارہ گایا تو ان کی شہرت کا چاند آسمان فن پر چمکنے لگا۔ پھر جب اداکارہ نرما نے اس گانے پر پرفارم کیا تو یہ گیت گویا ان کی پہچان بن گیا۔ فلموں اور ڈراموں میں نرما کی اداکاری لوگوں کو یاد ہو یا نہ یاد ہو، مگر اس گانے پر ان کی پرفارمنس لوگ آج تک نہیں بھولے۔

یہی نرما آج کل اسکرین سے بالکل آؤٹ ہیں۔



لیکن خبروں سے آؤٹ نہیں، کیونکہ ہماری ہیروئنیں کام کریں یا نہ کریں، خبروں میں رہنے کے فن سے خوب واقف ہیں۔ کبھی کسی انسان کا بچہ گود لے لیتی ہیں تو کبھی کسی جانور کا۔۔۔ یا پھر کوئی اوٹ پٹانگ حرکت کر بیٹھتی ہیں اور کچھ نہ کر سکیں تو ایک بیان ہی داغ دیتی ہیں۔ جس میں کوئی نہ کوئی ایسی بڑھک ضرور مارتی ہیں، جس سے کسی نہ کسی طور ان کی اہمیت واضح ہوتی ہو۔ اب یہی دیکھ لیجیے!

اداکارہ نرما نے کڑک کر پوچھا ہے کہ "کون کہتا ہے مجھے کام نہیں مل رہا؟"

نرما نے شدید ناراضی کا مظاہرہ کیا ہے کہ ہر چند ماہ بعد کچھ خفیہ زبانیں ان کے بارے میں جھوٹا پروپیگنڈا کر دیتی ہیں کہ نرما کو اب کام نہیں ملتا اور وہ کام حاصل کرنے کے لیے سب کی منتیں کرتی پھر رہی ہیں۔ (جی نرما! یہ زبانیں اتنی خفیہ ہیں کہ ہمیں ان کا کوئی بیان تک نظر نہیں آتا۔)

نرما کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس وقت بھی کام حاصل کرنے کے لیے کسی کی خوشامد نہیں کی تھی جب انہوں نے فن کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ (اور کیا! کام صرف خوشامد ہی سے نہیں ملتا کہ اور بھی تو کئی طریقے ہیں۔۔۔ ویسے نرما جی! خبروں میں "ان" رہنے کے لیے صرف بیان ہی کافی نہیں اور بھی، بہت کچھ ایسا کیا جا سکتا ہے کہ جس سے شہرت بھی ملتی ہے اور کام بھی۔ دینا اور میرا ہی سے کچھ سیکھ لیں۔)

کچھ ادھر ادھر سے

آج ہمارا ملک اس سطح کو پہنچ گیا ہے کہ مصر کے شہری ہلیری کلنٹن کے پوسٹروں کو جوتے مارتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ ہم تمہیں ایک پیغام دینا چاہتے ہیں مصر کبھی پاکستان ثابت نہیں ہوگا۔

(جاوید چوہدری۔۔۔ زیرو پوائنٹ)

الخدمت تعلیم، صحت اور قدرتی آفات کے سلسلے میں محض اپنے وسائل سے بڑے پیمانے پر انسانی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کی لیبارٹریز کے چارجز بھی 30 سے 50 فیصد تک کم ہیں اور ادویات پر بھی 15 فیصد رعایت دی جاتی ہے۔

(عدنان اشرف ایڈووکیٹ۔۔۔ مسیحا)

تاریخ اٹھا کر دیکھیں! کیا کبھی سچ، حق، انصاف اور واضح اخلاقی اصولوں کا اکثریت نے ساتھ دیا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ طاقت کے سرچشمہ عوام کی اکثریت نے ہمیشہ حق، سچ اور انصاف کے خلاف پلڑے میں اپنا وزن ڈالا۔

(اوریا مقبول جان۔ حرف راز)

آٹھ لاکھ برمی مسلمانوں کے قتل عام پر خاموش میڈیا راجیش کھنہ کی موت پر شدید سوگوار رہا۔ سیاست دانوں اور وزیراعظم نے بھی گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔

(جسارت)

کراچی میں ایک ماہ میں 300 سے زائد افراد ٹارگیٹ کلنگ کا نشانہ بنے 100 کے قریب تاجر اغوا ہوئے۔ عملاً کراچی نسلی اور صوبائی تعصبات کی بنیادوں پر قائم سیاسی جماعتوں کی مافیاؤں کے قبضہ میں چلا گیا ہے۔

(ایکسپریس نیوز)

حضرت ذوالکفل علیہ السلام

اللہ تعالیٰ نے سورہ انبیاء میں حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا۔

"اور (اے نبی)! اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل (کو بھی یاد کرو) یہ سب صبر کرنے والے تھے اور ہم نے ان کو اپنی رحمت میں داخل کیا۔ بلاشبہ وہ سب نیکوکار تھے۔" (الانبیاء 21 85-86)

سورہ ص میں بھی حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ کے بعد ارشاد ہے۔

"اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو یاد کرو جو قوت اور بصیرت والے تھے۔ ہم نے ان کو ایک (صفت) خاص (آخرت کے) گھر کی یاد سے ممتاز کیا تھا اور وہ ہمارے نزدیک منتخب اور نیک لوگوں میں سے تھے اور اسماعیل اور الیسع اور ذوالکفل کو یاد کرو، وہ سب نیک لوگوں میں سے تھے۔" (سورہ ص)

قرآن مجید میں انبیائے کرام علیہ السلام کے ساتھ اور تعریفی کلمات کے ساتھ آپ کا ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالکفل نبی تھے اور یہی مشہور ہے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ آپ نبی نہیں تھے بلکہ ایک نیک آدمی اور انصاف پسند حاکم تھے۔

حضرت مجاہد رحمتہ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ "آپ نبی نہیں تھے" بلکہ نیک آدمی تھے۔ آپ نے اپنی قوم کی رہنمائی کی اور ان میں انصاف کرنے کی ذمہ داری اٹھائی تھی، اسی لیے وہ ذوالکفل (ذمہ داری اٹھانے والے) کے نام سے مشہور ہوگئے۔

حضرت یسع علیہ السلام بوڑھے ہوگئے تو آپ نے فرمایا۔

"کتنا اچھا ہو کہ میں اپنا ایک نائب مقرر کروں، جو میری زندگی میں ان پر حکومت کرے، تاکہ میں دیکھ لوں کہ وہ کیسے کام کرتا ہے۔ (اگر مناسب معلوم ہو تو اسے اپنی وفات کے بعد کے لیے اپنا نائب مقرر کر دوں)"



آپ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا۔

"جو شخص میری طرف سے عائد کردہ تین ذمہ داریاں قبول کرے گا، میں اسے اپنا خلیفہ مقرر کروں گا۔ وہ کام یہ ہیں کہ دن کو روزہ رکھے، رات کو قیام کرے اور غصہ نہ کرے۔"

ایک آدمی، جو دیکھنے میں بالکل معمولی سا لگتا تھا، اٹھا اور بولا۔ "میں" (ذمہ داریاں قبول کرتا ہوں۔)

فرمایا۔ "تو دن کو روزہ رکھا کرے گا، رات کو قیام کیا کرے گا اور غصے میں نہیں آئے گا؟"

اس نے کہا۔ "جی ہاں!"

اس دن آپ نے اسے واپس کر دیا (اور اپنا خلیفہ نامزد نہیں کیا) دوسرے دن آپ نے پھر یہی اعلان فرمایا۔ سب لوگ خاموش رہے۔

اسی آدمی نے اٹھ کر کہا۔ "میں۔" آپ نے اسے اپنا خلیفہ مقرر کر دیا۔

ابلیس شیطانوں سے کہتا تھا۔ "اس شخص کو قابو کرو۔"

لیکن سب شیطان اسے گمراہ کرنے میں اور اس سے وعدہ کے برعکس کوئی کام کرانے میں ناکام ہوگئے۔

ابلیس نے کہا۔ "مجھے اس (ذوالکفل) سے نبٹنے دو۔"

ابلیس ایک انتہائی بوڑھا فقیر بن کر آپ کے پاس اس وقت آیا، جب آپ دوپہر کے وقت آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ آپ دن رات میں صرف ایک بار اس وقت سویا کرتے تھے۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا آپ نے فرمایا۔

"کون ہے؟"

اس نے کہا "ایک مظلوم ضعیف بوڑھا ہوں۔"
آپ نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا اور وہ اپنی کہانی سنانے لگا۔ اس نے کہا۔
"میرا اپنی قوم کے لوگوں سے جھگڑا چل رہا ہے۔ انہوں نے مجھ پر ظلم کیا ہے اور یہ کیا اور یہ کیا......"
وہ بات کو طول دیتا چلا گیا حتیٰ کہ قیلولے کا وقت گزر گیا اور عدالت میں جانے کا وقت ہو گیا۔
آپ نے (بوڑھے سے) فرمایا۔ "جب میں عدالت میں بیٹھوں گا تو تجھے تیرا حق دلوا دوں گا۔"
آپ عدالت میں آکر اپنے مقام پر بیٹھ گئے۔ آپ نے ادھر ادھر دیکھا مگر بوڑھا کہیں نظر نہ آیا۔
اگلے دن بھی آپ لوگوں کے مقدمات سنتے اور فیصلے کرتے رہے اور اس بوڑھے کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ نظر نہ آیا۔ جب آپ واپس آکر بستر پر قیلولے کے لیے لیٹے تو وہ آکر دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ آپ نے فرمایا۔
"کون ہے؟"
اس نے کہا۔ "وہی مظلوم ضعیف بوڑھا ہوں۔"
آپ نے دروازہ کھولا اور کہا۔ "میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ جب میں عدالت میں بیٹھوں گا تو میرے پاس آنا؟"
اس نے کہا۔ "وہ بڑے خبیث لوگ ہیں، انہیں جب پتا چلا کہ آپ عدالت میں تشریف لے گئے ہیں تو مجھ سے کہنے لگے۔ ہم تجھے تیرا حق دے دیں گے۔ جب آپ نے عدالت برخاست کی وہ مکر گئے۔"
آپ نے فرمایا۔ "اب چلا جا جب میں عدالت میں جاؤں گا، تب آجانا۔"
اس طرح آپ اس دن بھی قیلولہ نہ کر سکے۔ آپ عدالت میں گئے اور اس کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ نظر نہ آیا۔ آپ کے لیے نیند پر قابو پانا مشکل ہو گیا تو آپ نے گھر والوں سے کہا۔
"مجھے سخت نیند آرہی ہے۔ تم کسی کو دروازے کے قریب نہ آنے دینا میں ذرا سو لوں۔"
اس وقت وہی بوڑھا آگیا۔ دروازے پر موجود آدمی نے کہا۔ "پیچھے رہو، پیچھے رہو۔"
اس نے کہا۔ "میں کل بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور اپنا مسئلہ پیش کیا تھا۔"
آدمی نے کہا۔ "ہرگز نہیں، قسم ہے اللہ کی! آپ کا حکم ہے کہ ہم کسی کو قریب نہ آنے دیں۔"
جب اس نے دیکھا کہ اس طرح آپ تک پہنچنا مشکل ہے تو ادھر ادھر دیکھا۔ اسے کمرے میں ایک روشن دان نظر آیا۔ وہ اوپر چڑھ کر اس میں سے کمرے میں داخل ہو گیا اور اندر سے دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔
آپ کی آنکھ کھل گئی تو (دربان کو) آواز دی۔
"اے فلاں! کیا میں نے تجھے حکم نہیں دیا تھا؟" (کہ اسے کچھ عرصہ کے لیے روک لینا۔)
اس نے کہا۔ "یہ شخص میری طرف سے نہیں آیا، آپ ہی دیکھیں کہ کدھر سے آیا ہے؟"
آپ نے اٹھ کر دروازہ دیکھا تو وہ اندر کی طرف سے اسی طرح بند تھا جس طرح آپ نے بند کیا تھا، اس کے باوجود بوڑھا کمرے میں موجود تھا۔ تب آپ نے پہچان لیا اور فرمایا۔
"کیا تو اللہ کا دشمن (شیطان) ہے؟"
اس نے کہا۔ "ہاں! آپ نے میری ہر کوشش ناکام بنا دی تھی۔ اس لیے میں نے آپ کو غصہ میں لانے کے لیے یہ سب کچھ کیا۔"
اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام "ذوالکفل" رکھا۔ کیونکہ آپ نے ایک ذمہ داری اٹھائی اور اسے نبھا کر دکھایا۔
حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر یہ ارشاد فرمایا۔ "ذوالکفل نبی نہیں تھے، لیکن ایک نیک آدمی تھے جو روزانہ سو نمازیں پڑھا کرتے تھے۔"
ذوالکفل نے حضرت یسع علیہ السلام سے وعدہ کیا کہ ان کی وفات کے بعد وہ یہ سلسلہ جاری رکھیں گے چنانچہ آپ روزانہ سو نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ اسی لیے آپ کا نام "ذوالکفل" (ذمہ داری اٹھانے اور نبھانے والے) مشہور ہو گیا۔



رمضان کے پکوان

خالدہ جیلانی

لکھنوی پراٹھا

اجزا :

آلو	آدھا کلو
آٹا	ایک کلو
پیاز	ایک عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
ہری مرچ	چار عدد
اجوائن	ایک چٹکی
انار دانہ	ایک کھانے کا چمچہ
کھٹائی	ایک کھانے کا چمچہ
تل	حسب مرضی
سرخ مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

آلو ابال کر میش کر کے تمام اجزا مکس کر لیں۔ آٹے کا پیڑہ بنا کر ایک چھوٹی روٹی بیل کر الگ رکھیں۔ دوسری روٹی اسی سائز کی بیلیں۔ اس پہ آلو والا آمیزہ رکھ کر دوسری بیلی ہوئی روٹی رکھیں اور ہلکے ہاتھ سے بیل کر تھوڑا بڑا کر لیں۔ کناروں کو اچھی طرح دبا کر بند کر لیں، تھوڑے سے تل چھڑک کر کانٹے کی مدد سے گود دیں، پھر عام پراٹھوں کی طرح تل لیں۔

چکن اسکوائر

اجزا :

مرغی کا قیمہ	ایک کپ
آلو ابلے ہوئے	دو عدد
پیاز	ایک عدد

لہسن ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
ہری مرچ	چار عدد
سرخ کٹی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پسی کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
سموسے کی پٹیاں	دس عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

فرائنگ پان میں تیل گرم کر کے قیمہ اور لہسن ادرک کا پیسٹ ڈال کر بھونیں۔ قیمہ کی رنگت تبدیل ہو جائے تو تمام اجزا شامل کر کے خوب مکس کریں اور جب روغن اوپر آنے لگے تو چولہے سے اتار لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر آلو مسل کر مکس کر لیں۔

سموسے کی پٹیوں کو چوکور کاٹ لیں۔ ایک حصہ کے اوپر قیمہ اور آلو والا آمیزہ رکھیں۔ اس کے اوپر دوسرا حصہ رکھ کر کناروں کو میدے کی لئی سے اچھی طرح چپکا دیں اور گرم اور گہرے تیل میں سنہری ہونے تک تلیں۔ کیچپ کے ساتھ منفرد اور مزے دار چکن اسکوائر سے لطف اٹھائیں۔

چکن گجیاں

اجزا :

مرغی کا قیمہ	ایک کپ
میدہ	ایک پاؤ
پیاز	ایک عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
ہری مرچ	چار عدد
ٹماٹر	دو عدد
لہسن کے جوے	تین عدد
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
سیاہ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
اجوائن	ایک چٹکی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

ایک فرائنگ پان میں تھوڑا سا تیل گرم کر کے چوپ کی ہوئی پیاز سنہری کر لیں۔ ٹماٹر، لہسن، ہری مرچ کتر کر شامل کریں، پھر نمک اور کٹی ہوئی کالی مرچ ڈال کر اچھی طرح مکس کرنے کے بعد قیمہ ڈال کر بھونیں۔ قیمہ گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو ہرا دھنیا اور زیرہ ڈال کر چولہا بند کر دیں۔

میدے میں نمک، اجوائن اور تقریباً" چار کھانے کے چمچے تیل مکس کر کے گرم پانی سے گوندھ کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں، پھر روٹی بیل کر کٹر کی مدد سے گول کاٹ لیں۔ ایک طرف قیمہ کا آمیزہ رکھ کر دوسرا حصہ پلٹ دیں اور کناروں کو اچھی طرح دبا کر بند کر دیں۔ اسی طرح ساری گجیاں بنا کر گرم اور گہرے تیل میں تل لیں۔ چٹنی یا کیچپ کے ساتھ افطاری میں پیش کریں۔

چکن پکوڑے

اجزا :

چکن	تین پاؤ
پیاز	ایک عدد
لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
بیسن	آدھا پاؤ
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
ہری مرچ	دو عدد
پسا ہوا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
پسی سرخ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
میٹھا سوڈا	دو چٹکی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

پیاز، لہسن، ہری مرچ اور دھنیا کو آدھا کپ پانی میں بلینڈ کر کے پیسٹ بنا لیں۔ الگ برتن میں بیسن، زیرہ، گرم مسالا، سرخ مرچ، سوڈا اور نمک ڈال کر گھول لیں۔ اوپر والا آمیزہ بھی مکس کر لیں۔ چکن (بغیر ہڈی کے) کے ٹکڑے بیسن میں ڈال دیں۔ اچھی طرح لپیٹ کر گرم تیل میں تلیں۔ سنہری ہو جائیں تو اتار لیں۔

رس ملائی

اجزا :

دودھ	ایک کلو
سوکھا دودھ	ایک کپ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
چینی	ایک کپ
گھی	ایک چائے کا چمچہ
الائچی	پانچ دانے
بادام پستے	حسب مرضی

ترکیب :

دودھ میں چینی، الائچی اور بادام پستے ڈال کر ابال لیں۔ سوکھے دودھ کو بیکنگ پاؤڈر، انڈا اور گھی (گھی اگر جما ہوا سخت ہو تو زیادہ اچھا ہے) گوندھ لیں۔ ہاتھ چکنا کر کے چھوٹی چھوٹی ٹکیہ بنا لیں۔ جب دودھ میں جوش آ جائے تو درمیانی آنچ کر کے ساری ٹکیہ ڈال دیں۔ اور وقفے وقفے سے پتیلی ہلاتے رہیں۔ دس منٹ بعد یہ پھول جائیں گی۔ دودھ گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں اور ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

سیخ کباب

اجزا :

قیمہ	آدھا کلو
لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
پیاز	ایک عدد
پسا ہوا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
سرخ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	چار کھانے کے چمچے

ترکیب :

قیمے میں تمام چیزیں شامل کر دیں۔ پیاز بھی موٹی موٹی پیس کر مکس کریں اور ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اب گیلے ہاتھوں سے سیخوں پر قیمہ چڑھائیں۔ کسی برش یا کپڑے کی مدد سے سیخوں پر تیل لگائیں۔ اب یا تو انہیں کوئلوں پر سینک لیں یا ہلکے تیل میں فرائنگ پان میں تل لیں۔ دوسری صورت میں کبابوں کو کسی برتن میں ڈال کر اوپر دہکتا ہوا کوئلہ رکھ دیں اور اس پر آدھا چمچہ گھی یا تیل ڈال دیں اور ڈھکن بند کر کے دم دیں۔ لچھے دار پیاز اور املی کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

ادارہ

خوبصورتی کے لیے

ماہ رمضان کی پرنور و بابرکت ساعتیں ہم پر سایہ فگن ہیں۔ روزے کا بنیادی مقصد تزکیہ نفس کے ساتھ ساتھ جسمانی نظام و افعال میں بہتری لانا ہے۔ سحر و افطار میں مناسب مقدار میں متوازن غذا کے استعمال سے ہم روزوں کے بہترین نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ موٹاپے کا شکار خواتین اپنے وزن پر قابو پا سکتی ہیں۔ تاہم اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس ماہ اکثر خواتین کا وزن مزید بڑھ جاتا ہے۔ اس کی وجہ سحر و افطار میں مرغن اور چٹ پٹے کھانوں کا بکثرت استعمال ہے۔ خواتین کی کوشش ہوتی ہے کہ سحر و افطار میں دستر خوان پر کئی انواع و اقسام کے کھانے سجا دیے جائیں تاکہ گھر والوں کو روزے کی حالت میں کمزوری محسوس نہ ہو۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مناسب مقدار میں متوازن غذا کا استعمال کیا جائے۔ مرغن اور ثقیل غذائیں استعمال نہ کی جائیں۔ اس سے روزے کی حالت میں بدہضمی، سینے کی جلن اور طبیعت بھی بوجھل نہیں ہوتی۔

☆ روزہ کھجور اور پانی سے افطار کرنا چاہیے۔ اس سے جسم کو فوری توانائی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ کھجور کے ریشوں میں پانی میں فوراً" حل ہو جانے کی خاصیت ہوتی ہے۔ لہٰذا کھجور فوری طور پر جزو بدن ہو کر توانائی فراہم کرتی ہے۔

☆ سحری اور افطار میں دہی کا استعمال جسم کو چاق و چوبند رکھتا ہے۔ اس سے روزے کی حالت میں پیاس بھی نہیں لگتی۔ دہی کے روزانہ استعمال سے ہڈیاں، دانت، مسوڑھے اور ناخن مضبوط رہتے ہیں جبکہ جلد اور بالوں میں رونق اور چمک پیدا ہوتی ہے۔

☆ پھل اور سبزیاں کثرت سے استعمال کریں۔ پھلوں کی چاٹ بنانے کے بجائے ان پر ہلکا سا نمک چھڑک کر کھانا زیادہ مفید ہے۔ سبزیوں کا سلاد بنا کر کھائیں۔

☆ روزے کی حالت میں سارا دن پانی نہ پینے کی وجہ سے جسم پانی کی کمی کا شکار ہو سکتا ہے' چنانچہ افطار اور سحر کے درمیانی اوقات میں پانی زیادہ پئیں۔

☆ جن لوگوں کو روزے کی حالت میں سر درد کی شکایت رہتی ہو' وہ کافی اور کیفین ملے کولا مشروبات کا استعمال یکسر ترک کر دیں۔

☆ سحری میں مناسب مقدار میں نشاستے کا استعمال سارا دن چاق و چوبند رکھتا ہے۔ اس کے حصول کے لیے سحری میں سادہ چپاتی، مکھن' سویاں اور پھل کھائیں۔ چکنائی کا استعمال بالکل ترک نہ کریں کہ جسم کے لیے تھوڑی چکنائی بھی ضروری ہے۔

☆ اکثر خواتین موٹاپے پر قابو پانے کے لیے روزے کی حالت میں ورزش کرتی ہیں۔ ان کے خیال میں اس طرح جسم سے زیادہ کیلوریز خارج کر کے فوری نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

تاہم حقیقت اس کے برعکس ہے۔ روزے کی حالت میں ورزش کرنے سے جسم کے خلیات زیادہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس سے جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ ماہ رمضان میں ورزش کا بہترین وقت تراویح کے بعد یا سحری سے پہلے کا ہے۔ اس دوران کی گئی ورزش جسم کو مناسب حد تک کم کرنے کے ساتھ ساتھ تندرست و توانا بھی رکھتی ہے۔

☆